اچھوتے موضوع کا ناول

# موم کی مورت







محمد یحییٰ خان

Zub Graphics
DESIGN BY : JAVED AKHTER

آبِ شیریں کوزہ گِل میں بھی شیریں ہی رہے

آبِ خنظل جامِ جم میں بھی کرے گا تلخ کام

# جس کی پیری میں ہے مانند سحر رنگ شباب

"موم کی مورت" کا لفظ لفظ میں نے پڑھا ہے' یہ بات میں زور دے کر اس لئے کہہ رہا ہوں کہ عموماً" ہر کتاب کے بارے میں لکھنے والا تعریف و توصیف بھرے کلمات مروت میں آکر لکھ دیتا ہے حالانکہ کتاب اس کی نظر سے گزری ہی نہیں ہوتی۔ اپنی بات تسلیم کرانے کا ایک ٹھوس جواز میرے پاس یہ بھی ہے کہ آج کے ماحول کا یہ المیہ ماہنامہ آداب عرض میں قسط وار شائع ہوتا رہا ہے اور قارئین کی پذیرائی نے ہی محمد یحیٰی خان صاحب کو اسے کتابی صورت دینے کی تحریک دی ہے۔ مجھے کہنے دیجئے کہ محمد یحیٰی خان صاحب نے معاشرے کے اس انوکھے اور مخفی رخ پر بڑی تحقیق و جستجو کے بعد قلم اٹھایا ہے۔ اچھا بھلا مرد کیسے ہیجڑہ بن جاتا ہے' اس تبدیلی کے ہر مرحلے کو انہوں نے بڑی تفصیل سے بیان کیا اور موضوع کے اعتبار سے اسے نبھانا گویا تلوار کی دھار پر چلنے کے مترادف تھا۔ انہوں نے اپنا فرض بخوبی ادا کیا اور تمام حالات و واقعات کو ایک عبرت کی صورت یکجا کر دیا لیکن اسے میری مجبوری کہہ لیجئے کہ بہت جگہ مجھے ایسی تلخ سچائیوں کو بہت لپیٹ لپیٹ کر رکھنا پڑا حالانکہ موصوف اس سے متفق نہیں تھے۔ اب اگر کہیں آپ کو ایسی کسی کمی یا تشنگی کا احساس ملے تو یہ قصور محمد یحیٰی خان صاحب کا نہیں ہے بلکہ سراسر میرا جرم ہے۔ میں اسے اس یقین کے ساتھ قارئین تک پہنچانا چاہتا ہوں کہ تحقیق و جستجو کے بعد ایک نازک موضوع پر لکھی جانے والی تحریر پر ایسا لیبل نہیں لگنا چاہئے کہ اسے ایک دوسرے سے چھپا کر رکھا جائے بلکہ والدین اگر پڑھیں تو وہ ضروری سمجھیں کہ یہ تحریر ان کی اولاد کی نظر سے بھی گزرنی چاہئے۔۔۔۔ یہاں گنتی کے چند لوگ ہی ہوں گے جن کے ہاتھ میں قلم' تلوار کی صورت رکھتا ہے اور وہ جب بھی کچھ لکھتے ہیں تو احساس یہی ملتا ہے کہ وہ معاشرے کی بے راہ روی' منافقت اور اس کے دوہرے معیار کے خلاف جہاد کر رہے ہیں۔ جناب محمد یحیٰی خان ان گنتی کے چند لوگوں میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔

خالد بن حامد

مدیر اعلیٰ ماہنامہ "آداب عرض" لاہور

## موم کی مورت---انکشاف کی طرح!

لوگوں کے پاس وقت کے فقدان نے اور دنیا پر اطلاعات کی یلغار نے کتب کے قارئین کی تعداد تشویشناک حد تک کم کر دی ہے۔ مگر آج بھی سرکش شاعری یا عمدہ نثر جب کہیں سر اٹھاتی ہے تو لوگ حیرت زدہ ہو کر اس کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ اس ضمن میں جہاں کسی ادیب و شاعر کا نیا اسلوب نقادوں کو متاثر کرتا ہے وہاں مضمون اور نفس مضمون کی انفرادیت بھی باعث تبصرہ و تذکرہ ہوتی ہے۔

کچھ عرصے سے کہا جا رہا ہے کہ ہمارا یہ گھر، جسے عرف عام میں دنیا کا نام دیا جاتا ہے پیہم سمٹ رہا ہے اور محدود ہو کر ایک گاؤں بن گیا ہے۔ اس گاؤں کی اب ہر چیز ہماری دسترس میں ہے اور ہماری نگاہ اس کے دور دراز گوشوں کو بہت قریب سے دیکھ رہی ہے۔ مگر یہ سراسر حقیقت نہیں ہے۔ بعض معاملات میں اپنی کج نگاہی کے باعث انسان اپنی آس پاس کی مخفی دنیاؤں کے مناظر سے آج بھی محروم رہ جاتا ہے۔ اس کا فوکس برسوں اس پر نہیں ہوتا جسے لمحوں میں اسے جان لینا چاہئے، یا اپنے علم میں لے آنا چاہئے۔ یہ کام ہمارے ہاں دور اندیش ادباء کرتے ہیں۔ مشاہدات کے سمندر میں وہ اتنے گہرے جاتے ہیں کہ باہر آنے پر ان کے ہاتھ ہیرے موتیوں سے بھرے ہوتے ہیں۔ یہ وصف میں نے محمد یحییٰ خان کا ناول 'موم کی مورت' پڑھتے ہوئے پایا۔ اگرچہ یہ ان کی پہلی تحریر ہے جو بتوسط طفیل اختر میرے سامنے آئی۔ اور بظاہر میں اسے شہر کی پسماندہ بستیوں کی چھوٹی لائبریریوں کا مال سمجھا۔ لیکن جب میں نے اسے چھوا اور چھیڑا تو مکمل وصل کو میرا دل چاہا۔ یہاں تک کے مصنف کے شانہ بشانہ چلتا ہوا میں اس دنیا میں دھنس گیا جو محمد یحییٰ خان نے 'موم کی مورت' میں بسائی ہے۔



میرے اس سفر میں کہیں کہیں رکاوٹ بھی آئی۔ وہ شاید ناولسٹ کی اس کام میں نومشقی سے ہو۔ وقفے کے باعث، یا کیفیت کی کمی بیشی کی وجہ سے بیان کا توازن متزلزل ہو گیا۔ یہ کبھی مسافر کی بے ڈھب چال کے کارن ہی نہیں ہوتا اکثر راستے کی ناہمواری بھی اس لڑکھڑاہٹ کا سبب ہو سکتی ہے۔ بہر کیف بحیثیت مجموعی 'موم کی مورت' جدید ناول نگاری میں ایک انکشاف کی طرح ہے۔ جو اپنے قارئین کو حیران و ششدر کر دے گا۔ اور آج کی سمٹی ہوئی دنیا میں اس کا پھیلاؤ ان پر بار نہیں گزرے گا۔ اس کہانی کے کردار یہاں وہاں کل بھی سرگرم عمل تھے اور آج بھی متحرک ہیں۔ اور عام آدمی انہیں دیکھتا، ان سے ملتا اور قریب سے گزر جاتا ہے۔ بغیر انہیں سمجھے اور ان کا نوٹس لئے--- یہ مسائل کے انبوہ کثیر کا کڑوا ثمر ہے یا ہمارے سماج کے لاپرواہ اجتماعی رویہ کی دین۔ جو بھی، صحت مند روش نہیں ہے۔ یہ عادت کبھی کبھار ناقابل علاج سرطان کے آتش فشاں کی طرح ابلتا ہے اور اپنے ساتھ بہت کچھ بہا کر لے جاتا ہے--- میرے خیال میں 'موم کی مورت' اپنے قارئین کو اس طویل خواب غفلت سے جگانے کی ایک کوشش ہے۔ اگرچہ کسی سیاسی یا سماجی بلند بانگ نعرہ کی طرح نہیں، خوشبو اور مہک کی طرح میٹھی میٹھی۔ جو حساس دلوں میں اپنے ہونے سے ارتعاش ضرور پیدا کرے گی۔

قاضی جاوید

ریذیڈنٹ ڈائریکٹر اکادمی ادبیات پاکستان

حرفِ پریشاں

# کھُل جا سم سم

میرے ایک تنقید برائے تنقید پسند دوست نے اس کتاب کا مسوّدہ ملاحظہ فرمانے کے بعد اپنی گرانقدر رائے سے یوں نوازا۔

"بڑا کھُل کھُلا کر لکھا ہے۔۔۔"

"بات کھُل کر کرو۔" میں نے اِسے عینک کے فریم کے اوپر سے گھورتے ہوئے کہا۔

وہ کِھلکھلاتے ہوئے بولا۔

"میں کہنا چاہ رہا تھا کہ خاصا کھُل کھُلا کر لکھا ہے۔۔۔ میرا مطلب ہے بہت ہی۔۔۔؟"

میں عینک اتار کر میز پہ پھینکتے ہوئے اس سے مخاطب ہوا۔

"تم بند بند گھُٹا گھُٹا سا پڑھنا چاہتے ہو۔۔۔ اس لئے تو تم سڑی چہرہ ہو' تمہارے خیالات و افکار سے منہ گند کی بُو آتی ہے۔۔۔ تمہاری سوچ کے بند پیٹ میں سیاہ مُنہہ چُنے بند ہیں۔ تم جنہیں چاہو بھی تو خارج نہیں کر سکتے۔۔۔ بہتر ہو گا کہ تم کسی ہوا بند کوٹھری میں لحاف اوڑھ کر پڑ جاؤ' کھُلی فضا' صاف ہوا' واضح منظر اور نکھرا موسم تمہاری صحت کے لئے موافق نہیں۔"

وہ بُقراطیہ جزبز سا مجھ سے سینگ پھنساتے ہوئے بولا۔

"تمہاری بے شمار خرابیوں اور کمزوریوں میں ایک نمایاں خرابی یہ بھی ہے کہ تم تنقید برداشت نہیں کر سکتے۔"

"بے شک' چکی بند تنقید تو واقعی برداشت نہیں کر سکتا۔ کھُلے میدان میں برسٹ مار دو' اجازت ہے۔"۔۔۔ میں نے بات پہ بات ماری۔

وہ اپنی طوطے سی ناک سکیڑتے ہوئے بولا۔

"ہونہہ۔۔۔ تمہارے منہ کون لگے' اسی لئے تو میں تمہاری خرافات پڑھتا نہیں کہ منہ کھولو تو منہ کی کھاؤ۔ فائدہ۔۔۔؟"

میں نے جواب دیا۔ "میرے ادَب گنوار دوست! رشوت' منافقت ڈاکے زنا بالجبر' گینگ ریپ' مسجدوں میں فائرنگ اور پولیس مقابلے کھُل کھلا بیچ کھیت۔۔۔ میں نے کچھ کھُل کھُلا کر لکھ دیا تو تمہیں کھَل گیا۔" میں نے اس کا کمزور سا بازو دباتے ہوئے بات جاری رکھی۔ "پلے باندھ کہ مصلحت کوشی' چشم پوشی اور نظریہ ضرورت بند گھُٹی ہوئی چیخیں ہیں جو خون آشام چمگادڑیں بن کر' بند انسان کے اندر آنتوں میں پنجے گاڑ کر اُلٹا لٹک جاتی ہیں۔۔۔ اور پھر وہ بند



انسان منہ اگلے کرتا کرتا جہنم واصل ہو جاتا ہے۔"

میں اس کی پھٹی پھٹی آنکھوں میں دور تک جھانکتا ہوا کہہ رہا تھا۔۔۔ "اخباروں میں کھُل کھُلا کر لکھا ہوا۔ تصویروں میں کھُل کھُلا کر دکھایا ہوا۔۔۔ فلموں اور ٹیلی ویژن میں کھُل کھُلا کر پیش کیا ہوا دیکھ سکتے ہو۔۔۔ تو میرا کھُل کھُلا کر لکھا ہوا بھی کھُل کھُلا کر پڑھو۔۔۔ تاکہ تمہاری بند ہوا کھُلے۔"

وہ پنڈا چھُڑانے کی کوشش میں کہنے لگا۔ "تم نے ہیجڑے ہائی لائٹ کئے ہیں' اس کی کیا ضرورت تھی۔۔۔ یہ تو بیمار ذہن اور۔۔۔؟"

"مائی ڈیئر' تیسری دنیا کے دو نمبر ترقی پذیر بدنصیب کاہل جاہل انسان!۔۔۔ یہ ہیجڑے تیری میری اولاد کے جنم' عقیقہ اور تیل مہندی پہ ہمارے ہاتھوں سے ہرے لال نیلے نوٹوں کی دیلیں لیتے ہیں۔ ہم ان کی دھمالیں اور مجرے بڑے شوق سے' اہتمام سے دیکھتے ہیں۔ یہ ہماری تاریخ ثقافت اور معاشرے کا ایک حصہ ہیں۔ یہ ہم سے ہیں' اور ہم ان میں ہیں' ان کو ہم کیسے نظرانداز کر سکتے ہیں' یہ بھی تو انسان ہیں۔"

وہ کھسیانی بلی کی مانند غراتے ہوئے بولا۔ "یہ انسان ہوں یا نہ ہوں مگر تم انتہائی مجہول اور نامعقول قسم کے انسان ہو۔ صفحے کے صفحے اس فضول قسم کے موضوع پہ ضائع کر دیئے ہیں' ہیجڑوں کو ہائی لائٹ کر کے تم نے اپنے زرد خیالات' تلذذ پسندی اور بیمار سوچ کو منظر عام پہ لانے کی گھٹیا کوشش کی ہے۔ سنجیدہ اور اُجلی سُوجھ بُوجھ والے قاری سے تم پذیرائی حاصل نہیں کر سکو گے۔۔۔"

وہ سانس درست کرنے کے لئے ذرا کی ذرا خاموش ہوا تو میں نے بڑی رسان سے پوچھا۔

"اچھا یہ بتاؤ' یہ فلموں' اسٹیج پروگراموں' ٹیلیویژن ڈراموں' ایوانوں' اخباری فیچروں اور فائیو اسٹار ہوٹلوں میں جو ہیجڑے "مون لائٹ" ہو رہے ہیں ان کے بارے میں کیا خیال ہے۔۔۔ تمہارے علم میں شائد ہیجڑا وہ ہے جو سانپ کی مانند لہرا کر چلتا ہے' ٹھمکے لگاتا اور تالیاں پیٹتا ہے؟۔۔۔ بودے انسان' ایسے دکھائی دینے والوں میں بڑے بڑے ثقہ اور جغادری مرد بھی ہوتے ہیں۔۔۔ اور یہ دبیل مونچھوں' چوڑی چھاتیوں' گرجنے برسنے والے سکہ بندوں میں جو تمہیں مرد دکھائی دیتے ہیں ان میں اکثر زنانے ہوتے ہیں اور جو تم گلی محلوں' بازاروں' شاپنگ سنٹروں کالجوں اسکولوں میں جا کر دیکھو' سو میں ستر اسی نسل کے ملیں گے۔ بھونڈیئے برگریئے' ممی ڈیڈی' مورتیں ٹائپ قریب قریب اسی "قبیلہ زنخاں" سے تعلق رکھتے ہیں' ہم انہیں کچھ بھی کہیں۔۔۔ مگران سے انسان اور معاشرے کا ایک فرد ہونے کا حق تو نہیں چھین

سکتے۔۔۔ اب بتاؤ۔۔۔ اس تناظر میں اس موضوع پہ لکھنا کیا جرم ہے' گناہ ہے۔۔۔؟ کیا یہ جنس سانس نہیں لیتی' ان کے سماجی' معاشرتی اور انسانی مسائل' مسائل نہیں۔ کیا یہ اس دھرتی کے باشندے نہیں؟۔۔۔ بھائی' ان مجبور مقہور اور بیمار انسانوں کی تکریم کرو۔۔۔ شکر کرو کہ تم ان میں سے نہیں ہو۔۔۔ ورنہ؟"

"یہ حکیموں' عاملوں' شادی دفتر والوں اور میوزک اکیڈمی والوں کا کیا گند کھلارا ہے' جنسی بیماریوں کی بڑی کراہت پھیلائی ہے۔" اس نے اب نیا محاذ کھولنے کی کوشش کی۔

"بیٹا! یہ سارا گند ہر صبح اخبار میں لپٹا ہوا تیری ناشتے کی میز پہ دھرا ہوتا ہے۔ اصلاح معاشرہ کے بڑے بڑے دعوے دار اخبار' اسی گند سے اپنے چھوٹے چھوٹے بل ادا کرتے ہیں۔ اخباروں کے ماتھوں پہ کتاب العظیم کی مقدس آئیتوں کے جھومر سجانے والے اسی گند سے اپنے اخبار کے دامن کو پلید کرتے ہیں۔۔۔ تو۔۔۔"

"تم تو اب اور کھل گئے ہو۔۔۔؟"

"اور تم اب اور بند جاؤ۔۔۔ تو تمہارے حق میں بہتر ہو گا۔"

محمد یحیٰی خان





# اظہار شرمندگی

متاع بے بہا ہے درد و سوز آرزو مندی

میں سیاہ سوچ، سیاہ پوش اور سیاہ کلام۔۔۔ بابا جی کا نالائق غلام۔۔۔ چاہنے کے باوجود اپنی اس "کالی شاہ کالی کرتوت" کو اپنے سوہنے اجلے اجلے بابا اشفاق احمد۔۔۔ اور روئی کی پولی پولی پونی ایسی گداز و نرم۔۔۔ سوندھی سوندھی مہک والے چاٹی کے مکھن کی مانند ملائم الطبع، قائم الوجود اور صائب السجود۔۔۔ جن کے ہاں زندگی بہت بڑی بندگی ہے میری ماں جی بانو قدسیہ کے حضور پیش کرنے اور ان کے نام معنون کرنے کی جرات نہیں کر سکا۔ کیونکہ مجھے بابا ڈنڈے والے بڑے شاہ جیؒ کے ہاتھوں آغا شورش کاشمیری مرحوم کا "اس بازار میں" لکھنے پہ حشر یاد ہے۔ لہذا یہ کتاب بغیر کسی انتساب کے پیش کی جا رہی ہے۔ اللہ کریم کا احسان عظیم ہے کہ "شہاب لڑی" کے ان گراں مایہ موتیوں کی آب و تاب سے ہم بے مایہ کنکر پتھروں کا بھرم بھی بنا ہوا ہے۔

محمد یحیٰی خان
412۔ نرگس بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن لاہور۔54570
ٹیلی فون: 7844838

# 9 یاروں کے لئے گردش ایام بہت ہے





یہ لوٹن کبوتری، ٹیکسی ڈرائیور استاد قربان لایا تھا۔۔۔ بکھرے ہوئے بال، نشے سے مخمور چڑھی ہوئی آنکھیں، سرخ بوٹی ڈورے، ستا ہوا بے حس چہرہ، ٹوٹے پروں کی مانند لٹکے ہوئے بازو، پھانسی کے رسے کی مانند گردن کے گرد لپٹا ہوا دوپٹہ، معمولی سا لباس، ریس کورس پارک کے قریب فٹ پاتھ پہ آندھی سے پہلے تیز ہوا میں کسی سفیدے کے درخت کی مانند کھڑی جھول رہی تھی۔ ٹیکسی کے بریک چیخ اٹھے تو رکتے ہی وہ خود دروازہ کھول کر سیٹ پر ڈھیر ہو گئی اور کھلا دروازہ قربان نے خود اتر کر بند کیا تھا۔

"کہاں جانا ہے بی بی۔۔۔؟"

قربان نے گاڑی گیئر میں ڈالتے ہوتے پوچھا تو جواب میں ہلکی سے سسکیوں کی آواز سنائی دی۔ قربان نے پیچھے پلٹ کر اسے دیکھتے ہوئے دوبارہ اپنا سوال دہرایا مگر وہ تو جیسے کسی معصوم بچے کی مانند نیند کی وادیوں میں اتر چکی تھی۔ گاڑی گیئر سے نکالتے ہوئے پیچھے جھک کر وہ اس کے کندھے ہلانے لگا۔

"ہوش کرو، بی بی !۔۔۔ جانا کہاں ہے۔۔۔؟"

جب گال تھپتھپائے تو پل کی پل اس کی آنکھیں نیم وا ہوئیں، چیختے ہوئے کہنے لگی۔

"نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ نا، ہیں۔۔۔"

قربان نے جیسے بجلی کے ننگے تار چھو لئے تھے، گھبرا کر وہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اپنی سیٹ پر سیدھا ہو گیا۔ فٹ پاتھ پہ گزرتے ہوئے کچھ دیہاتی ادھر دیکھنے لگے اور اس سے پیشتر کہ وہ کسی مزید بدمزگی سے دوچار ہوتا، گاڑی بڑھا کر جلدی سے سڑک کے درمیان آ گیا تھا۔۔۔ اس کی ایسی خستہ حالت، گہری غنودگی کا عالم دیکھ کر وہ سمجھ گیا کہ یہ پوڈری ہے۔ الحمراء، ریگل چوک، لارنس گارڈن، سٹیڈیم، شیرپاؤ برج، نہر کے آس پاس والے علاقے، یونیورسٹی کیمپس، گلبرگ، لبرٹی، فیروز پور روڈ، ریس کورس، ان جگہوں پہ شام ہوتے ہی، اس قسم کی چیزیں خون آشام

چمگاڈروں کی مانند کہیں سے نکل آتی ہیں۔ ان میں بھونڈ بھی ہوتے ہیں' "بھونڈیاں" اور تتلیاں بھی' پیشہ ور' شوقیہ اور علتی بھی' منشیات کے عادی اور منشیات فروش بھی۔۔۔ پرائیویٹ قمار خانوں اور قحبہ گری کے اڈوں کے گماشتے' صاف ستھرے کپڑے پہنے' بنے سنورے خوبصورت زنانے اور ماشیئے بھی اپنے اپنے شکار پھانسنے کے لئے پہنچ جاتے ہیں۔ پھولوں کے ہار گجرے' تیل کی شیشیاں' بھکاریوں کے روپ میں برقع پہنے نوخیز خوبصورت عورتیں' چمکتی کاروں میں اشارے کرتے ہوئے ادھیڑ عمرے اور موٹر سائیکلوں والے نوجوان اکثر ان ہی شکار گاہوں میں قسمت آزمائی کے لئے آتے ہیں۔

ٹیکسی ڈرائیور کے لئے یہ سب کچھ نیا نہیں ہوتا' دن رات انہیں اچھے بروں سے واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ قربان کے استاد نے ایک دفعہ اسے بتایا تھا کہ (برے مرد سے تو آسانی سے نبٹا جا سکتا ہے مگر بری اور خوبصورت عورت جو نشے کی بھی عادی ہو' اس سے ہمیشہ ہوشیار رہنا۔) آج وہ شاید اسی قسم کی صورت حال سے دوچار تھا' گاڑی کے ساتھ اس کے دماغ کی گراریاں بھی چل رہی تھیں۔ وہ اسے کہاں لے جائے' کیا کرے' اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا؟

سروسز ہسپتال سے ذرا پہلے ایک زیر تعمیر پلازہ کے پاس اس نے گاڑی روکی اور سگریٹ سلگاتے ہوئے ایک نظر اسے دیکھا۔ معمولی سے خال و خد' بھرا بھرا جسم' ملگجے اندھیرے میں وہ اس سے زیادہ کچھ دیکھ نہ سکا۔ گھڑی رات کے ساڑھے سات بجا رہی تھی' آج شام قریب چار بجے اس نے گاڑی نکالی تھی اور ڈیڑھ پونے دو سو اس کی جیب میں تھا' یعنی خرچہ پانی وہ بنا چکا تھا۔۔۔ سگریٹ کا بھرپور کش کھینچتے ہوئے اس نے ادھر ادھر دیکھا اور لائٹ جلا کر ایک بار پھر اس کا جائزہ لینے لگا۔ الٹے ہاتھ پہ گال رکھے وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہلکے ہلکے خراٹے لے رہی تھی۔ پکی ہوئی رس بھریوں ایسے ادھ کھلے ہونٹوں سے رال ٹپک ٹپک کر سیٹ پہ جمع ہو رہی تھی جیسے بوند بوند رس ٹپک رہا ہو۔ آڑو جیسی کٹ دار تھوڑی' لمبی سی گردن کے نیچے کھلے گلے سے ابھرا ہو شباب۔۔۔ جلتے ہوئے سگریٹ سے جب قربان کی انگلیوں میں جلن کا احساس ہوا تو اس نے ایک شیطانی مسکراہٹ کے ساتھ' لائٹ بجھاتے ہوتے گاڑی بڑھا دی اور موسیقی کی لہروں پہ تیرتا ہوا فیروز پور روڈ سے وحدت روڈ کی جانب مڑ گیا' موڑ مڑتے ہی آگے پولیس ناکہ نظر آیا۔ ایک لمحہ تو وہ گھبرا سا گیا کہ کہیں کوئی "مدا" نہ پڑ جائے' استاد کی نصیحت بھی یاد آ گئی۔ اپنی مستی میں وہ یہ بھول گیا تھا کہ یہاں اکثر ناکہ لگتا ہے' کوئی اور راستہ پکڑ لیتا مگر اب دیر ہو چکی تھی اور پولیس والا اسے رکنے کا اشارہ کر چکا تھا۔۔۔ رکتے ہی اس نے پولیس والے سے کہا۔



"سواری ہے۔۔۔ بیمار شمار ہے' ہسپتال لے جا رہا ہوں۔۔۔"

یہاں سے جان چھوٹی تو دوسرا ناکہ اسے دوبئی چوک پہ نظر آیا مگر اشارے سے پہلے ہی وہ نیلم بلاک کی جانب مڑنے کا اشارہ دے چکا تھا۔ اب سمن آباد موڑ کچھ زیادہ دور نہیں تھا۔

حکیم جمالی کے دواخانے کی انتظار گاہ میں دو مدقوق سے مریض بیٹھے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ قربان نے ملازم کے ذریعے ایک فوری توجہ کی طالب مریضہ کی اطلاع کرائی تو حکیم صاحب فوراً" باہر آ گئے اور ایک نظر قربان کو دیکھا' مریضہ پر نظر ڈالی اور معاملہ سمجھتے ہوئے فوراً" مریضہ کو کمرہ تشخیص میں پہنچانے کا حکم سنایا۔ پھر تھوڑی دیر بعد منتظر مریضوں کو نشتم پشتم بھگتا کر "دواخانہ بند ہے" کی تختی باہر لٹکوا دی۔۔۔ حکیم جمالی کی تشخیص گاہ کے بغلی کمرے میں یاران عیش کوش' رات بھیگنے اور موڈ بننے کا انتظار کر رہے تھے۔ پلاسٹک کی بالٹی میں شراب کی بوتلوں کو برف کے نرم نرم بستر پر کچھ دیر پہلے لٹایا گیا تھا۔ عامل ظہوری شاہ' بشیر ڈوگر کے آنے میں ابھی کچھ دیر تھی۔ وقت گزاری کے لئے میوزک اکیڈمی والا استاد شفقت عرف شفو اور پرویز' پراپرٹی ڈیلر بیٹھے تاش سے دل بہلا رہے تھے۔ حکیم جمالی نے اندر داخل ہوتے ہی سرگوشی کے انداز میں کہا۔

"اوئے' بند کرو یہ نحس تاش' پھینکو نہلے دہلے گولے۔۔۔ اٹھو اور حکم کی رانی کا استقبال کرو۔ عیش ہی عیش' مزے ہی مزے۔۔۔" اس نے آنکھ دبا کر سب کو خوشخبری سنائی۔ اوئے' دیکھو! استاد قربان آج یاروں کے لئے کیسی کبوتری لے کر آیا ہے۔۔۔"

اتنے میں استاد اور ملازم اس کبوتری کو ڈنڈا ڈولی کی صورت میں لئے اندر آئے۔ استاد قربان اسے پلنگ پہ لٹاتے ہوئے بتانے لگا۔

"حکیم جی! بڑا ستھرا مال ہے' آپ بھی کیا یاد کریں گے۔۔۔"

تاش کے پتے ابابیلوں کی طرح کمرے میں بکھر گئے اور یہ سارے چمگادڑوں کی مانند پلنگ کے گرد اکٹھے ہو گئے۔ استاد شفو' چرس سے جھلسے ہوئے ہونٹوں پہ زبان پھیرتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"استاد! اے شہزادی پینڈی اے' پکھدی اے یا سونگھدی اے۔۔۔"

حکیم جمالی اسے اشارے سے خاموش کرتے ہوئے استاد قربان سے پوچھنے لگا۔

"یہ معشوق لائے کہاں سے ہو۔۔۔؟"

"حکیم جی! ریس کورس پارک کے باہر کھڑی تھی۔ میں نے سمجھا' سواری ہے۔ گاڑی روکی تو یہ خود ہی دروازہ کھول کر لیٹ گئی۔ میں نے بتیرا پوچھا کہ کہاں جاؤ گی مگر زبان تو زبان'

اس نے تو ابھی تک آنکھ بھی نہیں کھولی--- میرا خیال ہے' پوڈری ہے اور آج کچھ زیادہ ہی خوراک لے گئی ہے یا پھر اتفاق سے خالص نمبرون پی گئی ہے---"

حکیم جمالی نے جھک کر اس کی آنکھ کی پتلیوں میں جھانکا۔ اس کا سانس سونگھا' نبض ٹٹولی--- پرویز بے صبری سے بولا۔ "حکیم صاحب ! شہزادی نشے میں ہے۔ اس کے منہ پہ ٹھنڈے پانی کے چھینٹے ماریں یا کوئی دوا سونگھائیں' دو منٹ سے پہلے ہوش میں آ جائے گی---"

حکیم جمالی نے ایک نیلی شیشی سے کوئی دوا اسے سونگھائی' دو چار زبردست قسم کی چھینکوں کے ساتھ ہی اس نے آنکھیں پٹپٹانا شروع کر دیں۔ پاؤں کے تلوے اور ماتھا ٹھنڈے پانی سے تر ہوئے تو اس نے چیخنا شروع کر دیا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ ادھر ادھر دیکھنے لگی' پھر اک دم اس پر ہنسی کا دورہ پڑا۔ سب ہکا بکا اس نادر روزگار معشوق کو دیکھ رہے تھے اور دل ہی دل میں سوچ رہے تھے کہ اس سے کس طرح نبٹا جائے؟--- اب شائد اس کے رونے کی باری تھی اور وہ معصوم بچوں کی مانند بلک بلک کر رو رہی تھی' ایک ایک کا ہاتھ پکڑ کر التجائیں کر رہی تھی۔ "میری ماں بیماری ہے' اسے کینسر ہے۔ دوا' انجکشن' خوراک نہ ملی تو وہ مر جائے گی--- میری چھوٹی بہنیں' ان کی تعلیم--- مجھے کچھ روپے دے دو' میرا سب کچھ لے لو---"

وہ بے دم ہو کر پلنگ سے نیچے لڑھک گئی--- استاد قربان ٹیکسی والا فکر مند لہجے میں پوچھنے لگا۔

"حکیم جی ! یہ کیس کچھ سمجھ میں نہیں آیا---؟"

جواب میں حکیم جمالی نے ہنستے ہوئے اپنے ملازم کو الماری سے ایک مخصوص دوا لانے کا اشارہ کیا اور دوا اس کے حلق میں انڈیل کر اسے پلنگ پر چت لٹا دیا گیا۔ اب حکیم جمالی' استاد قربان کی جانب متوجہ ہوا۔ "قربان' سائیں ! یہ سارے ڈرامے اور پیشے دھندے کے ڈھنگ ہوتے ہیں--- آم کھانے سے غرض رکھو اور پیڑ' پتوں کی جانب دھیان مت دو--- دوستو ! پیو اور جیئو' موج کرو---"

ملازم تکے کباب لینے چلا گیا اور حکیم جمالی ٹیلی فون لے رک بیٹھ گیا--- رات اپنی تمام تر ظلمتوں کے ساتھ جلوہ گر تھی۔ عامل ظہوری شاہ اور بشیر ڈوگر ٹیلی فون آفس والا جب پہنچے تو شراب کی ایک ایک بوتل لانا نہیں بھولے تھے--- اجتماعی زیادتی کے اس مکروہ اور ہولناک کھیل میں یہ ہوس آشام شکرے' تمام رات اس بے بس' مختل الحواس' نشے میں مدہوش



کبوتری کو نوچتے اور کھسوٹتے رہے۔ صبح دم جب معرکہ قدرے ٹھنڈا پڑا تو حکیم جمالی کے علاوہ سب ہی کچلا کھائے کتوں کی طرح مُنڈیاں ڈالے پڑے تھے۔ شراب' چرس' کھٹی کھٹی قے اور انسانی غلاظت کی ملی جلی بدبو اور تعفن نے اس ماحول کو مردار خوروں کے کسی مردار گھر سے مشابہ کر دیا تھا جہاں وہ مردہ جانوروں کی کھالیں کھینچتے ہیں۔ جدھر مریل کتے' حریص کوّے' گندے گدھ' اوجڑیاں آنتیں کھینچتے گھسیٹتے دکھائی دیتے ہیں--- حکیم جمالی نے یہ منظر دیکھ کر ایک عجیب سی تلخی محسوس کی۔ اس کا منہ کڑواہٹ سے بھرا ہوا تھا' پپڑی جمے ہونٹوں پہ زبان پھیرتے ہوئے' بستر پر غلاظت بھری کبوتری کی جانب دیکھ کر ایک مادر زاد ننگی گالی ان دوستوں کے نام اچھالی جو عیاشی کرنے کے دعوے تو کرتے ہیں' شراب کی بوتل گردن تک بھری ہوئی تو لاتے ہیں' عورت کو سالم ہی کھا جانے والی نظروں سے تو دیکھتے ہیں' راتوں کے راجہ تو بنتے ہیں مگر شراب کی بوتل کا ابھی سینہ ننگا نہیں ہوتا کہ یہ آؤٹ ہو جاتے ہیں' عورت کا عورت پن ابھی انہیں چھوتا ہی نہیں کہ یہ گھٹنے ٹیک دیتے ہیں اور رات کا جادو ابھی ٹوٹتا ہی نہیں کہ یہ چوہے بنے نیند کے بلوں میں دبک جاتے ہیں۔ ہت ایسے عیاشوں کی!--- منہ بھاڑ کھول کر اس نے ایک بھرپور انگڑائی توڑی' سستی اور نیم غنودگی کی ایک سرد لہر اسے چھو کر گزر گئی تھی۔ وہ اپنی خاص الماری کھول کر ایک چھوٹی سی شیشی سے دو طلائی گولیاں کچے دودھ کے ساتھ نگل گیا اور بھرا ہوا ایک سگریٹ پھونکنے کے بعد وہ پھر پلنگ کی غلاظت کا حصہ بن گیا--- ادھڑی پچی کبوتری' پتھر جسم' پتھر احساس' پتھر نصیب---!



جمالا!--- المشہور حکیم جمالی' وید سنیاسی' ماہر امراض مخصوصہ و خبیثہ' گولڈ میڈلسٹ وغیرہ وغیرہ کے لئے کبوتریاں کبوتر' مرغ مرغابیاں' بکریاں بکرے' بھیڑیں چھترے نئے نہیں تھے۔ اس کا باپ حیدرا بھی یہی کسب کرتا تھا۔ قرب و جوار کے گاؤں قصبوں سے وہ جانور خریدتا' فروخت بھی کرتا اور دوکان پہ بھی بیچتا۔ جمالا آٹھ جماتیں پاس کر کے سکول سے منہ موڑ بیٹھا۔ ہڈ گوڈوں کا مضبوط' ہتھ چھٹ اور منہ چت لگنے والا تھا۔ اس سے پیشتر کہ وہ کہیں خود ہی منہ سر کرتا' ہوشیار باپ نے اسے اپنے ساتھ دوکان پہ بٹھا لیا۔ قصائی' نائی اور میراثی کا بچہ اپنا موروثی فن سیکھے نہ سیکھے' ہوتا جماندرو استاد ہی ہے۔ جمالا جانوروں کے بند بند کاٹنے اور الٹی سیدھی کھال اتارنے میں خوب پرکاری دکھاتا۔ زبان اور ہاتھ میں ایسا جادو تھا کہ آنتیں' اوجڑی' کلیجی' کان کا قیمہ قلیہ بنا کر بیچ دیتا۔ مریل بکری کی پشت اور زانوؤں میں بکرے کی پُوچھل اور کپورے پھنسا کر دیسی بکرے کے طور پر بیچ دیتا مگر تابہ کے؟--- دوکان کی ساکھ بگڑی تو باپ

نے بگڑ کر دوکان سے اُٹھا دیا۔ گوشت کا کام کرتے کرتے گوشت چڑھ گیا تھا اور گوشت کے ساتھ چربی بھی ہوتی ہے' وہ آنکھوں میں آگئی۔ خون بھی ہوتا ہے' وہ نسوں میں فساد بپا کرنے لگا۔ ایک چھنال سی لڑکی سے آنکھ مٹکا ہو گیا۔ تعلقات کا مٹکا پھوٹا تو اس کے اجڈ بھائیوں سے اِٹ کھڑکا ہو گیا۔ باپ اس کی کرتوتوں سے پہلے بیزار تھا۔ حمائیت اور سرپرستی سے ہاتھ کیا اٹھایا کہ یہ گاؤں بدر کر دیا گیا۔

چار گاؤں پرے قلندروں اور ملنگوں کا ایک گاؤں تھا جہاں چھوٹی قوموں کے جرائم پیشہ لوگ رہتے تھے۔ بچے' بوڑھے' عورتیں' سب ہی منشیات کے عادی یہاں اس کا دوست طالبا پنگڑ رہتا تھا۔ چھ فٹا جوان اور منشیات فروشی اس کا پیشہ تھا۔ اس نے جمالے کو ہاتھوں ہاتھ لیا' خوب آؤ بھگت کی۔ اس کا ڈیرہ گاؤں سے باہر' درختوں کے چھوٹے سے ذخیرے میں تھا۔ یہاں رات دن آس پاس علاقے کے بیکار' بدکار منشیات کے عادی لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا۔ آگ کے بیچ کے گرد بھنگ کے پیالے اور چرس چانڈو کی چلمیں گردش میں رہتیں' لنگر پکتا۔ سُرے' بے سُرے ترنگ میں تانیں لگاتے رہتے۔ ڈھول دھمال' گھڑے' گھنگھرو الگ اپنا سماں باندھتے۔

جمالا بھنگ کے پیالے' مدک کے سُوٹے' سلفے کی لاٹ اور چرس کی چس سے یہیں آکر آشنا ہوا اور یہیں اسے احساس ہوا کہ اب تک وہ بیکار زندگی بسر کرتا رہا ہے۔ چھوٹی سی دوکان' وہی گوشت' وہی چھریاں ٹوکے' اوجڑیاں' سری پائے' بوٹی بوٹی پہ تکرار کرنے والے غریب جاہل لوگ اور سڑیل' باپ پور پور چربی جمع کر کے فروخت کرنے والا--- اسے اپنے باپ' گاؤں' پیشے سے سخت نفرت ہو گئی۔ ذہن' دل' دماغ اور زندگی کے بند سَوتے تو یہاں آکر کھلے تھے۔ طالبا کانوں میں سونے کے بالے' قیمتی گھڑی' ریشمی لاچا' بوسکی کی قمیض' تلے کا کھسہ پہنتا۔ ڈب میں نوٹ اور پستول رکھتا تھا۔ جمالے نے تہیہ کر لیا کہ وہ ایک آسودہ حال' کامیاب اور امیر آدمی بنے گا۔ اپنے کنجوس قصائی باپ اور خاص طور پر گاؤں والوں سے اپنی حیثیت منوا کر رہے گا--- طالبے کی خواہش اور کوشش تھی کہ کسی طرح جمالا بھی اس کے دھندے میں شامل ہو جائے۔ ابھی آہستہ آہستہ راہیں ہموار کر رہا تھا کہ ایک دھندلی سی شام ایک سنیاسی بابا کہیں سے گرتا سنبھلتا ڈیرے کی راہ پر آنکلا۔ جٹا دھاری' ناف تک اتری ہوئی راکھ بھوبھل ریش' ہڈیوں کی مُٹھ' ننگ دھڑنگ لنگوٹی پوش' کاندھے پہ جھولتا ہوا پھٹا پرانا جھولا' ہاتھ میں نرسنکھا' پیر کھڑاواں' سر بھبھوت' ماتھے کشک۔ ذخیرے سے باہر ہی اس نے سنکھ پھونکا' شائد وہ سلفے کی بو سونگھ کر ادھر آگیا تھا۔ آتے ہی اس نے کسی جناتی زبان میں دہاڑ لگائی۔ سہمے ہوئے حاضر باش اوباشوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ عزت تکریم سے بٹھایا اور جل بھوجن' بھنگ



کلیان سے تواضع کی۔ کھاپی' ڈکار' آسن جما کر وہ دھیان گیان میں مگن ہو گیا۔ آٹھ پہر آنکھیں بیچے سوکھے کاٹھ کی مانند ساکت و جامد گڑا بیٹھا رہا۔ ارد گرد بیٹھے ہوئے لوگ اسے بڑی عقیدت بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ جیسے آسمان سے اتری ہوئی کوئی مخلوق ہو ورنہ آٹھ پہر بے حس و حرکت کوئی کیسے بیٹھ سکتا ہے؟--- طالبا اور جمالا خاص طور پہ بڑے متاثر تھے' اس کی آمد اپنے لئے بڑی مبارک سمجھ رہے وتھے--- رات کے دوسرے پہر جمالے نے جرات کرتے ہوئے سنیاسی بابا کے سوکھے سڑے گھٹنے کو پولے پولے دبانا شروع کیا۔ سنیاسی بابا نے سرخ انگارا آنکھیں اس پہ گاڑتے ہوئے زور سے نہ سمجھ میں آنے والا نعرہ بلند کیا تو سوتے' جاگتے' اونگھتے' سب ہی ہڑبڑا کر سہم سے گئے۔

"بچہ! تم نے ہمارے دھیان میں کھنڈت کاہے ڈالی ہے---؟" سنیاسی بابے کا استخوانی ننگا پنڈا لرز رہا تھا۔

جمالے نے پاؤں پکڑ لئے۔ "بابا! غلطی ہو گئی ہے' معاف کر دو--- روٹی پانی کا بندوبست ہے' من چاہے تو کچھ کھا پی لو---"

سنیاسی بابا نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ "تیرے سریر سے ماس کی بُو آ رہی ہے--- سادھو برہمچاری ہے۔ ناری' ماس' چھل کپٹ' لوبھ واسنا سے دُور ہے بچہ---!" جمالے نے سر جھکا کر اعتراف کیا کہ وہ پیشے سے قصائی ہے' اب یہ کام چھوڑ چکا ہے۔ "--- بابے نے کہا۔ "پر تیری رکت میں کچے ماس کی پِٹ ہے--- تو نے مجھے چھو کر بھرشٹ کر دیا' میں تیرے ہاتھ کا جل بھوجن نہیں لوں گا۔"

جمالا ہاتھ جوڑ کر گڑگڑاتے ہوئے معافی مانگنے لگا۔ طالبے نے ساگ پات کا بھوجن سامنے لا رکھا۔ دو چار لقموں کے بعد سنیاسی بابا نے ہاتھ کھینچ لیا اور کلیان طلب کیا۔ رات بھر میں اس مدقوق پیر فرتوت نے پاؤ بھر مدک پھونک ڈالی--- جمالا جان چکا تھا کہ یہی وہ ہستی ہے جو اس کی کایا پلٹ سکتی ہے' لہٰذا جی جان سے وہ اس کی خدمت میں جُت گیا۔ گوشت سے پرہیز کر لیا' جونکیں لگوا کر فالتو خون نکلوا دیا اور دن رات اس کے چرنوں میں بیٹھ رہا۔ سنیاسی بابا بھی اب آہستہ آہستہ مائل بہ کرم ہو رہا تھا--- ڈیرے پہ آنے جانے والوں میں پاس کے گاؤں کا ایک اوباش چوہدری بھی تھا جو موج میلے اور وقت گزاری کی نیت سے اکثر یہاں آیا کرتا تھا۔ ایک روز وہ حلقے میں بیٹھا نشہ پانی کر رہا تھا کہ اچانک سنیاسی بابا کی نظر اس پہ آ ٹکی۔ اشارے سے پاس بلایا اور کچھ لمحے گھورنے کے بعد جھولے سے ایک ریٹھا نکالا' تنکے سے کسی دوا کے چند ذرے نکال کر اسے چٹا دیئے اور ہولے سے کان میں کچھ پھونک کر وہاں سے رخصت کر دیا۔

جمالا پاس بیٹھا' پاؤں داب رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ آیا اور کچھ نہیں' پوچھنے کی جرات بھی ہوئی--- دوسرے روز وہی چوہدری خوشی کے شادیانے بجاتا ہوا آیا اور سنیاسی بابا کے قدموں میں ڈھیر ہو گیا۔ ایک پوٹلی نذر گزاری' تڑے مڑے لمبے لمبے غلیظ ناخنوں والے ہاتھوں کو بوسے دیئے۔ سنیاسی بابا نے مزید ایک اور خوراک کھلائی اور کہا۔ "جا' بچہ! اب ساری زندگی عیش کر--- جان سے چھوٹ جاؤ' جوانی نہ چھوٹے گی---"

ریشمی پوٹلی میں مصری' مدک' چرس کی بھیلی' سونے کا کنگن اور بہت سے روپے تھے۔ جمالے کی آنکھیں چندیا گئیں۔ سنیاسی بابا نے سب کچھ اس کی تحویل میں دے دیا اور کہا "بچہ! مایا موہ اور لوبھ لالچ سے بچنا ہی سنیاس ہے---"

جمالے پر اس کا کیا اثر ہونا تھا' وہ تو بنا ہوا ہی حرص و ہوا کے حرفوں کا تھا اور سونے کی کان اس کے ہاتھ آ گئی تھی۔ وہ سانپ بنا' سنیاسی بابا کے گرد کنڈلی مارے اپنے حصار میں لئے بیٹھا تھا' گیان دھیان کا عذر پیش کرتے ہوئے کسی کو قریب نہیں پھٹکنے دیتا تھا۔ اس کا بگ موتر اپنے ہاتھوں سے صاف کرتا' لنگوٹی کستے ہوئے ایک دن یہ عقدہ بھی کھل گیا کہ یہ مسلمان نہیں ہے--- ادھر طالبے کو اپنے کام دھندوں سے فرصت نہیں تھی' وہ اکثر غیر حاضر رہتا۔ ڈیرے کا کرتا دھرتا جمالا ہی تھا۔

ایک دن ایک غریب دیہاتی ذخیرے میں روتا ہوا آیا اور سنیاسی بابا سے فریادی ہوا کہ اس کے بوڑھے باپ کو فالج کا اثر ہو گیا ہے۔ سنیاسی بابا نے جمالے کے ذریعے حکم دیا کہ اسے یہاں لے آؤ۔ وہ غریب کسی دور کے گاؤں سے پیدل آیا تھا' اپنی مفلسی کا رونا لے کر بیٹھ گیا۔ جمالے سے پچاس روپے پا کر وہ شام تک بیمار باپ کو لے کر واپس پہنچ گیا۔ سنیاسی بابا نے ایک نظر مریض پہ ڈالی' فالج زدہ ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر سہلایا۔ مریض کی انگلی میں تانبے کا ایک چھلا تھا اتروا کر جمالے کے سپرد کرتے ہوئے مریض کو آگ کے الاؤ کے قریب لٹانے کا حکم دیا اس طور کہ اس کے پاؤں کے تلوے الاؤ کی جانب رہیں۔ کلیان بھروا کر انگارے کے نیچے اس کا چھلا رکھ کر دو چار لمبے لمبے کش کھینچے' پھر آنکھیں موندھ کر بے سدھ لمبا لمبا پڑ گیا۔ حلقے میں بیٹھے ہوئے عقیدت مند آنکھیں پھاڑے ہوئے' مبہوت سے ساری کارروائی دیکھ رہے تھے۔ اچانک سنیاسی بابا نے آنکھیں کھولیں۔ جھولے سے ایک چمڑے کی تھیلی سے کوئی دوا نکال کر مریض کی زبان پہ رکھنے کو حکم دیا اور کلیان الٹ کر نیم گرم تانبے کا وہی چھلا جو اب سیاہ رنگت اختیار کر چکا تھا' مریض کے بیٹے کے سپرد کرتے ہوئے کہا۔ "اسے مریض کے متاثرہ حصے والے ہاتھ کی تیسری انگلی میں پہنا دو اور حقے کا پانی دو گھونٹ پلا کر اسے اسی جگہ صبح تک پڑا رہنے



دو---"

اگلی صبح لوگوں نے عجیب چمتکار دیکھا کہ مریض ہشاش بشاش چہل قدمی کر رہا ہے جیسے وہ کبھی بیمار ہی نہ رہا ہو۔ سنیاسی بابا نے مریض کے بیٹے کو حکم دیا کہ اب تم باپ کو گھر لے جا سکتے ہو' سات دن اسے خرگوش اور جنگلی کبوتر کے لہو کے دو دو قطرے شہد کے ساتھ چٹاؤ۔ دودھ' مکھن اور کچھ مقوی خوراک کھلانے کی ہدایت بھی کی۔ وہ غریب ہاتھ باندھ کر اپنی تنگدستی کا رونا رونے لگا--- سنیاسی بابا نے اسے پاس بلا کر' ہولے سے کان میں کہا۔ "اس کی انگلی کا چھلا فروخت کر کے اس کی خوراک کا بندوبست کر لینا---"

تانبے کا چھلا خالص سونے میں تبدیل ہو چکا تھا' گو سنیاسی بابا نے یہ بات راز میں رکھنے کی تاکید کی تھی مگر یہ راز' راز نہ رہ سکا اور جمالے کو بھی معلوم ہو گیا تھا کہ سنیاسی بابا کیمیا گر بھی ہے--- قرب و جوار میں جیسے زلزلہ آ گیا' لوگ تھے کہ جوق در جوق آنے لگے۔ دمہ' گنٹھیا' پرانا دق' اٹھراء' لقوہ فالج' مریضوں بیماروں کے پرے کے پرے دن رات یہاں جمع ہونے لگے۔ علاج معالجے کی ضرورتوں کے مطابق جڑی بوٹیاں' ادویات' مفردات' سمیات' مٹی کی ہانڈیاں کلیاں' اپلے گوبریاں اکٹھی ہونے لگیں۔ ظاہر ہے کہ یہ سارا انتظام اور اہتمام جمالے کے ہی سپرد تھا جسے وہ بڑی ذمہ داری اور دلچسپی سے سرانجام دے رہا تھا۔ اس نے اپنے کانوں' آنکھوں اور دماغ کے دروازے کھول رکھے تھے۔ نیند' آرام کی پروا کئے بغیر دن رات وہ دوائیں تیار کرنے میں مگن نظر آتا۔ کشتے' قرص' بھسم تیار کرنے کے طریقے اور آگ' الاؤ' پتہ' وزن' وقت' مقدار' خواص خاصیت' اندازے' کھرل گھوٹ' پرکھ پرہیز' چھوٹی چھوٹی جزئیات پہ گہری نظر رکھتا۔ سنیاسی بابا کی صورت میں جو حکمت و کیمیا کا خزانہ اس کے ہاتھ لگا تھا' وہ ہر قیمت پہ اسے حاصل کرنے کا تہیہ کر چکا تھا۔ سنیاسی بابا بھی اس کی دلچسپی' خدمت اور محنت دیکھ کر اعتماد کرنے لگا اور اب شہرت تھی کہ دور دور تک پھیل چکی تھی' دھن تھا کہ مینہ کی مانند برس رہا تھا۔ نذر' نذرانے' نقد' اجناس کی ریل پیل تھی۔ جمالا اور طالبا دونوں ہاتھوں سے سمیٹ رہے تھے۔ طالبے کو تو صرف مال و زر سے مطلب تھا جبکہ جمالا حکمت و کیمیا سیکھنے میں زیادہ دلچسپی رکھتا۔ اس کی چھٹی حس اشارے کر رہی تھی کہ جو کچھ سیکھنا' حاصل کرنا ہے اس میں دیر نہ کی جائے۔ یہ مخزن حکمت و دولت زیادہ دیر تمہارے قابو میں نہیں رہے گا۔ اسی مصلحت اور خدشے کے پیش نظر ہر نسخے اور تیاری کے طریقے کو ذہن نشین کرنے کے علاوہ وہ مکمل تفصیل سے اپنی ڈائری پہ بھی تحریر کر لیتا۔ امساک' قوت باہ اور مردانہ بیماریوں کے دو چار نسخے ایسے مشہور ہوئے کہ بڑی بڑی دور سے بڑے بڑے تماش بین' عیاش یہاں پہنچنے لگے

جو منہ مانگے داموں اپنے مطلب کے نسخہ جات حاصل کرتے اور سنیاسی بابا کے گُن گاتے۔

ان ہی مشغلوں میں کئی برس پَر لگا کر اڑ گئے---

کہتے ہیں کہ سنیاسیوں' جوگیوں' فقیروں' درویشوں کا کوئی ٹھکانا نہیں ہوتا مگر اس سنیاسی بابا کو یہ ٹھکانا شاید پسند آگیا تھا--- ویسے بھی وہ عمر کے اس حصے میں تھا جہاں انسان کے پاس سوائے لاغری' ناتوانی اور بے بسی کے کچھ بھی باقی نہیں بچتا یا پھر مزید دربدر خوار ہونے کی سکت باقی نہیں رہی تھی۔ بینائی انتہائی ناقص اور جسم سوکھے کاٹھ کی مانند ہو گیا تھا۔ پہروں غنودگی اور بے حسی کے عالم میں اپنے جھونپڑے کے اندر پرالی پہ ادھ موا سا پڑا رہتا اور جب کبھی گہری اونگھ سے ہڑبڑا کر چونکتا تو حاضری میں بیٹھا ہوا جمالا سلگتا ہوا کلیان مٹھی پہ جما کر اس کے ہونٹوں سے لگا دیتا' کھانستے کھانستے دو چار کش کھینچ کر وہ دوبارہ بے دم سا لڑھک جاتا--- جمالا' جان گیا تھا کہ سنیاسی بابا کی چڑیا اڑنے والی ہے۔ خاص خاص اہم قیمتی نسخے تو وہ حاصل کر چکا تھا اور سونا بنانے کی ترکیب اب اس کا آخری مقصد تھا' اسی مقصد کے لئے وہ آنے جانے والوں کو عجلت سے نبٹا کر زیادہ وقت بابے کی حاضری خدمت میں گزارتا کہ شاید اس کی خدمت کے انعام میں آخری وقت وہ کچھ عطا کر دے' کئی مرتبہ جمالا کرید و رید بھی کر چکا تھا مگر جواب میں وہ ہلکے سے مسکرا کر' آنکھیں میچ لیتا۔

جوان جاڑوں کی ایک ٹھٹھرتی ہوئی رات تھی۔ آس پاس' دُور دراز سے آئے ہوئے بہت سے مریض اور ان کے لواحقین ادھر ادھر گندے بوسیدہ لحافوں چادروں میں سوئے جاگے پڑے تھے۔ برگد کے نیچے آگ کا الاؤ دہک رہا تھا اور الاؤ کے ایک حصے میں بے شمار مٹی کی ہنڈیاں کشتہ پخت ہو رہی تھیں۔ نیلے پیلے آگ کے شعلے' کثیف گدلا دھواں۔ چربی کی چرانڈ' جڑی بوٹیوں کی ناگوار بو' ذخیرے کی پراسرار خاموشی اور اردگرد نشے کی ترنگ میں اونگھتے سوئے جاگے ملنگ بے فکرے--- جمالا سنیاسی بابا کی گندگی صاف کر کے' سلگتا ہوا کلیان تھما کر صاف سانس لینے اور طبیعت کے تکدر کو دور کرنے کی غرض سے جھونپڑی سے باہر نکلا اور الاؤ کے پاس کشتوں کی ہنڈیوں کو دیکھنے لگا۔ ایک ملنگ نے بھرا ہوا سگریٹ اسے تھمایا' پہلے بھرپور کش کا دھواں ابھی پوری طرح خارج کرنے نہ پایا تھا کہ سنیاسی بابا کے جھونپڑے سے دھویں کا ایک غبار بلند ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے شعلے بھڑکنے لگے۔ اس سے پیشتر کہ کوئی صحیح صورت حال کو سمجھتا' آگ پوری طرح جھونپڑی کو اپنی لپیٹ میں لے چکی تھی۔ ایک دم بھگدڑ مچ گئی۔ سوئے ہوئے لوگ ہڑبڑا کر اٹھ کھڑے ہوئے اور گھوڑے بیچ کر سوئے ہوؤں کو ٹھوکریں مار مار کر جگایا گیا۔ جدھر منہ اٹھا' بھاگم بھاگ شروع ہوئی۔ شور' چیخیں' بچاؤ' پانی لاؤ مگر پانی یہاں کہاں تھا؟ ایک کنواں اور وہ بھی دور' رہٹ والا یا پھر ڈیزل ٹیوب ویل تھا مگر مستری غائب--- ٹھاہ' ٹھاہ' ڈز' ڈز' جھونپڑے میں جڑی بوٹیاں' تیار تریاق ادویات جل اور پھٹ رہی تھیں۔ نیلا پیلا خاکستری دھواں جھونپڑے کے اطراف سے نکل رہا تھا۔ ذخیرے کے درختوں پہ محو استراحت پرندوں کی پھڑپھڑاہٹ اور چیخ و پکار نے قیامت کا ساماں پیدا کر دیا۔ اب تیزی پکڑتے ہوئے شعلوں نے آس پاس کے درختوں اور جھاڑ جھنکاڑ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ جنگلی خرگوش' چوہے اور تیتر بٹیر پھڑپھڑا کر ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ آس پاس کے گاؤں والے جب تک پہنچے' یہاں جھونپڑا خاکستر ہو چکا تھا' اب صرف کہیں کہیں خشک گھاس اور جھاڑیاں سلگ رہی تھیں یا پھر آس پاس کے درختوں کی ٹہنیوں سے دھواں نکل رہا تھا۔ آگ کی شدت اور تمازت کے کم ہوتے ہی درختوں کی آڑ میں دبکے ہوئے لوگ باہر نکل آئے اور قریب کے جوہڑ سے مٹکوں اور برتنوں میں پانی لا کر جھونپڑے کی جگہ پھینکنے لگے مگر وہاں بچا ہی کیا تھا جسے بچانے کے لئے پانی پھینک رہے تھے--- طالبا تو یہاں موجود ہی نہیں تھا اور جمالا پھٹی پھٹی آنکھوں سے ابھی تک جھونپڑے کی جانب حیران و پریشان دیکھ رہا تھا۔ چشم زدن میں سب کچھ راکھ ہو گیا۔ جمع شدہ پونجی' قیمتی ادویات' جڑی بوٹیاں' سنیاسی بابا کا گدڑی جھولا' اس کے اندر کے اسرار' سونے بنانے کی آرزو اور سب سے بڑھ کر سنیاسی بابا جسے شائد سلگتے ہوئے کلیان کی کوئی چنگاری کشتۂ اجل کر گئی تھی۔ صبح ہونے سے پہلے پہلے سوائے چند پرانے ساتھیوں کے سب ہی آہستہ آہستہ کھسک گئے' آس پاس کے لوگ بھی اپنی اپنی راہ لگ گئے۔



صبح کے دودھیا اجالے میں جمالا جھونپڑے کی جانب بڑھا۔ گو جوہڑ کا پانی پھینکنے سے سلگتا ہوا گھاس پھوس بجھ چکا تھا اور تمازت بھی قدرے کم ہو گئی تھی پھر بھی آگ کی سڑاند اور دھویں کی کڑاند باقی تھی۔ مٹی کی ٹوٹی ہوئی ہانڈیاں' جلے ہوئے چیتھڑے' جلی ادھ جلی لکڑیوں کے خستہ انبار' جھلسے ہوئے ٹہنیاں پتے اس کے پاؤں تلے چرچرا رہے تھے۔ ایک بڑا سا شیشم کا ٹہن پکڑے وہ جلا ہوا ملبہ کریدنے لگا' راکھ کریدنے سے کبھی کبھی کوئی شرمیلی سلگتی چنگاری نکل ہی آتی ہے۔ سنیاسی بابا کی چند خستہ ہڈیاں اور کھوپڑی کا تڑکا ہوا ناریل اس کے ہاتھ لگا۔ ان باقیات کو کپڑے میں لپیٹ کر' سر جھکائے خاموشی سے وہ ذخیرے سے نکل آیا' پاس ہی کے ایک گاؤں کے رہائشی بشیر ڈوگر سے اس کی پرانی یاد اللہ تھی' بہت پہلے جمالے نے اسے ایک مکروہ پرانی بیماری سے نجات دلائی تھی' وہ اس کا مرہون احسان بھی تھا اور دل و جان سے اس کی عزت بھی کرتا تھا۔ دس جماعت پاس' وجیہہ خوبصورت جوان' ماتھے پہ حرام کاری کی مہر' آنکھ میں سور کا بال' اس کا لاہور میں پبلک ٹیلی فون کا کاروبار تھا' یہ کاروبار اس کی بدفطرت اور

عیاشانہ ذوق کے عین مطابق تھا۔ فارغ اوقات میں ٹیلی فون کے ذریعے گھریلو خواتین اور لڑکیوں کو تنگ کرنا' فحش گوئی' لطیفے بازی' عاشقانہ شعر سنانا اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا' اسی ذریعے سے کئی لڑکیوں کو گمراہ کر چکا تھا اور ان دنوں وہ دو چار روز کے لئے گاؤں آیا ہوا تھا۔ ذخیرے میں آتشزدگی کی خبر اس تک پہلے ہی پہنچ چکی تھی' وہ آج ذخیرے پہنچنے کی تیاری کر رہا تھا کہ جمالا خود ہی پہنچ گیا ، ساری رام کہانی اسے سنائی' رفیق ڈوگر نے اسے ہر طرح کے تعاون کا یقین دلاتے ہوئے اپنے ساتھ لاہور چلنے کا مشورہ دیا۔

اگلے روز وہ دونوں لاہور پہنچ چکے تھے۔ دس پندرہ روز گھومنے گھمانے' سیرو تفریح اور دعوتوں میں گزر گئے۔ جمالا بھی اب ذہنی طور پہ قدرے سنبھل چکا تھا۔ ذخیرے کی کمائی سے سونے کی دو موٹی موٹی انگوٹھیاں' گلے کی وزنی زنجیر اور چند ہزار روپے اس کی جیب میں تھے۔ طب و حکمت کی چند کتابیں' کچھ کپڑے اور ضروری سامان خرید کر وہ اب کسی مناسب سی جگہ کی تلاش کرنے لگا جہاں وہ اپنا کاروبار جما سکے۔ رفیق ڈوگر نے اپنے حلقوں میں اس کی حکمت اور خاص الخاص کشتوں کے پہلے ہی ہوا باندھی ہوئی تھی۔ عیاش' بدکار اور بیمار لوگ اس کے پاس آنے جانے لگے تھے اور اپنی لچھے دار گفتگو' بلند و بانگ دعوؤں اور کشتوں' طِلوں کی حشر سامانیوں سے وہ ان کی آتش شوق اور ضرورت و طلب کو بھڑکا رہا تھا۔ اپنے آنجہانی سنیاسی بابا کی خوفناک کھوپڑی اور بازوؤں کی دو ہڈیاں' سینہ بہ سینہ صدری نسخہ جات اور چند پوٹلیاں اٹھائے آخر وہ پرانے سوڈیوال کے دو کمروں کے کوارٹر نما مکان میں آ بیٹھا۔ یہ جگہ اس کی ضرورت اور خواہش کے عین مطابق تھی۔ مکان کا ایک عقبی دروازہ پیچھے میدان کی جانب بھی تھا' یہاں وہ آسانی اور آزادی سے دوائیں پخت کر سکتا تھا۔ اردگرد دیہاڑی دار مزدور' رنگ ساز' چھابڑی اور ریڑھیوں والے' دودھ بیچنے والے گجر اور ساتھ والی بغلی گلی میں سازکاروں اور ہیجڑوں کے ڈیرے تھے۔ لمبے چوڑے خالی میدان میں ایک طرف گجروں کی بھینسیں بندھی رہتی تھیں۔ سڑک کی جانب آرہ مشین تھی' عمارتی لکڑیاں اور کٹے ہوئے پرانے پرانے درختوں کے انبار تھے اور دائیں کونے پیپل کے درخت کے نیچے ایک نیم پختہ مزار تھا جہاں ہر جمعرات کو قوالیاں ہوتیں اور دھمالیں ڈالی جاتیں۔ ہیجڑوں کے مجرے مقابلے ہوتے اور اردگرد سے محنت کش' بے کار' مستری مزدور' لچے لفنگے' ٹھرک باز' بھنگی چرسی' فحش حرکتوں اور اشارہ بازیوں سے ایک دوسرے کے سر یا گال پر نوٹ رکھ کر ویلیں نذر کرتے ہوئے ان کے رزق روزی کا وسیلہ بھی بنتے۔ یہی میدان اردگرد کے مکینوں کی رفع حاجت' نہانے دھونے' کپڑے سکھانے' گرمیوں میں باہر کھلی فضا میں سونے لیٹنے اور گپ شپ کی



ضروریات بھی پوری کرتا۔ جمالے نے یہاں پہنچتے ہی مزار پہ حاضری دی۔ بڑی عقیدت سے پھول پتی کی چادر چڑھائی' اگربتیاں سلگائیں۔ مزار کی خستہ حالت دیکھی تو فی الفور چار مزدور لگا دیئے۔ صفائی ستھرائی' کورے مٹکے' نیا جھنڈا' رنگ و روغن۔ مالی بلوا کر گلاب' نیازبو اور رات کی رانی کے پودے لگوا دیئے اور نگرانی کرنے والے ملنگ کو بھنگ گھوٹنے کا نیا کونڈا ڈنڈا اور کپڑے بھی دلوائے۔

چند ہی دنوں میں اس نے اپنے اردگرد کی ساری اجنبیت کو اپنے حسن سلوک اور زبان کی شیرینی سے دور کر دیا تھا۔ بشیر ڈوگر بھی ہر روز شام' اپنے جیسے دوستوں کے ساتھ پہنچ جاتا جو اسے بات بات پہ ویدجی اور حکیم صاحب کہتے نہ تھکتے تھے۔ کسی کو دوا دارو دیئے بغیر ہی ایک ماہر پیچیدہ امراض خصوصی' تبت کے ڈیڑھ سو سالہ سنیاسی بابا کے خاص شاگرد رشید کی حیثیت سے اس کی شہرت قرب و جوار میں طاعون کی طرح پھیل گئی اور مریضوں' عیش و عشرت کرنے والوں کے اصرار اور تقاضوں سے مجبور ہو کر بالآخر اس نے اپنا دھندا شروع کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ دو عدد ہٹے کٹے ملازم تلاش کئے گئے۔ فوری ضرورت کا کچھ سامان خریدا اور پچھلے دروازے کے سامنے کے میدان کا کچھ حصہ ہموار کروا کر گھاس پھونس کا چھپر ڈال دیا۔ جب بھسم تیار کرنے کے لئے الاؤ روشن ہوا تو بھنگ چرس کے رسیا اور یارانِ شب زندہ باش بھی جمع ہونے لگے۔

سونا بنانے کی جستجو اور بھسم بنانے کے شوقین لوگوں کے متعلق سب ہی جانتے ہیں کہ یہ جنونی اور حسرت ساماں لوگ دنیا و مافیہا سے بے خبر' اپنے مقصد اور تکمیل شوق کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دیتے ہیں اور امید و یاس کے درمیان لٹکے بندھے آخر ایک دن سب کچھ لٹا کر مر کھپ جاتے ہیں۔ ان میں کچھ تو محض ان چیزوں کی تیاری کا عمل دیکھنے' معلومات اکٹھی کرنے اور ایسے پراسرار موضوعات پہ محض زبانی کلامی گفتگو کرنے کے ٹھرکی ہوتے ہیں۔ کیمیاگری' حکمت اور بھسمیات تیار کرنے کا عمل جہاں بے پناہ ہنر مندی' مشاقی' محنت' صبر اور فراوانی وقت کا متقاضی ہوتا ہے وہیں کثیر سرمائے' وسائل' محنت' صبر' جبر اور مسلسل شب بیداریاں بھی چاہتا ہے۔ تریاق دم پخت کرنے والے' ہفتوں عشروں کھرل کونڈوں کی مسلسل پسائی رگڑائی کرنے والے' الاؤ آگ کی تمازت پہ دھیان اور معجونیں روغن قرص گولیاں بنانے والوں کو شب بیداریاں' مسلسل بیٹھکیں' مختلف مزاجوں کی ادویات کے لمس' بو اور ذائقے' سمیات کے زہریلے اثرات تباہ و برباد کر دیتے ہیں' وہ انسان سے زیادہ جن بن جاتے ہیں۔ ویدوں' سنیاسیوں' کیمیاگروں' مہوسوں کے جسم چہرے حلیے دیکھیں تو وہ کوئی اور ہی مخلوق

دکھائی دیتے ہیں۔۔۔ الاؤ کے گرد اونگھتے جاگتے ملازم، نشے کی ترنگ میں گانے بجانے۔ اور تاش کی بازیاں جمانے والے ساری ساری رات انگڑائیاں توڑتے رہتے۔ چھ سات کوارٹر، ادھر ڈوم میراثی اور ہیجڑوں کے ڈیروں سے شام اُترتے ہی بنے سنورے ہیجڑے اپنے پچھلے دروازے کھول دیتے، پانی کا چھڑکاؤ کرتے، بڑے اہتمام سے چارپائیاں اور تخت پوش بچھا کر اپنی منڈلی جماتے اور بھانت بھانت کی بے سری آوازوں، اشاروں، اداؤں، نخروں سے ارد گرد کے چھڑوں کی دلبستگی کا ماحول پیدا کرتے۔ ان کا استاد گرو حاجی رجی بیگم بڑے ٹھسے اور رکھ رکھاؤ سے، ریشمی چادر بچھی چارپائی پہ تکیئے سے ٹیک لگائے نیم دراز، اپنے شاگردوں سے پاؤں دبواتا رہتا۔ حکیم جمالی سے اس کی ایک دو سرسری سی ملاقاتیں ہو چکی تھیں۔ اس کی زمانہ دیدن اور مردم چشیدن نگاہوں نے بھانپ لیا تھا کہ یہ آدمی بڑے کام کا ہے۔ خاص طور وہ اس کی مزار کی مرمت خدمت سے بے حد متاثر ہوا تھا اور اب وہ اسے کسی مناسب موقع پہ دعوت دینے کی سوچ رہا تھا۔۔۔ اگلے ہفتے ہی حکیم جمالی نے مزار کے اوپر پکا لینٹر ڈلوایا اور دو دیگیں تنجن کی چڑھوائیں تو اس کی عقیدت اور دریادلی کے مزید چرچے ہونے لگے۔ حکیم جمالی نے حاجی رجی بیگم کے ہاتھوں ہی فاتحہ اور لنگر تقسیم کروایا تھا۔ اس رات بھی خوب ناچ گانا ہوا۔ پاس پڑوس کے غریب غرباء، محنت کش، ڈوم مراثی اور ڈیروں والے ہیجڑے کھسرے تو خاص طور پر اس کے گرویدہ ہو گئے۔ پھر بہانے بہانے آنا جانا ہونے لگا اور چھوٹے موٹے کاموں میں پیش پیش رہنے لگے۔ راہ رسم بڑھی تو ایک دن حاجی رجی بیگم نے اسے اپنے ہاں دعوت پہ مدعو کر لیا۔

حاجی رجب علی عرف حاجی رجی بیگم ان ڈیروں کے ہیجڑوں کا سرپرست اور استاد گرو تھا۔ ساٹھا پاٹھا ہونے کے باوجود بڑا طرحدار، ٹھسے ٹھسکے والا، پکا نمازی، حاجی اور جہاندیدہ، کپور تھلے کے ایک خوشحال سکھ گھرانے میں پیدائشی ہیجڑا پیدا ہوا تھا۔ عزت دار باپ نے کرپان نکال کر اسے ختم کر دینا چاہا تو ممتا کی ماری ماں نے پاؤں پکڑ لئے، دہائی دی کہ میرا پہلوٹھی کا معصوم نردوش بالک ہے، یہ انیائے نہ کرو۔ رات کی تاریکی میں باپ نے اس پوت کو پوٹلی میں لپیٹ کر شہر سے باہر ایک بے آباد سی مسجد کی سیڑھیوں پہ پھینک دیا۔ صبح سویرے ایک بے اولاد نمازی ادھر آیا تو اس معصوم کو سینے سے لگا کر گھر لے گیا۔۔۔ کچھ لوگ اس قسم کی "پاپ پوٹلیاں" مسجدوں، مندروں، گردواروں کے پاس خدا، بھگوان، گرو کی نگرانی میں چھوڑ آتے ہیں۔ خدا نے اپنے اس بندے کے دل اور گھر میں اس معصوم کے لئے شفقت، جگہ اور رزق پیدا کر دیئے۔ وہ جان چکا تھا کہ یہ پیدائش ہیجڑا ہے مگر اس اللہ کے نیک بندے نے تو اسے انسان اور معصوم سمجھ کر اپنایا تھا۔



اپنی اپنی نیت اور اپنے اپنے کرم، نرم گرم زمانے کی ہوا کے تھپیڑے کھاتے کھاتے یہ گول مٹول، چٹا گورا صحت مند بچہ اب پانچ برس کا ہو چکا تھا کہ بٹوارہ ہو گیا۔ راستے میں وہ نیک انسان اپنی بیوی سمیت شہید ہو گیا مگر یہ بچہ کسی نہ کسی طرح پاکستان پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہاں آ کر وہ جیسے کھائی سے نکل کر کھڈے میں آگرا تھا، اس کی جنس کی وجہ سے کوئی بھی اسے قبولنے پر تیار نہ تھا، کئی مہینے بے یار و مدد مہاجر کیمپ میں پڑا رہا۔ آخر ایک ہیجڑوں کے گروہ نے اسے قبول کر لیا تب سے اب تک کا سفر اس نے اسی حیثیت سے طے کیا تھا۔ قدم قدم پہ ٹھوکریں، نفرت بھری نگاہیں، پھٹکاریں، فاقے، مصیبتیں اس کا مقدر اور رسوائیاں اور تضحیک اس کے گلے کا طوق تھیں۔ نیا نیا ملک تقسیم ہوا تھا۔ جہاں جس کے سینگ سمائے، وہ وہیں بیٹھ گیا۔ صاحب مزار بھی اپنی منڈلی کے ساتھ مندر کی کٹڑی میں براجمان ہوئے تھے اور یہ خوبصورت بچہ انہیں شروع ہی سے بہت اچھا لگا تھا۔ اس کی صاف ستھری عادتیں، مہذب گفتگو، ادب و آداب دیکھتے ہوئے اسے اپنا متبنٰی بنا لیا۔ ناچ گانے میں دلچسپی دیکھی تو پاؤں میں گھنگھرو ڈال دیئے۔ شب و روز کی محنت، ریاض، توجہ اور شوق نے رجی کو ایک شعلہ جوالا بنا دیا۔ درویش منش بابا کی صحبت خاص اور ہمہ وقت مصاحبت کی وجہ سے طبیعت کچھ تصوف کی جانب بھی مائل ہو گئی تھی۔ اشراف کا خون تھا، بابا نے اس کا رجحان دیکھ کر اس کی تعلیم و تدریس پہ بھی توجہ دینی شروع کی۔

مسیں بھیگیں تو یہ میٹرک پاس کر چکا تھا۔ نماز روزہ، دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ ناچ گانے کا شغل بھی جاری تھا۔ تعلیم، تجربہ، تکرار اور تعلقات انسان کے ذہن، فہم اور شعور کے بند دریچے کھول دیتے ہیں، سوچ خیال اور ادراک کی نئی نئی جہتیں سامنے آتی ہیں۔ وہ اپنی اس حالت، قدرت کی بے نیازی اور مقدر کی ستم ظریفی کا شاکی بھی ہوتا، اندر ہی اندر کڑھتا بھی رہتا۔ اکثر سوچتا کہ آخر میرا قصور کیا ہے اور کیا کوئی نامکمل بچہ، ماں کے پیٹ میں اپنی جنس کے متعلق کوئی فیصلہ کرنے پہ قادر ہے؟ اگر نہیں تو یہ نفرت، یہ حقارت ایسے بچوں کے نصیب میں کیوں لکھ دی جاتی ہے، اللہ کو قادر مطلق اور بے نیاز کہنے والے اس کی مشیت کو تسلیم کیوں نہیں کرتے۔ انسانی، اخلاقی اور قانونی منافقت کے اس دہرے معیار پہ وہ اکثر خون کے آنسو رو دیتا، اس کے آنسو پونچھنے اور دم دلاسہ دینے والے یہی ہیجڑے تھے جو شائد دنیا والوں کی نظر میں انسان، اشرف المخلوقات تو کیا، اللہ کی ادنیٰ سی مخلوق بھی کہلانے کے مستحق نہیں تھے۔ وہ بھی کبھی نفرت کا آتش فشاں بن جاتا۔ اس کا جی چاہتا کہ اس دنیا کے تمام مردوں کو ہیجڑا بنا کر ان کے پاؤں میں گھنگھرو باندھ دے۔۔۔ مندر میں متروکہ املاک کے کچھ جھگڑے پیدا ہو گئے

تھے۔ اثر و رسوخ والوں نے ملی بھگت سے ان کو ناجائز قبضے کے نوٹس دلوا دیئے اور ویسے بھی وہاں کے مکینوں کی اکثریت اس ہیجڑا پارٹی کو وہاں سے نکالنا چاہتی تھی۔ کسی لمبے چوڑے چکر میں پھنسنے کی بجائے وہ ایک اچھی خاصی رقم تھام کر وہاں سے نکل کر اس مضافاتی بستی میں چلے آئے۔ کوڑیوں کے مول زمین خریدی اور کچے پکے کمرے بنوا کر ڈیرے ڈال دیئے۔ ساز سنگت' ہنرمندوں اور شاگرد پیشہ ہیجڑوں کی اچھی خاصی نفری ساتھ تھی۔ ملک بھی اپنے قدموں پہ کھڑا ہو چکا تھا' ان کے حالات اور کار روزگار میں بھی برکت پڑنے لگی۔

یہاں پہنچنے کے ٹھیک پندرہ برس بعد بابا معمولی سی علالت کے بعد چل بسے۔ آدھی رات' خاموشی سے پیچھے کے میدان میں پیپل کے سائے تلے انہیں دفن کر دیا گیا۔ ساری منقولہ' غیر منقولہ جائیداد وہ اپنے اسی متبنیٰ یعنی حاجی رجی بیگم کے نام کر گئے تھے۔ بابا کا خلیفہ اور بااختیار گرو ہوتے ہی اس کی کایا پلٹ گئی تھی' جیسے وہ اب تک مردوں اور سماج کے منافقانہ رویوں سے نفرت کا ایک ایک ذرہ اپنے اندر کہیں اکٹھا کرتا رہا اور اب وہ ذرے' پتھریلے ٹیلے اور پہاڑ بن گئے ہوں' وہ اوپر کھڑا ہوا اور نیچے وادی میں ہیجڑوں سے نفرت کرنے والوں ان کو جہنمی اور لعنتی گردانے والوں پر اتنے پتھر برسائے کہ وہ اپاہج ہو جائیں' نامرد اور ہیجڑے ہو جائیں۔ ہر طرف ہیجڑے ہی ہیجڑے ہوں۔ زرق برق لباس پہنے' سولہ سنگھار کئے۔ گھنگھرو باندھے' مٹک مٹک لہک لہک لہراتے ناچتے گاتے اور پھر وہ انہیں ویلیں پھینکے۔۔۔ وہ اب تک کئی صحیح الوجود لڑکوں کو "زنانہ" بنا چکا تھا۔ اس عمل سے اسے بے پناہ تسکین حاصل ہوتی' خاص طور پر اس وقت تو اس کی حالت دیکھنے لائق ہوتی جب کہیں کسی خوبرو' تیکھے نین نقش' نرگسیت پسند لڑکے کو دیکھ لیتا۔ پھر اسے شیشے میں اتارنے کی خاطر وہ ہر حربہ استعمال کرتا۔ دامے' درمے' قدمے' سخنے' ہر طرح سے اپنے ڈھب پہ لانے کی کوشش کرتا۔ چاند عرف چاندنی' قدیر عرف نیلم' نواز جو اب نازو بن چکا تھا۔ اقبال' صابر' دیپک بنگالی' نذیر' نمو' ریشماں سندھن' گوگو' ڈینی عرف لیڈی ڈیانا' رحمت پانڈی عرف ریکھا' سیکنڈ ائیر کا طالب علم سرور اقبال عرف سری دیوی۔ ایسے ہی کئی ایک لڑکے اپنا مردانہ تشخص گنوا کر زنانہ مورتیں بن چکے تھے۔ لمبی لمبی زلفیں' مچنے ہوئے ابرو' خوبصورت خدوخال' نازو نزاکت میں ڈھلے ہوئے پیکر' انگ انگ بجلیاں' روم روم ردھم۔ محفلوں' شادیوں اور شوقیہ فرمائشی پروگراموں میں اپنے فن کا مظاہرہ کرتے اور اپنی حق حلال کی کمائی لا کر اپنے گرو کے آگے ڈھیر کر دیتے۔ ان کے مداحوں' قدردانوں میں جہاں نچلے طبقے' سستے ذوق شوق والے لچے لفنگے اور بدفطرتے ہوتے وہاں متوسط اور اونچے طبقے کے شوقین مزاج بھی تھے جو محض تفنن طبع اور شغل میلے



کے لئے پرائیویٹ محفلوں میں ان کی پذیرائی کرتے۔ میلے منڈیاں عرس' موت کے کنویں' دیہاتی تھیٹر' غرض ہر عوامی تفریحی سلسلوں میں ان کی جلوہ آفرینیاں نمایاں ہوتیں۔ اس طرح جہاں حاجی رجی بیگم کی دولت میں خاطر خواہ اضافہ ہوتا تھا وہیں اس کی شہرت و منزلت بھی بڑھتی تھی۔ اچھے بھلے مردوں کو ہیجڑا زنانہ بنانے کے کئی ایک سینہ بہ سینہ صدری نسخے اور طریقے اس کے پاس موجود تھے جنہیں وہ موقع محل' حالات اور ضرورت کے تحت استعمال کرتا تھا۔ میڈیکل سائنس اور حفظان صحت کے اصولوں کے خلاف یہ خطرناک ٹوٹکے' ننانوے فیصد خاطر خواہ نتائج سے ہمکنار ہوتے۔ حاجی رجی بیگم کے پیرو مرشد بھی مجرد یا نیم ہیجڑے تو تھے ہی' ان کے مسلک مقام کے متعلق کوئی بھی صحیح سے نہ جانتا تھا۔ کوئی انہیں گپت ولی سمجھتا اور کوئی محض تارک الدنیا درویش مگر وہ جو بھی تھے اس مخلوق کے ملجا و ماوا تھے جو اس دار فانی سے پردہ پوشی کے بعد ان کے لئے مستقل ٹھور ٹھکانے اور روزی رزق کا بندوبست کر گئے تھے۔

حکیم جمالی کے یہاں آ جانے سے اسے اپنے پیرو مرشد کی کمی پوری ہوتی ہوئی محسوس ہوئی' ایک آدھ بار اس نے دبے دبے الفاظ میں اس کا اظہار بھی کیا کہ میاں جی نے حکیم جمالی کے روپ میں ان کے لئے ایک مددگار بھیج دیا ہے' اب اس کی تکریم و معاونت میں کسی قسم کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں ہونا چاہئے۔ کچھ ہی عرصہ میں رہی سہی اجنبیت بھی دور ہو گئی۔ میراثیوں' ہیجڑوں اور دیگر آس پاس کے مکینوں نے مزار کے انتظامات اور آپس داری کے معاملات میں حکیم جمالی کی سرپرستی قبول کر لی۔ واقفیت اور شہرت' دھند کی مانند پھیل گئی' مریضوں کی قطاریں لگ گئیں اور ظاہر ہے کہ مریضوں میں اکثریت امراض خبیثہ اور داد عیش دینے والے عیاش لوگوں کی ہی تھی جو منہ مانگے داموں نشاط آور دوائیں حاصل کرتے۔ دواؤں' کشتوں کی پیداواری استعداد بڑھانے کی ضرورت پیش آئی تو عملہ ملازمین بھی آ گئے مگر صاحب حیثیت مریضوں' مہربانوں کی نشست و برخاست کے لئے یہ ڈبہ نما کوارٹر کسی طور بھی موزوں نہیں تھے۔ کاروباری نقطہ نظر سے بھی اب اسے نسبتاً" بہتر اور کشادہ جگہ کی ضرورت تھی چنانچہ دوائیں تیار کرنے والے شاگردوں اور دو چار ملازموں کو یہاں اسی جگہ چھوڑ کر وہ خود اس موجودہ دفتر میں اٹھ آیا تھا جس کے پچھلے حصے میں اس کا عشرت کدہ تھا جہاں وہ اس وقت اپنے بدقماش دوستوں کے ساتھ داد عیش دے رہا تھا۔

☆☆☆

حکیم جمالی کے ظلمت خانے کے باہر صبح کا اجالا پھیل چلا تھا۔ رات اپنی بساط الٹ چکی تھی' سارے مہرے باری باری پٹ کر اوندھے پڑے ہوئے تھے۔ حکیم جمالی ابھی تک غسل

خانے میں گھسا ہوا تھا اور اطلاعی گھنٹی کی آواز اس نے وہیں پہ سنی۔ باہر خوش نصیب میرج بیورو کی مالک مس عاشی کی لش لش سیاہ شیشوں والی گاڑی کھڑی تھی۔ مس عاشی کو اس نے رات ہی ٹیلیفون پہ اطلاع کر دی تھی۔۔۔ جلدی جلدی نہا دھو کر اس نے گالیوں اور ٹھوکروں سے دوستوں کو جگایا۔ کبوتری کو بھی جھنجھوڑا مگر تو بے سدھ پڑی تھی، شائد اسے احساس ہی نہیں تھا کہ رات اس کے ساتھ کیا بیت چکی ہے۔ ادھ کھلی، بے چارگی، غنودگی اور بے بسی کے غبار سے جل تھل سرخ آنکھیں عجیب سا نظارہ پیش کر رہی تھیں۔ اندر داخل ہوتے ہی مس عاشی نے ناک پہ رومال رکھ لیا اور چرس، شراب، تمباکو اور غلاظت کے تعفن سے بیزار ہو رک الٹے پاؤں دفتر میں واپس آ گئی۔ حکیم جمالی گیلے بالوں میں کنگھی کرتا ہوا اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

"کیسی ہے کبوتری۔۔۔؟" سگریٹ سلگاتے ہوئے اس نے مس عاشی سے پوچھا۔

"حکیم صاحب! پہلے بتایئے کہ رات یہاں آپ مُردے جلاتے رہے ہیں، سڑاند سے تے کرنے کو جی چاہتا ہے۔۔۔ توبہ توبہ، اتنی بدبو۔۔۔!"

وہ کمال ڈھٹائی سے بولا۔ "مس! بدبوئیں اور خوشبوئیں تو ساتھ ساتھ ہیں۔ آپ ایک نظر لڑکی کو دیکھ لیں، پسند آئے تو بات کریں ورنہ میرے پاس اور خواہش مند بھی ہیں۔۔۔"

"کوئی پھڈے کا خطرہ تو نہیں۔۔۔؟" وہ بھی سگریٹ سلگاتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"ایسی کوئی بات نہیں۔۔۔ پوڈری ہے، گھر سے بھاگی ہوئی ہے۔ ایسی کبوتری کا کوئی آگا پیچھا نہیں ہوتا، آپ مطمئن رہیں۔۔۔ اندر آ کر اچھی طرح دیکھ لیں، میں اسے زیادہ دیر یہاں نہیں رکھ سکتا۔۔۔"

مس عاشی نے اندر پہنچ کر اسے بھرپور نظروں سے ٹٹولا۔ پانی کے چند چھینٹے اس کے چہرے پہ پھینکے، چادر ہٹا کر اس کے وجود کو دیکھا، گالوں کو تھپتھپایا تو اس نے "اوں" کرتے ہوئے آنکھیں پٹپٹائیں۔

"ہوش کرو، بے بی! ہوش کرو۔۔۔" وہ اسے سہارا دیتے ہوئے اٹھانے کی کوشش کرنے لگی۔ حکیم جمالی نے کوئی مشروب اس کے ہونٹوں سے لگایا۔ چند گھونٹ حلق سے اترے تو اس نے موٹی موٹی آنکھیں کھول دیں۔

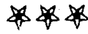
"میں۔۔۔ میں۔۔۔" وہ دائیں بائیں متوحش نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ "میں کہاں ہوں۔۔۔ آپ کون ہیں؟" وہ مس عاشی کو دیکھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"میری چندا! میں تمہاری بہن ہوں۔۔۔ اٹھو، نہا دھو کر فریش ہو جاؤ۔۔۔" وہ اسے



سہارا دے کر غسل خانے میں لے گئی۔

آدھے گھنٹے بعد وہ مس عاشی کی گاڑی میں بیٹھی کسی نئی منزل کی جانب جا رہی تھی۔



عشرت جہاں عرف عاشی دو عدد خاوندوں سے مطلقہ، بے شمار بدقماشوں کی داشتہ، دو عدد بچوں کی ماں، تعلیم یافتہ، تین عدد اسکولوں کی معطل استانی، کئی پولیس کیسوں میں ملوث، ابھی تک مس ہی تھی۔ خوبصورت، چھریرے سنبھالے ہوئے جسم کی مالک، لچھے دار گفتگو اور رجھانے لبھانے کے فن کی ماہر، دوسروں سے اپنی بات منوانے کے فن میں طاق، پہلی نظر میں معصوم کنواری دکھائی دیتی۔ بظاہر بے حد ملنسار، سوشل، ہمدرد، خدا ترس۔۔۔ اس کے اصل جوہر تو اس وقت کھلتے جب کسی کا اس سے پالا پڑتا، اس ناگن کا کاٹا پانی نہیں مانگتا تھا۔ بڑے بڑے پرانے کھلاڑیوں کا اس کے روبرو پتہ پانی ہو جاتا تھا۔ کئی اخباروں میں باقاعدگی کے ساتھ، خوش نصیب میرج بیورو کے اشتہار شائع ہوتے تھے جن میں شریف گھرانوں کی لکھی پڑھی، دولت مند، دین دار، سگھڑ لڑکیوں، کئی کئی مربعوں اراضی کی واحد مالک بیواؤں کے لئے شہری دیہاتی، پڑھے، ان پڑھ، خود مختار، عقد ثانی کے خواہش مندوں کے لئے خوشخبریاں ہوتیں۔ خوف خدا، انسانی ہمدردی، دکھی عوام کی بے لوث خدمت کے جذبے کا ذکر ہوتا۔ امریکہ کینیڈا کے ویزے، فیکٹریوں، زرعی زمینوں اور لاکھوں کے بینک بیلنس کے لالچ میں بڑے بڑے حرصی ٹٹو، چوہوں کی مانند اس کے چوہے دان میں پھنسنے کے لئے جوق در جوق آتے رہتے۔ اس کی خوبصورت کٹیلی آنکھوں والی کرچن مس مارگریٹ دن بھر ان غرض مندوں کے رجسٹریشن فارم پر کرتی اور لال ہرے نوٹ لمبے لمبے سرخ ناخنوں والی پتلی انگلیوں سے وصول کرتی رہتی۔ مڈل فیل، گریجوایٹ، رنگے بالوں، مصنوعی دانتوں اور وگ بردار نوجوان، کئی کئی بچوں والے کنوارے ایک دوسرے سے بچتے بچاتے، نظریں چراتے، اپنی اپنی قسمت کے فیصلوں کے منتظر رہتے۔ بدمزہ چائے کی سرکیاں لیتے ہوئے، غیر معروف ماڈل اور پرائیویٹ خوبصورت لڑکیوں کی تصویروں والے البم سے اپنے اپنے خوابوں کی شہزادیوں اور خیالی بیویوں سے رازونیاز کرتے رہتے۔ ان کے متعلق جملہ کوائف، ان کی عمر، قد، رنگ، اثاثوں جائیداد کا

جائزہ لیتے رہتے۔۔۔۔ خوبصورت لڑکیوں کی رنگین تصویروں والے یہ قیمتی البم خاص طور پر ان ضرورت مندوں کے لئے میز پہ نمایاں طور پر رکھے جاتے۔ رجسٹریشن کی بھاری فیس وصول کرنے کے بعد ان لوگوں سے تین مختلف انداز کی تصویریں' تعلیمی اسناد' ملازمت' کاروبار' شناختی کارڈ اور ذاتی جائیداد کی تفصیل' گاڑیوں اور بینک بیلنس کی نقول طلب کی جاتیں۔ ان کی فراہم کردہ معلومات اور نقول کی روشنی میں ان کو مختلف درجوں یعنی اے بی سی میں تقسیم کر کے ان کی حیثیت کے مطابق ان سے سلوک کیا جاتا۔ تیسرے درجے کے پھکڑ' محض خوبصورت لڑکیوں کے شوقین حضرات کو مسلسل وعدہ فردا میں رکھ کر بے دم کر دیا جاتا' یہ بدبخت چکر لگا لگا کر خود ہی چکرا جاتے اور آخر کار کسی اور شادی دفتر کا رخ کرتے یا داتا دربار چلے جاتے' اس کلاس کے لوگوں سے محض رجسٹریشن فیس ہی وصول ہوتی۔ بی کلاس کے کلائنٹ وہ ہوتے جن میں تھوڑا بہت مالی استحکام دکھائی دیتا' اس سے مختلف حیلوں بہانوں سے پیسہ بٹورا جاتا۔ خوب خاطر مدارت ہوتی' آج کل میں کامیابی کی امید دلائی جاتی۔ کبھی کبھی کسی فرضی لڑکی یا والدین سے انٹرویو کرا دیا جاتا۔ کمیشن پہ کام کرنے والی آبرو باختہ لڑکیوں سے ملاقات کرائی جاتی' ایک دوسرے کو سمجھنے جاننے کے بہانے ان کو تنہائی اور ہوٹلوں' پارکوں' تھیٹروں' شاپنگ سنٹروں میں گھومنے کے مواقع فراہم کئے جاتے' اس طرح بھی ان کو ہلکا کیا جاتا اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا جب تک اس غریب کی جیب خالی نہ ہو جاتی۔ اے کلاس میں وہ لوگ ہوتے جن کا مالدار باپ نیا نیا فوت ہوا ہو یا پھر جن کے پاس کہیں سے حرام کا مال آیا ہو۔ دبئی پلٹ' بیوقوف حرصی بوڑھے' وہ دیہاتی جن کی بنجر زمینیں کسی سکیم میں آ گئی ہوں۔ پھوہڑ بیویوں سے بیزار دولت مند عیاش ادھیڑ عمرے یا پھر کوئی اولاد نرینہ کے طلب گار جو اپنی پہلی بیوی سے چھپ کر دوسری شادی کرنا چاہتے ہوں یا پھر وہ لوگ جو اپنی سماجی حیثیت یا کسی بھی اور وجہ سے "اس بازار" جانے کے متحمل نہ ہوں۔ اس قبیل کے لوگ ان کے لئے وی آئی پی کی حیثیت رکھتے۔ جو کوئی منہ مانگے دام دیتا تو فوراً" اس کا دامن مراد بھر بھی دیا جاتا۔ ان امیدواروں میں کئی ایک گانٹھ کے پکے یا جھگڑالو قسم کے پرانے پاپی بھی ہوتے' ایسے لوگوں سے نبٹنے اور معاملہ صحیح رکھنے کے لئے چند پڑھے لکھے بدمعاش ٹائپ کے ملازم بھی موجود تھے' کہیں معاملہ بگڑنے پہ اپنی پہچان کے پولیس ملازموں سے بھی مدد لی جاتی اور ایسے لوگوں کو باقاعدگی سے ماہوار خرچہ پانی پہنچایا جاتا۔ کئی ایک کو جسمانی اور جنسی طور پر کمزور لاغر بتا کر حکیم جمالی سے مشورہ اور علاج کی ترغیب دی جاتی' رہی سہی کسر یہ نکال دیتا اور اگر اس کے پورے طرح نچوڑنے کے باوجود بھی لیموں میں چند قطرے رس کے رہ جاتے تو پھر اسے عامل ظہوری



شاہ کے آستانے میں داخل کروا دیا جاتا جو پہلے اس کا زائچہ بناتا' ستاروں کی چولیں چالیس درست کرتا۔ برجوں کے گھر مرمت کرتا' سعد و نحس کے راستے صاف کرتا۔ پھر الو کی چونچ' چیتے کی چربی' ہما کا پنکھ' ققنس کی کلغی طلب کرتا اور پھر سائل کی سہولت کے لئے خود ہی تکلیف کر کے تبت سے منگواتا۔ سائل اس دوران میانی صاحب' جیل خانے' پاگل خانے یا بہت ہی غیرت والا ہو تو ریل کی پٹری تک پہنچ جاتا۔

عامل ظہوری شاہ کے آستانے پہ مردوں سے زیادہ خواتین آتی تھیں۔ لڑکیاں زیادہ ہوتیں جو من پسند شادی کی خواہش مند اور محبوب کو اپنے قدموں میں زیر کرنے کی متمنی ہوتیں۔ ان سادہ لوح بیوقوف بدنصیب لڑکیوں میں کئی ایک ان بھیڑیوں کے نرغے میں گھر کر رہ جاتیں۔ عامل ظہوری شاہ ان کے ملن کے ستارے سیدھے کرتا کرتا ان کی جیبیں الٹی کر دیتا' حساس قسم کی معلومات حاصل کر کے بلیک میل کا سامان بھی تیار رکھتا یا پھر مس عاشی سے ملا دیتا جو ان کو پڑھے لکھے متمول رشتوں کا جھانسا دے کر مزید مال بٹورتی۔ ظاہری ہمدردی' انسانی خدمت' گاڑی' بنگلے' ہوٹل' کپڑے' میک اپ' کھانا پینا' آسائشیں' آسامی کو پاگل کر دیتیں۔ اب اس بدقسمت کی قسمت کہ وہ خلیج کی ریاستوں میں کہیں سمگل ہوتی ہے' کسی نئے نئے دولت مند کے عشرت کدے کی زینت بنتی ہے یا پھر کسی وڈیرے کے حرم میں داخل ہوتی ہے اور اگر کچھ نہیں تو پرائیویٹ قحبہ گیری تو مقدر۔ حرام کی مہر جن کی پیشانیوں پہ ٹھکی ہوتی ہے وہ لاکھ کوشش کے باوجود کسب حلال نہیں کر سکتے اور جو حرماں نصیب ان کے چنگل میں ایک بار پھنس جائیں' ان کے پاؤں تلے دلدلیں آ جاتی ہیں اور آزاد ہونے کی ہر کوشش پہ وہ مزید دھنستے چلے جاتے ہیں۔ سارے کا ہر تنکا تیر اور ہر تنا اژدھا بن کر ان پر اپنا منہ کھول دیتا ہے۔

وہ نوچی کھسوٹی نو گرفتہ کبوتری بھی فکر سود و زیاں سے بے نیاز' تردد آہ و فغاں سے بیزار' جسم و جاں سے بے خبر' منہ کھولے ساگوان کے دراز پلنگ پہ ریشمی بستر میں گٹھڑی بنی پڑی تھی۔ کھلے لبوں کے کونے سے رال کی پتلی سی دھار' تار عنکبوت کی مانند تکئے سے تنی تھی جیسے معصوم بچے بے سدھ سوتے ہیں۔ کمزور سادا یاں ہاتھ پھولے ہوئے گال کے نیچے اور گردن' چہرے پہ نیلے نیلے نشان۔ ابھرے' پچکے ہونٹ جیسے پھٹے ہوئے غبارے کو بچے منہ سے کھینچ کھینچ کر چھوٹے چھوٹے بلبلے سے بنا لیتے ہیں۔ بے آب و رنگ الجھے ہوئے بال' نیند کے اندھے جنگل میں کہیں کسی بھٹکے ہوئے غزال کی مانند' نیم وا سہمی ہوئی متورم آنکھیں۔ کیسی بے بسی' بے کسی اور بے نوائی کی تصویر تھی۔ ان تصویروں سے کتنی مختلف' جو اس بیڈ روم کی دیواروں پہ آویزاں تھیں۔ نیم عریاں' جذبات میں ہیجان پیدا کرنے والی شیطان زادیوں کی

تصویریں!۔۔۔ سائیڈ ٹیبل پہ موسمی پھل‘ جوس اور ٹیلی فون پڑا تھا۔۔۔ انسانی دماغ بھی ایک ٹیلی فون کی مانند ہوتا ہے‘ شعور اور تحت الشعور سے جڑا ہوا۔ انسان چاہے سوئے یا جاگے‘ اپنے تحت الشعور سے جڑا رہتا ہے۔ اس کی کھوپڑی کے اندر کا شعوری حسیاتی ایکسچینج ہر حالت میں اپنا کام کرتا رہتا ہے۔ اس وقت بھی اس کے دماغ میں مسلسل ٹرن ٹرن گھنٹیاں بج رہی تھیں‘ قدرے ہوش و حواس میں ہوتی تو سوال و جواب کا یارا کرتی مگر وہ تو ایک نیم مردہ کبوتری کی مانند کابک میں بے یارومددگار پڑی تھی۔

☆☆☆

شوکت‘ عورتوں کا شکاری نہیں تھا۔ بس اتفاق سے یہ کبوتری خودبخود اس کی چھتری پہ آ بیٹھی تھی۔ سروسز ہسپتال میں وہ اپنے کسی عزیز کی عیادت کے لئے گیا تھا۔ فراغت کے بعد چائے پینے کی غرض سے کنٹین پہ پہنچا ہی تھا کہ پیچھے سے ایک آواز آئی۔

”جی‘ آپ کے پاس پانچ سو کا چینج ہو گا۔۔۔؟“

رکشہ کے پاس ایک لڑکی اس سے پوچھ رہی تھی‘ اتفاق سے اس کے پاس بھی کھلے روپے نہیں تھے۔ ادھر سے معذرت سن کر وہ پھر اپنے پرس کی الٹ پلٹ کرنے لگی۔ رکشے والا کہنے لگا کہ لائیے‘ میں باہر سے لا دیتا ہوں مگر پرس کی تلاشی سے اسے دس بارہ روپے مل گئے۔ دس روپے پھر بھی کم تھے۔ شوکت نے صورتِ حال دیکھتے ہوئے‘ دس کا نوٹ رکشے والے کو دے کر فارغ کر دیا۔

”شکریہ!۔۔۔ یہ لیجئے مجھے کنٹین سے چینج لے دیں۔۔۔“ وہ پانچ سو کا نوٹ اسے تھماتے ہوئے بولی۔

”آپ دس روپے کی فکر نہ کریں۔۔۔ آپ کا مسئلہ حل ہو گیا‘ یہی کافی ہے۔۔۔“ وہ بولا۔

”مگر مجھے بھی تو کھلے روپوں کی ضرورت ہے۔۔۔ آپ کنٹین سے تڑوا دیں اور مہربانی سے اپنے دس روپے بھی لے لیں۔۔۔“ وہ اصرار کرتے ہوئے بولی۔

”اچھا‘ آیئے‘ چائے پیتے ہیں۔ اسی بہانے چینج مل جائے گا۔۔۔“

وہ لڑکی معذرت کرتے ہوئے بولی۔ ”مجھے جلدی ہے اور پھر کچھ دوائیں بھی خریدنی ہیں مگر آپ کے دس۔۔۔“

”۔۔۔ کسی فقیر کو یا ہسپتال کے فنڈ میں دے دیجئے گا۔۔۔“

یہ سن کر کوئی جواب دیئے بغیر وہ عجلت سے ہسپتال کی جانب بڑھ گئی۔ یہ تھی پہلی



ملاقات!۔۔۔ دوسرے روز‘ وہ اسی وقت پھر اپنے عزیز کے پاس دوائیں پہنچانے کی غرض سے پہنچا تو وہ دس روپے والی کو بھول چکا تھا مگر لینے والی کو یاد تھا۔

”لیجئے‘ یہ اپنے دس روپے۔۔۔“ بڑے گیٹ سے ذرا آگے فروٹ والے کے پاس وہ کھڑی تھی‘ ساتھ ایک لڑکی بھی تھی جو شکل صورت سے اس کی چھوٹی بہن دکھائی دیتی تھی۔

”آپ بھولی نہیں۔۔۔ میں نے کہا تھا‘ کسی فقیر کو دے دیجئے گا۔۔۔“

وہ زبردستی نوٹ تھماتے ہوئے بولی۔ ”یہ نیک کام آپ خود ہی انجام دیں‘ اس مدد کا ایک بار پھر شکریہ!“

پیسے جیب میں رکھتے ہوئے وہ پوچھنے لگا۔ ”یہاں آپ کا کوئی مریض داخل ہے۔۔۔؟“

”میرے ماموں داخل ہیں۔۔۔“

”او‘ ہو۔۔۔ کیا تکلیف ہے انہیں۔۔۔؟“ ازراہ ہمدردی وہ بات بڑھاتے ہوئے پوچھنے لگا۔

”السر بگڑ چکا ہے۔۔۔ اور بھی کچھ تکلیفیں ہیں۔۔۔“

”اللہ انہیں صحت دے۔۔۔ میں کچھ آپ کے لئے کر سکتا ہوں؟“ رسماً اس نے پوچھ لیا۔

ساتھ چھوٹی بہن شاید عجلت میں تھی‘ وہ اسے کھینچتے ہوئے کہنے لگی۔ ”چلو نا‘ باجی! ماموں انتظار کر رہے ہوں گے۔۔۔“

وہ کچھ جواب دیئے بغیر ہی گیٹ کی جانب بڑھ گئی۔

چوتھے روز ایک بڑی سی خون آلودہ قے کے بعد کبوتری‘ یعنی نگہت کا ماموں قیدِ حیات سے رہا ہو گیا اور اس کے بعد ان کی ملاقات ہی نہیں ہوئی‘ وہ اسے بھول چکا تھا۔۔۔ دو اڑھائی ماہ بعد مال روڈ پہ خواتین کسی سلسلے میں احتجاج کر رہی تھیں‘ سڑک بلاک تھی۔ چیرنگ کراس کے پاس وہ موٹر سائیکل پہ سوار‘ کھڑا یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ خواتین کا چھوٹا سا جلوس احتجاجی بینر اٹھائے سڑک سے گزر رہا تھا‘ معاً اس کی نظر نگہت پر پڑی اور آپ اسے اتفاق یا کچھ بھی کہہ لیں کہ اسی لمحہ‘ اس کی نظر بھی اس کی نظر سے ٹکرا گئی‘ ہلکا سا مسکرا کر دونوں نے ایک دوسرے کو وش کیا۔ جلوس آگے بڑھ گیا اور وہ ٹریفک کھلنے کا انتظار کرنے لگا۔ سگریٹ سلگا کر وہ موٹر سائیکل اسٹارٹ کرنے ہی والا تھا کہ پیچھے سے آواز آئی۔

”آپ کے پاس پانچ سو کا چینج ہو گا۔۔۔؟“

دیکھا تو وہ نگہت تھی‘ وہی ہسپتال والی لڑکی۔۔۔ قدرے دبلی لیکن اسمارٹ‘ ہلکا سا میک

آپ' دلکش لباس' پرس جھلاتی ہوئی وہ مسکرا رہی تھی۔ وہ رسمی حال احوال پوچھنے کے بعد بولا۔

"گویا آج بھی آپ سے ملاقات چیلنج کے حوالے سے ہی نصیب میں لکھی ہے --- ویسے آپ خود بھی کافی چیلنج سی لگ رہی ہیں ---"

اس نے شرارت آمیز نظروں سے اس کے سراپے پہ نظریں ڈالتے ہوئے کہا تو وہ پھیکا سا مسکرا دی اور لمبی سانس بھرتے ہوئے بولی۔ "ہاں' چیلنج تو جیسے اپنی زندگی کے ساتھ چپک سی گئی ہے ---"

"میں کچھ سمجھا نہیں ---" وہ اسے کریدتے ہوئے بولا۔

"آپ سے چیلنج کے سلسلے میں ملاقات ہوئی --- ماموں جی اسپتال داخل تھے' وہ مر گئے۔ بہت بڑی چیلنج آئی۔ پھر ماں بیماری پڑی' بہنیں فیس ادا نہ کرنے کی وجہ سے سکول سے خارج کر دی گئیں۔ اب ایک دو روز ہی مکان کا کرایہ ادا نہ کرسکنے کی صورت میں ایک اور چیلنج ---" کہتے کہتے وہ خاموش ہو گئی' دونوں طرف سے خاموشی کے چند لمحے گزرے۔

"آگے بولو --- رک کیوں گئیں ---؟"

وہ دائیں بائیں دیکھتے ہوئے' بڑے بجھے ہوئے لہجے میں کہنے لگی۔ "اس وقت اگر فارغ ہوں تو چلیں' لارنس گارڈن میں بیٹھ کر چائے پیتے ہیں' ذرا چیلنج ہو جائے گی ---"

اس کی زخمی مسکراہٹ میں چھپی ہوئی آہیں کراہیں اس نے محسوس کرلی تھیں اس لئے نہ چاہنے کے باوجود وہ اس کے ساتھ ہو لیا۔ لارنس گارڈن وہ خاموش رہی۔

"چلیں' گراؤنڈ میں شاہ بلوط کے نیچے بنچ پہ بیٹھتے ہیں ---"

"اتنی دور؟ --- یہاں ریسٹورنٹ کے لان میں بیٹھ کر چائے پیتے ہیں ---" وہ اسے مشورہ دیتے ہوئے کہنے لگا۔

"نہیں' ادھر ہی بیٹھتے ہیں۔ چائے بھی ادھر ہی منگوالیں گے ---"

شاہ بلوط کے چھتنار تلے' سنگی بنچ پہ وہ کسی مہارانی کی طرح براجمان ہو گئی۔ وہ سامنے کھلے ہوئے پیلے گلابوں کے قطعہ کی جانب بڑی محویت سے نظریں گاڑے دیکھ رہی تھی۔ ایک بھنورا' پھول کے رخسار پہ بیٹھا رس چوس رہا تھا۔ اس کے اڑتے ہی اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"چیلنج ---"

"کس چیلنج کا ذکر کر رہی ہو --- کہو' کیا کہنا چاہتی ہو ---؟"

"ہاں ---" وہ جیسے راکھ کریدتے ہوئے بولی۔ "ایک چیلنج یہ بھی کہ میرے منگیتر نے



منگنی توڑ دی ہے ---" وہ اپنے ہاتھ کی ایک خالی انگلی پہ سفید سے نشان کو سہلانے لگی۔ پھر پرس کھول کر ایک پڑیا دکھاتے ہوئے بولی۔ "ایک دکھانے کی چیلنج یہ ہے ---"

وہ غور سے دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا۔ "یہ کیا ہے ---؟"

"یہ وہ تریاق ہے جو سوچوں کے زہر اور دکھوں' محرومیوں' مجبوریوں اور میری بے بسی کے قہر کا بہترین علاج ہے --- یقین کرو' اگر یہ سہارا نہ ہوتا تو میں ماموں کی بے بسی کی موت سے بہت پہلے ہی مر گئی ہوتی --- میں جانتی ہوں' مرنا برحق ہے مگر میں وقت سے پہلے مرنا نہیں چاہتی۔ ہر حال' ہر طور جینا میری مجبوری ہے بیمار ماں کے لئے' دو چھوٹی بہنوں کے لئے جن کی کفالت کرنے والا میرے سوا اور کوئی نہیں۔ کرائے کا مکان' مہنگائی ---"

"ذرا رکو ---" وہ پڑیا پکڑتے ہوئے پوچھنے لگا۔ "اس کا مطلب کہ تم یہ ہیروئن پیتی ہو؟"

وہ پڑیا احتیاط سے واپس لیتے ہوئے بولی۔ "میری باتیں سننے اور یہ پڑیا دیکھنے کے بعد بھی تم یہ پوچھ رہے ہو؟ --- یہ دیکھو ---"

وہ سگریٹ کی ڈبیا کی پنی پہ چٹکی سے پوڈر پھیلانے لگی اور چادر کے گھونگھٹ کی آڑ میں ماچس جلا کر زور زور سے سانس کھینچنے لگی۔ شوکت گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگا' اتفاق سے ادھر پاس قریب کوئی اور نہ تھا ورنہ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ اب اس کی سمجھ میں آیا کہ وہ اسے ادھر تنہائی میں لے کر کیوں آئی تھی --- اس کے سوچتے سوچتے وہ اپنا کام کر چکی تھی۔ ہلکے ہلکے سرور میں لہراتی ہوئی آنکھوں سے دیکھتی' استعمال شدہ پنی کی گولی بنا کر پرے پھینکتے ہوئے وہ بولی۔ "کوئی نصیحت کرنے کی کوشش نہ کرنا' نہ کوئی ہمدردی جتانا۔ مجھے ان بیکار چیزوں کی قطعی کوئی ضرورت نہیں۔ میں ان منافقانہ باتوں سے بہت آگے نکل چکی ہوں --- مجھے ساتھی کی ضرورت ہے' ناصح یا مشورہ دینے والی کی نہیں ---" یکدم اس کی آنکھوں میں شعلے سے دہکنے لگے اور وہ بڑے گھمبیر لہجے میں کہنے لگی۔ "ایک بات اور سنو! --- میری بسر اوقات جسم فروشی سے ہوتی ہے۔ میری بیمار ماں کے لئے قیمتی دوائیں' گھر کے اخراجات' بہنوں کی ضرورتیں' سب اسی سے چلتا ہے ---"

شوکت اپنا سر' ہاتھوں سے تھام کر جھک گیا۔ وہ بھی کوئی فرشتہ نہیں تھا۔ کالج' محلے میں وہ بھی چھوٹی موٹی منہ ماریاں کرتا رہا تھا مگر شرم' پردہ' حیا بھی کوئی چیز ہے۔ اس قسم کی بے باک لڑکی اور ایسی صورت حال سے کبھی اس کا واسطہ نہیں پڑا تھا' وہ واقعی کچھ گھبرا سا گیا تھا ---

سامنے میدان میں کچھ بچے فٹ بال کھیلنے آ گئے تھے۔ وہ اپنے خیالات کے دھارے کا رخ

بدلنے کے لئے ان کا کھیل دیکھنے لگا اور نگہت آنکھیں بند کئے' پیچھے ٹیک لگائے کسی اور ہی جہاں میں پہنچی ہوئی تھی--- شوکت سوچنے لگا کہ جو کچھ اس نے کہنا' کرنا اور دکھانا تھا وہ دکھا چکی ہے۔ نشہ پانی بھی کر لیا ہے۔ اب سکون لے رہی ہے' چپکے سے کھسک لو--- وہ اسے گہری نظروں سے تولتے ہوئے اٹھنے ہی والا تھا کہ بند آنکھیں' بند ہونٹ ہلے اور بڑبڑانے کے انداز میں وہ بولی۔ "مجھے چارہ گر اور ساتھی کی ضرورت ہے' ناصح کی نہیں---"

وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ "تمہارے مسائل کا کوئی شریفانہ حل ہے---؟"

"نہیں---" وہ جیسے قطعیت سے بولی۔ "میں جس ریڈی میڈ ملبوسات کی فیکٹری میں کام کرتی تھی وہاں کپڑے بناؤ' نہ بناؤ مگر سر جھکانا ضروری تھا لہٰذا انکار کی صورت میں فارغ کر دی گئی۔ انار کلی میں خواتین کے لئے مخصوص بازار میں ایک سٹور پہ نوکری ملی تو سفید داڑھی والے حاجی صاحب نے پرائیویٹ شادی کی دعوت دے ڈالی۔ ایک پرائیویٹ کلینک میں جاب ملی تو ایک ڈاکٹر صاحب میرے ہی مریض بن گئے--- کس کو بتاؤں کہ ماموں کی بیماری اور پھر تجہیز وہ تکفین پہ اٹھنے والے اخراجات کہاں سے پورے ہوئے' کہاں سے آئے--- سنو! وہ مالک مکان نے دیئے تھے جو نیچے کی منزل میں رہتا ہے۔ کیا بتاؤں کہ رات ہسپتال میں گزارنے کے بہانے' میں کہاں ہوتی تھی' ماموں کے انتقال کے وقت بھی میں اسی "محسن" کے پاس تھی۔ میں نے اسے کہا بھی کہ مجھے آج جلد فارغ کر دو' میرے ماموں کی حالت بہت نازک ہے مگر جانتے ہو کہ اس نے کیا جواب دیا؟--- اس نے کہا کہ میری بھی حالت بہت نازک ہے۔ صبح اس نے میرے ہاتھ پہ پانچ سو روپے دھرے' میں بھاگی بھاگی ہسپتال آئی تو میرے ماموں کی لاش مردہ خانے میں دھری تھی---" وہ ہلکا سا مسکراتے ہوئے بولی۔ "پہلے دن جس پانچ سو روپے کے نوٹ کے لئے تم سے چینج مانگا تھا وہ نوٹ بھی اسی کی عطا تھا' اس وقت میں اس کے پہلو سے اٹھ کر آئی تھی--- میں اپنے کئی ہمدردوں کے پاس بھی گئی مگر انہوں نے بھی منہ موڑ لیا---" پھر جیسے وہ کسی کنویں سے بولی۔ "اب تو میری بوڑھی بیمار ماں بھی میرا ذریعہ معاش جانتی ہے--- ماں ہے نا!--- اس مجبور اور بے بس نے اپنے ہونٹ سی لئے ہوئے ہیں' ایک لفظ تک نہیں کہتی۔ شائد وہ میرے ہی انداز سے سوچتی ہے کہ جن عورتوں کے سر پہ خاوند نہ ہو' بہنوں کا بھائی نہ ہو انہیں مر جانا چاہئے یا پھر زندہ سلامت رہنے کے لئے ضمیر کو مردہ' آنکھیں بند اور کان بہرے کر لینے چاہئیں---"

اس نے پرس سے پیکٹ نکالا' سگریٹ سلگاتے ہوئے پھر گویا ہوئی۔ "--- اور سنو! آج بھی میں اسی چکر میں مال روڈ پہ آئی تھی۔ عورتوں کا جلوس دیکھا تو شامل ہو گئی اور اچانک تم دکھائی دیئے--- دوست! آج جیب خالی ہے۔ مالک مکان کرایہ مانگ رہا ہے۔ خیر' اس سے تو میں نبٹ لوں گی مگر ماں کی دوائیں' گیس اور بجلی کے بل--- چلو' ساتھی بنو۔ کچھ دو' کچھ لو۔ سیدھے ہاتھ کا سودا---"



اچانک بولتے بولتے وہ رکی اور ذرا خاموشی کے بعد اپنا پرس بنچ پر الٹتے ہوئے دکھانے لگی۔ "دیکھو--- یہ بجلی' گیس اور پانی کے بل--- یہ دیکھو' میرے ماموں کی تصویر--- یہ میرے ذلیل منگیتر کی تصویر--- یہ میری پرائیویٹ ڈائری جس میں میرے گاہکوں کے ٹیلی فون نمبر کوڈ ورڈ میں لکھے ہیں--- یہ شیشی' یہ خاص گولیاں---" پھر اپنا جوتا اتارا۔ "یہ ہیروئن کی پڑیاں--- یہ میرے "ساتھی" ہیں' "ہمدم" ہیں---" وہ رونے لگی۔ "دیکھ چکے ہو سب کچھ' اب سینے کا پرس کیسے الٹوں۔ تمہیں وہ سب کچھ کیسے دکھاؤں--- جو کچھ اندر ہے وہ نہ دیکھو تو بہتر ہے---" پھر وہ یکبارگی سب کچھ الٹا سیدھا پرس میں ٹھونسنے لگی اور بولی۔

"اٹھو--- چائے پلاؤ' سر پھٹنے لگا ہے---"

چائے کے دوران دونوں جانب سکوت اور سکون رہا۔ جیسے کھل کر مینہ برسنے کے بعد پراسراری سی کیفیت اور خاموشی طاری ہو جاتی ہے۔

وہ اٹھتے ہوئے بولی اور شوکت تو جیسے حنوط کیا ہوا پتلا بن گیا تھا' خاموشی سے ساتھ چل دیا۔ ریس کورس پارک میں گھومتے وہ جھیل کے پیچھے ٹیلے کی اوٹ میں بیٹھ گئے۔ نگہت نے پنی اور ماچس نکالی۔ شوکت پہلے ہی پراسرار خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ چند لمحے بعد وہ فارغ ہو چکی تھی۔ آنکھوں میں وہی کیفیت پیدا ہو گئی' پھر یکبارگی اس نے شوکت کا ہاتھ تھام لیا۔ "مجھے ہر حال میں کچھ معقول سی رقم چاہئے---"

وہ اس کی گردن سہلانے لگی اور شوکت نے اپنا پرس نکال کر اس کی گود میں رکھ دیا۔

"جو موجود ہے' حاضر ہے۔ اپنی ضرورت کے مطابق نکال لو۔ اگر یہ کم ہے تو کل جہاں کہو گی' پہنچا دوں گا---"

نگہت نے چند لمحے اسے گھورا' پھر پرس کھولا اور ایک ہزار روپے علیحدہ کر لئے۔

"سب رکھ لو' کام آئیں گے---" وہ مسلسل اس کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے بولا۔ کوئی جواب دینے کے بجائے نگہت نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ہونٹوں سے لگانا چاہا۔ شوکت نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی اور ساتھ ہی اس کا دایاں آزاد ہاتھ پوری قوت سے نگہت کے بائیں گال سے ٹکرایا' مہین سی چیخ ابھری' اگلے ہی لمحے شوکت جا چکا تھا۔

ذرا دور ایک جھاڑی کی اوٹ میں بیٹھے ہوئے تین اوباش جو شاید انہی کی تاک اور تاڑ میں

کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھے' پلک جھپکتے ہی نگہت کے پاس پہنچ گئے۔ نشے کی ترنگ اور بھرپور مردانہ تھپڑ سے حواس باختہ وہ ادھ موئی سی پڑی تھی۔ بٹوا' پرس اور اس پاپ گھڑی کو ڈنڈا ڈولی کرتے ہوئے وہ ٹیلے کی دوسری جانب' پرانے ٹیوب ویل کی شکستہ کوٹھڑی میں اتر گئے۔ اس قسم کے اوباش لفنگے اکثر ایسی تفریح گاہوں اور سیر سپاٹے کی جگہوں پہ "نووارد ان محبت" اور نئے نئے شادی شدہ جوڑوں کی کھوج میں چھپے ہوتے ہیں' موقع پاتے ہی یہ انہیں دبوچ لیتے ہیں اور ڈرا دھمکا' تھانہ پولیس' عزت بے عزتی' ہر حربہ استعمال کر کے لوٹ لیتے ہیں۔ گھڑیاں' زیور' کپڑے تک اتار کر رفو چکر ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ اکیلی دوکیلی کی عزت خراب کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔۔۔

نگہت کا پالا بھی ایسے ہی درندوں سے پڑا تھا۔ نشے میں تو وہ پہلے ہی بے دم تھی' اچانک تھپڑ نے اسے مزید بے جان سا کر دیا ہوا تھا۔ وہ اپنی مدافعت کیا کرتی اور کچھ زر تو پلے تھا نہیں جو لٹا بیٹھتی۔ شوکت کا پرس جو وہ وہاں چھوڑ گیا تھا' اس پہ لٹیروں نے قبضہ کیا۔ اس کے اپنے پرس میں سے جو کچھ برآمد ہوا' وہ اس کی شناخت کے لئے کافی تھا۔ وہ جان گئے کہ یہ ہیروئن کی عادی اور جسم بیچنے والی لڑکی ہے جبکہ وہ خود بھی منشیات کے عادی تھے۔ پہلے تو خود انہوں نے موج میلہ کیا پھر کئی اور بھی ان جیسے شامل ہو گئے۔ منشیات کے انجکشن' سگریٹ' شراب' خود بھی اور اسے بھی زبردستی استعمال کراتے رہے۔ ایک لڑکی' کئی درندے اور ساری رات۔۔۔ کوئی جا رہا ہے' کوئی آ رہا ہے۔ جو شراب پی رہا ہے' اس کے حلق میں بھی زبردستی انڈیل رہا ہے۔ جو انجکشن لے رہا ہے' اسے بھی ٹھونک رہا ہے۔ رات شرمندہ سی' خجل سی تاریکی سے اپنا منہ ڈھانپے کن آنکھیوں سے وحشت' شیطنت اور بربریت سے بھرپور یہ دل خراش تماشہ دیکھتے دیکھتے کہیں سو' مر گئی اور صبح کا اجالا آنکھیں ملتے ملتے بیدار ہوا۔ ٹیوب ویل کی ناکارہ مشینری کے پاس نگہت کا ادھڑا ہوا وجود بکھرا پڑا تھا۔ انجکشنوں کی سرنجیں' خالی بوتلیں' سگریٹوں کے ٹوٹے اور انسانی غلاظت کا ڈھیر رات گئی' بات گئی کی داستان سنا رہا تھا۔۔۔ الگ تھلگ جگہ تھی' سیر تفریح کرنے والے ادھر کا رخ نہیں کرتے تھے۔ دوپہر تک وہیں کروٹ لئے بغیر بے سدھ' بے جان پڑی رہی۔ کہیں سے بدبو سونگھتے ایک مریل سی کتیا اندر آ گئی اور اس کا غلاظت سے لتھڑا ہوا پنڈا چاٹنے لگی۔

ہلکی سی حرکت ہوئی' سوجی ہوئی سرخ انگارہ آنکھیں پل کی پل کھلیں اور پھر بند ہو گئیں۔ حواس کہیں بیدار ہو چکے تھے' آہ کرتے ہوئے کروٹ بدلی۔ کتیا نہ جانے کیا سوچ کر ہلکا سا بھونکی۔ اب نگہت بھی ہلکا سا سنبھالا لے چکی تھی' کراہتے ہوئے اٹھی' دونوں ہتھیلیوں سے



سر تھامے گردوپیش کا جائزہ لینے لگی۔ سورج سر پہ آ گیا تھا' دھندلی دھندلی سی یادداشت صاف ہونے لگی۔ اچانک کوندا لپکا اور بیمار ماں یاد آ گئی جس کی دوا کا بندوبست کرنے وہ گھر سے نکلی تھی' بہنیں یاد آئیں تو آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔۔۔ شوکت یاد آ گیا' گزرے ہوئے لمحے پل پل ابھرتے چلے گئے۔ دھندلے دھندلے مکروہ چہرے۔۔۔ اٹھنے کی کوشش میں پیٹ نیچے ایسی ٹیس اٹھی کہ دوہری ہو کر پانی کی مردہ بیکار موٹر پر گر پڑی۔ پھر ہوش اس وقت آیا جب سورج آدھے سے زیادہ سفر طے کر چکا تھا۔ کپڑے درست کئے' باہر نکلی' جھیل کے پانی سے ہاتھ منہ پاؤں دھوئے' بال ٹھکانے کئے۔ نیم غنودگی کے عالم میں ہچکولے کھاتی ہوئی سڑک کے کنارے کھڑی تھی جدھر سے اسے ٹیکسی ڈرائیور استاد قربان نے اٹھایا تھا۔

☆☆☆

یوں سمجھئے' مس عاشی نے نگہت کو حکیم جمالی اینڈ پارٹی سے کوئلوں کے مول خریدا تھا' یعنی صرف بیس ہزار۔۔۔ مس عاشی اس سے زیادہ قیمت بھی دے سکتی تھی اگر یہ صاف رنگت اور خوبصورت سے خدوخال کی حامل ہوتی' جوان اور تندرست ضرور تھی مگر چہرہ مہرہ جاذب نظر نہ تھا۔ الھڑ مٹیاروں جیسی نزاکت اور زیبائی نہیں تھی۔ ناک کے نیچے مونچھیں ہوں اور سر کے بال ترشوا دیئے جائیں تو بالکل لڑکا لگے۔ پھر بھی اسے امید اور اندازہ تھا کہ ٹھیک ٹھاک کر کے ستر' اسی ہزار میں کہیں نہ کہیں لونڈیا نکال دے گی یا اس کا ناک نقشہ درست کر کے اپنی چنڈال چوکڑی کا مہرہ بنا لے گی۔

نگہت جب سے یہاں لائی گئی' مسلسل غنودگی اور بے حسی کے عالم میں تھی۔ حکیم جمالی نے مس عاشی کے ساتھ روانہ کرتے وقت احتیاطاً اسے ایک انجکشن لگا دیا تھا اور ایک خاص دوا بھی ترکیب استعمال کے ساتھ سمجھا کر دی تھی اور بتا دیا تھا کہ اس کے استعمال سے انسان بظاہر ٹھیک ٹھاک نارمل نظر آتا ہے' کھاتا پیتا اور سوتا جاگتا ہے مگر کوئی فیصلہ کرنے' ماضی حال مستقبل کے بارے میں سوچنے جاننے یا کوئی رائے قائم کرنے کی صلاحیت سے عاری ہو جاتا ہے' انتہائی ڈرا ڈرا اور بزدل رہتا ہے۔ مہربانی' شفقت اور دم دلاسے سے خوش۔۔۔ یعنی وہ روبوٹ بن کر اپنے ماسٹر کا مطیع رہتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ وہ اس دوا کا عادی ہو جاتا ہے اور دوا نہ ملنے پہ اس کی طبیعت بھاری ہو کر جی متلانے اور دم گھٹنے لگتا ہے۔ مس عاشی نے یہ دوا لے تو لی مگر ابھی اس کا استعمال کرانا مناسب نہ سمجھا۔ جیسی بھی تھی' تھی تو عورت ذات! اس کے پتھر دل میں ابھی تک کہیں نہ کہیں اپنی جنس کے لئے کوئی نرم گوشہ ضرور موجود تھا۔ وہ نگہت کے ہوش و حواس میں آنے کا انتظار کر رہی تھی اور اس کا ردعمل جاننا چاہتی تھی۔ اس کا بیک

گراؤنڈ' اچھائی برائی' خیالات حالات' کچھ بھی تو وہ نہیں جانتی تھی اور نہ ہی حکیم جمالی استاد قربان ٹیکسی والا کچھ جانتے تھے۔ رہائش' پتہ' ماں' باپ' نام اور نہ ہی اس کے پاس ڈائری' شناختی کارڈ تھا۔ پرس تھا مگر خالی--- تین روز سے وہ دفتری اوقات کے علاوہ' اس پلنگ کی پٹی سے لگی بیٹھی تھی۔ سوپ' جوس' دلیا' اپنے ہاتھوں سے اس کے حلق میں ڈال ایسی بے ہوشی اور گہری نیند؟--- جب کبھی آنکھیں کھولتی بھی تو یوں لگتا جیسے کسی نا خوفناک ہستی کو دیکھ رہی ہو۔ وہ گھبرائے ہوئے انداز میں پھر آنکھیں بند کرلیتی' جھنجھوڑ جگانے سے فقط "ہوں' ہاں" تک ہی رہتی۔ کروٹ بدلوانے پہ وہ سخت اذیت کا اظہار کر لباس تبدیل کرواتے وقت مس عاشی نے اس کے جسم کی حالت دیکھ لی تھی' جنسی تشدد واضح نشان موجود تھے۔ حکیم جمالی نے بتادیا تھا کہ اس کے پاس پہنچنے سے پیشتر یہ لڑکی بہت مردوں سے خراب ہو چکی تھی لیکن اسے یہ بتانے کی چنداں ضرورت پیش نہ آئی کہ یہ اسے کے ڈیرے پہ کتنے درندوں کی درندگی کا نشانہ بنی تھی۔

مس عاشی کے لئے یہ سب کچھ روزمرہ کا معمول تھا' ان درندوں اور اس لومڑی صرف جنس کا فرق تھا۔ یہ ایک ہی ہوس ناک' خون آشام جرائم پیشہ درندوں کا گروہ تھا۔ کوئی بھی کرے' کھائیں گے سب اکٹھے اور ان کی بقا اسی اصول پہ کاربند رہنے میں تھی--

دوپہر سے ذرا پہلے' نگہت نے ہلکی سی حرکت کی' چھوٹی سی انگڑائی توڑی اور آنکھیں پٹپٹائیں۔ مس عاشی نے جھٹ سے اسے گود میں بھرلیا اور پولے پولے ہاتھوں اس دبانے لگی' گیلے تولئے سے اس کر گردن' چہرہ' سینہ صاف کیا۔ کمر کے پیچھے تکیئے جما کرا اور مسکراتے ہوئے چمچہ چمچہ مرغ کی نیم گرم یخنی اس کے حلق میں ٹپکانے لگی۔ پندرہ منٹ بعد نگہت قدرے عالم ہوش میں آئی' گو نقاہت اور غنودگی ابھی نہیں ٹوٹی تھی--- ماحول' انجانی صورت۔ وہ اجنبی نظروں سے مس عاشی اور کمرے کے درودیوار دیکھ رہی مس عاشی کمال محبت اور شفقت سے مسکراتے ہوئے پوچھنے لگی۔ "طبیعت کیسی ہے--

سوجے ہوئے کٹے پھٹے ہونٹوں پہ کپکپاہٹ سی پیدا ہوئی' مہین سی ڈوبی ہوئی آواز "جی--- میں کہاں ہوں--- " پھر عاشی کی جانب اجنبی نظروں سے تکتے ہوئے پوچھا۔ کون ہیں---؟"

مس عاشی نے بڑھ کر اس کی پیشانی کو بوسہ لیا اور شہد بھری مٹھاس سے بولی۔ "تم ہی گھر میں ہو اور میں تمہاری بڑی بہن ہوں--- زیادہ نہ بولو' میری جان! نہ ذہن پہ زور ابھی تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں---"



آہستہ آہستہ جیسے دھند صاف ہوتی جارہی تھی۔ تکیئے پہ سر ڈال کر' اس نے پھر آنکھیں موندھ لیں مگر یادداشت کی الجھی گرہیں جیسے دھیرے دھیرے کھُل رہی تھیں--- شوکت' چھپڑ--- ماں' بہن' دوائیں' بل--- لارنس گارڈن' ریس کورس پارک--- خوفناک چہرے۔ رات بھر کی اذیت' قہقہے' چیخیں' کتیا--- ایک ایک منظر' ایک ایک سلائیڈ کھٹ کھٹ گرنے لگی--- ٹیکسی' کھٹ سے دروازے کا بند ہونا اور پھر--- پھر یادداشت کا بند ہونا۔ حکیم جمالی کا دفتر' وہی بھیانک چہرے' وہی اذیت--- پھر یادداشت بند--- سوچتے سوچتے وہ پھر سو گئی یا نڈھال ہو گئی۔

آنکھ کھلی تو وہ پلنگ اور کمرے میں اکیلی تھی۔ سائیڈ ٹیبل پہ کھانے پینے کا سامان ڈھکا پڑا تھا' ہلکا سا میوزک چل رہا تھا۔ شاید شام کا وقت تھا' کھڑکیوں پہ پردے پڑے ہوئے تھے۔ ہلکی ہلکی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ پیاس سی محسوس ہوئی' تازہ مالٹوں کا رس' جگ میں پڑا تھا۔ کانپتے ہاتھوں سے گلاس بھرا' ہونٹوں سے لگایا۔ سگریٹ کے پیکٹ پہ نظر پڑی تو جسم میں اینٹھن سی ہونے لگی' یاد آیا کہ کئی روز سے سگریٹ نہیں پیا۔ پھر دو ہی کش لئے تھے کہ سر چکرانے لگا اور سگریٹ ایش ٹرے میں مسل دیا اور تبھی بغیر کسی آہٹ کے مس عاشی داخل ہوئی۔

"ماشاء اللہ---!" وہ اسے سگریٹ بجھاتے ہوئے دیکھ کر بولی۔ "بے بی! اب طبیعت کیسی ہے--- انٹرکام پڑا ہے' مجھے بلا لیا ہوتا---"

"شکریہ' باجی!--- مجھے باتھ روم جانا ہے---"

وہ اسے سہارا دیتے ہوئے باتھ روم تک لائی۔

"--- اچھی طرح شاور کرلو۔ شمپو' باتھ آئل' باتھ ببل' سوپ' ہر چیز اندر موجود ہے۔ میں اتنی دیر میں تمہارے کپڑے لاتی ہوں--- فریش ہو جاؤ' پھر اکٹھے مل کر کھانا کھائیں گے---"

اتنا شاندار باتھ روم؟--- وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ ہر چیز دیکھ رہی تھی۔ ہنس کے پروں جیسا سفید باتھ ٹب' سنہری ٹونٹیاں' شاور' میچنگ ٹوائلٹ سیٹ۔ اسی رنگ کے ٹوائلٹ پیپر رول' روئی کے بڑے بڑے خوشبودار تولیئے' مختلف پرفیوم' نئے پیک توتھ برش' ٹوتھ پیسٹ--- وہ ایک ایک چیز کو چھوتی' دیکھتی رہی خوبصورت شیشے کا کیبنٹ۔ شیشے میں اپنا حلیہ دیکھا تو احساس ہوا کہ وہ کتنی بدل گئی تھی۔ آنکھوں کے نیچے حلقے' ستا ستا سا چہرہ' اجڑے اجڑے بال--- پھر جونہی کیبنٹ کھولی تو حیران رہ گئی۔ امریکن' انگلش' فرنچ رسالے ایسے کہ دیکھتے ہوئے نظروں کو شرم آجائے--- دیکھتے دیکھتے اچانک کوئی بند گرہ کھلی اور وہ سوچنے لگی کہ وہ کن لوگوں میں

پھنس گئی ہے' یہ باجی کون ہے' اس کا کیا پیشہ ہے؟ اتنی خاطر مدارت' ہمدردی' یہ
شوکت ــــ آہستہ آہستہ سب گرہیں کھلتی گئیں۔ وہ جان گئی کہ وہ کس قماش کے لوگوں
پھنس چکی ہے۔ اس وقت وہ کہاں ہے' کس جگہ ہے' یہ لوگ اس سے کیا چاہتے ہیں
اسے کیا کرنا چاہیۓ؟ یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ عجلت میں اس نے فیصلہ کر
وہ ہر ممکن ان سے تعاون کرے گی' تاوقتیکہ وہ ان کے بارے میں سب کچھ جان نہ لے۔

عاشی نے اسے بڑے خوبصورت کپڑے پہنائے تھے۔ اپنے ہاتھوں سے بال سنوا
میک اپ کیا اور حد یہ کہ اپنے ہاتھوں سے جوتے تک پہنائے۔ پھر ڈائننگ ٹیبل پہ دونو
کھانا کھا رہی تھیں۔ بریانی' قورمہ' شامی کباب' سلاد' رائتہ' مس عاشی اصرار کر کے
ہاتھوں اسے چھوٹے چھوٹے لقمے کھلا رہی تھی اور ساتھ ساتھ پیار بھری نظروں سے
ہوۓ اس کی بلائیں بھی لیتی جا رہی تھی۔

"باجی! برا نہ مانیں تو ایک بات پوچھوں ــــ؟" نگہت نے جیسے ڈرتے ڈرتے سوال

"بسم اللہ' ہزار سوال پوچھو ــــ جو جی میں آۓ' بلا تکلف پوچھو ــــ"

"باجی! ــــ آپ میری باجی ہیں نا ــــ؟" اس کے سوال میں بلا کی معصومیت او
ساختگی تھی۔

"میری بنو! اس میں تمہیں کوئی شک نظر آتا ہے ــــ میں تمہاری بڑی آپا اور تم
پیاری سی' چاند سی چھوٹی بہنا ہو ــــ"

"باجی! میرا نام کیا ہے' مجھے کچھ یاد ہی نہیں آرہا ــــ"

مس عاشی اسے غور سے دیکھتے ہوۓ بولی۔ "تمہاری یادداشت ایک حادثے میں م
چکی ہے اس لئے تمہیں اپنا نام یاد نہیں' بہت جلد تم ٹھیک ہو جاؤ گی اور پھر تمہیں سب
آجاۓ گا ــــ تمہارا پیارا نام شمسہ ہے اور میرا نام باجی عاشی ہے ــــ"

مس عاشی گھبرا سی گئی تھی' اس کے اچانک اس سوال کے جواب کے لئے وہ تیار
تھی۔ ایک چھوٹا سا خدشہ بھی اس کے دل میں جڑ پکڑ کر بیٹھ گیا کہ کہیں اس کی یادداشت
نہ آجاۓ؟ اس کا پیشہ ہی ایسا تھا کہ خدشات پیدا ہی نہیں ہونے دیا جاتا تھا' ہر ممکنہ خد
سرکوبی کے لئے کئی کئی حل موجود ہوتے ہیں ــــ کھانے کے بعد اس نے حکیم جمالی کی
دوا کی ایک خوراک اسے پلاتے ہوۓ کہا۔ "یہ دوا پی کر کچھ دیر آرام کرو' آرام تمہار
بہت ضروری ہے۔ میں ہلکا سا میوزک لگا کر دروازہ باہر سے بند کر دیتی ہوں تاکہ تمہیں کو
آرام نہ کرے۔ کوئی ضرورت ہو تو انٹرکام پہ بتا دینا ــــ"



ڈیک کو آن کر کے' اس کا منہ چوم کر وہ چلی گئی اور نگہت کو پکا یقین ہو گیا کہ یہ عورت
یانی کلاس کی سپلائر ہے مگر دوا ــــ عجب سی دوا تھی جو حلق سے نیچے اترتے ہی آسمان کی
لے گئی۔ بادلوں سے بھی اوپر' کبوتر کی بغل کی نرم روئیں سے بھی ہلکی وہ نیلگوں
ن کی وسعتوں میں کہیں اڑی جا رہی تھی۔ عجیب سی کیفیت تھی جو احاطۂ ادراک سے ماورا
ــــ اس کا اپنا دل تو شائد دل ہی نہیں تھا' پتھر بھی نہیں تھا جو کچھ محسوس کر سکے اور تو اب
مقام سے بہت آگے نکل چکی تھی۔ خوف و ہراس' پریشانی' گھبراہٹ' عزت بے عزتی'
و حیا' احساس سود و زیاں اور ماضی' حال' مستقبل' سب کچھ بہت پیچھے رہ گیا تھا اور اگر تھی
ف ایک چبھن' کسک جو سوئی یا کانٹے کی نوک ٹوٹ جانے سے محسوس ہوتی ہے۔ دو چھوٹی
اور بیمار بے آسرا ماں! ان کا کیا ہو گا' کون انہیں سنبھالا دے گا ــــ اب وہ زمانے' وقت
الات کی تند و سرکش آبشار میں ٹوٹی ہوئی ٹہنی کی مانند تھی جس کی منزل کا اختیار' اس کے
یں نہیں ہوتا۔ اب بہاؤ کی لپٹ جھپٹ نے اسے ایک دلدل میں لا پھینکا تھا اور پھائی سے
کر پنجرے میں پھنس جاۓ تو پرندے کے لئے کیا فرق پڑتا ہے۔ اب یہاں اسے اس
ت کا ادراک بھی ہو چکا تھا کہ جو کچھ وہ باہر بے قاعدگی سے کرتی رہی ہے' یہاں اسے وہ
کچھ اب باقاعدگی سے کرنا پڑے گا جس کے لئے وہ ذہنی طور پر تیار تھی۔

مس عاشی کو سمجھنے میں اس نے غلطی نہیں کی تھی' جاننے کے لئے اگر کچھ باقی تھا تو وہ یہ
وہ کس جگہ ہے۔ کسی کوٹھے پہ ہے یا شریفوں کی کسی بستی میں' مس عاشی کون ہے۔
ف' کال گرل' بردہ فروش یا ڈیرہ دار؟ ــــ مس عاشی سے اپنا نام دریافت کرنا اس کی
ت کی کمزوری نہیں تھی' اس کی مصلحت کا حصہ تھا۔ وہ صحیح سلامت سامنے آکر اس
جان نہیں چھڑا سکتی تھی۔ وہ اس کا اعتماد حاصل کر کے کوئی راستہ نکال سکتی تھی' مقابلہ
ے نہیں ــــ کاش! وہ اپنی ماں اور بہنوں سے اگر مل نہیں سکتی تو کسی طرح کچھ رقم بھجوا
ــــ دوا کا اثر' کمزوری' الجھے ہوۓ خیالات ــــ ترس کھا کر نیند کی مہربان دیوی نے اس
نے نرم نرم پر پھیلا دیۓ۔

عامل ظہوری شاہ سے مس عاشی اکثر کاروباری معاملات یا کسی الجھن پریشانی میں مشورہ لیا
تھی جبکہ وہ اسے حمام میں سب سے زیادہ ننگا اور گندہ تھا۔ اس کے باوجود وہ اور بہت سے
والے اس کی روحانی علمیت' تجربے' پامسٹری' زائچہ سازی اور پیش گوئیوں کے معترف
لہ جہاں وہ اس کے صائب مشوروں سے بہت سے پیش آنے والے مصائب سے بچ نکلی
ہیں بے شمار فوائد بھی حاصل کر چکی تھی۔ وہ کہتی تھی کہ عامل ظہوری کے قبضے میں

جنات ہیں۔ ہمزاد' موکلات' حاضرات ہاتھ باندھے اس کے حکم کے منتظر رہتے ہیں۔

صبح دس بجے کے قریب اس نے عامل ظہوری سے ٹیلی فون پہ رابطہ کیا' تمام تفصیل کرتے ہوئے اس نئی لڑکی کے بارے میں مشورہ چاہا۔ ظہوری نے صاف صاف بتایا کہ یہ اس کے حق میں کچھ زیادہ سعد دکھائی نہیں دیتی البتہ کوشش' محنت کی جاسکتی ہے اور نفتی چانس ہے۔ اخلاق اور پیار' ہمدردی سے اس کا دل جیتنے کی کوشش کرے' اس ضمن میں تفصیلا "بات کرنے کا بہانہ کرکے اس نے ٹیلی فون بند کردیا۔ یہ حرفوں کا پتلا' دراصل اپنی و حرص کے ستاروں کی چال ٹھوک رہا تھا۔ حکیم جمالی کے ڈیرے پر اجتماعی زیادتی کے کے موقع پہ بہتی گنگا میں اس نے بھی اپنے گندے ہاتھ پوتر کیے تھے۔ چور' چوری سے جا مگر ہیرا پھیری سے نہیں اور یہ نجومی اور ہاتھ ریکھا دیکھنے والے بھی ایسے ہی ہوتے گدھی اور کتیا بھی سامنے آجائے تو اس کے کھر ریکھا' دم تھوتھن اور نسل نرودھ کی چنتا کریں گے۔ سعد' نحس ضرور نکالیں گے۔ بدکاری کے اس جلسے میں' اس بدکار مکار حسب عادت' بیہوش و بے دم شمسہ کے ماتھے اور پاؤں کے تلووں پہ پڑی تھی۔ لک نسل کی یہ لڑکی ایک لمبے عرصے کے بعد اسے دکھائی دی تھی۔ ایسی نسل اور ستارے کی بڑی سعد اور بھاگوان ہوتی ہے اور جو اپرادھی اس سے انیائے کرے اس کا انت بھرشٹ ہے۔ اس کا دل چاہا کہ وہ سب سے کہے کہ اسے چھوڑ دو' اس کا اپمان نہ کرو ورنہ جاؤ گے۔ یہ تم سب کو لے ڈوبے گی مگر وہاں کون سنتا تھا۔ شیطان اور شراب سر چڑھے بربادی کا باعث بنے بغیر نہیں ٹلتے۔ اس نے خود بھی بچنا چاہا مگر چار یاری اور شراب نشے باری میں نہ چاہتے ہوئے بھی بھیگ گیا۔ اس کا مکروہ علم اسے بتا رہا تھا کہ یہ لڑکی جس سنگ گی' اسے "لکشمی رام" بنا دے گی۔ اس کے دل میں تھی کہ وہ ہر صورت اس لڑکی عاشی سے حاصل کرے گا۔ وہ چانس پہ تھا' ایسے حالات پیدا کرنا چاہتا تھا کہ عاشی خود ہی اس کے حوالے کردے۔ اسے یقین تھا کہ مس عاشی اس کے سلسلے میں اس سے ضرو لے گی اور اس نے آج اسے نجس بتا کر اپنے منصوبے کی پہلی منزل مار لی تھی —— و اسے ستاروں کی چال' رخ بدلنے میں کمال مہارت حاصل تھی۔ اس کی زندہ مثال اس زندگی تھی۔ اس نے اپنا نام اور کام تبدیل کرلیا۔ ذات' پیشہ' شہر' شخصیت اور حلیہ تک کچھ بدل لیا۔ دو چار رازداروں کے علاوہ شاید ہی کوئی اس کے ماضی کے بارے میں ہو۔

آدھ انچ کم چھ فٹ قد' چھریرا بدن' موٹی کھڑی گردن پہ مضبوط نمایاں جبڑا' موٹے



ے پیچھے چوڑے سپید دانت' قدرتی سرمئی غلافی آنکھیں' چہرے پہ نفیس تراشی ہوئی باہ داڑھی' سر سے کندھے تک لہراتی ہوئی عنبریں زلفیں' آنکھیں بولتا جادو' زبان و بیاں کا تلا اور کھنک دار پُر اثر لہجہ۔ دسویں فیل' منڈی بہاؤالدین کے نواح کا رہنے والا' ذات کا اہا' باپ سے تعویذ گنڈے' نقش باندھنے سیکھے۔ قرآن شریف' تسبیح دانے سے فال لینا کھا۔ پھر لوٹے گھمانے اور انگوٹھے پہ موکلات حاضر کرنے لگا۔

اس کے والد بھی چوکی حال کھلاتے اور جن پریت نکالتے تھے۔ قریب کے گاؤں کی ایک ں سال خوبصورت لڑکی کے عاشق جن سے ہاتھا پائی ہو گئی۔ جن بڑا اڑیل' زبردست قسم کا تھا ر عامل صاحب بھی کچھ کم نہ تھے۔ آکر جب گدی سے بال پکڑ کر سرخ مرچوں اور کالے تے زہریلا دھواں نتھنوں میں چڑھایا تو جن کو کھانستے اور بھاگتے ہی بنی لیکن جاتے جاتے بطور انی لڑکی کی منڈی مڑوڑ گیا —— جن نکالنا ان کا کام' جان نکالنا عزرائیل کا کام تو عامل کا کیا مور؟ مگر ان کی یہ دلیل مرنے والی کے بھائی جو فوج میں ملازم تھا' کی سمجھ میں نہ آئی۔ وہ ایک ات چپکے سے ان کے حجرے میں داخل ہوا اور الٹے ہاتھ کے ایک بھرپور بے آواز وار نے میں زندگی سے بے دخل کردیا۔ گو یہ واردات بھی اس کینہ توز کمینے جن کے انتقامی کھاتے ب ڈال دی گئی لیکن کسی نہ کسی طرح ظہور علی المعروف ظہوری شاہ کو معلوم ہو گیا کہ اس کے پ کو لڑکی کے بھائی نے قتل کیا ہے۔ اس نے واویلا کیا' تھانے جانے کا ارادہ کیا۔ ایک رات ی بھائی اس کے پاس آیا' اس کو پکڑ کر زمین پہ اوندھا کیا اور گردن پہ بھاری پاؤں رکھتے ہوئے لا۔

"تمہارے باپ نے میری بہن کو تشدد سے ہلاک کیا تھا لیکن میں نے تمہارے مردود باپ داتنے پیار سے جہنم واصل کیا کہ اسے مرنے کا احساس تک نہیں ہوا۔ جان کے بدلے جان' ملہ میں نے اپنے اصولوں کے مطابق کردیا ہے۔ اب میں نے سنا ہے' تم تھانے کچہری کی ہمکی دے رہے ہو۔ چاہوں تو ابھی تمہارا حشر بھی باپ جیسا کر سکتا ہوں۔ تم بے وقوف اور بے قصور ہو' تمہاری جوانی اور نادانی پر رحم آتا ہے۔ زبان' طبیعت اور جذبات پہ کنٹرول رو —— اسی وقت' ابھی گاؤں چھوڑ کر کہیں دور شکل گم کرلو' آج کے بعد تمہاری زبان کھلی یا ل نظر آئی تو منڈی مڑوڑ دوں گا۔"

اپنی جان بچا کر اسی رات وہ خاموشی سے اپنے باپ کے ایک پیر بھائی کے پاس کراچی نکل یلا۔ یہ حضرت بھی تعویذ گنڈوں اور جن بھوتوں کا کاروبار کرتے تھے۔ منگھو پیر مزار کے قریب ب مسجد میں پیش امام بھی تھے۔ مرنجان مرنج سے عمر رسیدہ بزرگ تھے۔ سارا حال ان کے

رُوبرو بیان کیا' سرپرستی اور شاگردی کے لئے درخواست کی جو قبول ہو گئی۔ باپ کے ترکے میں چھوڑی ہوئی چیدہ چیدہ چند کتابیں' زائچوں کے نقشے' تعویزات کے قلمی نسخے' سوالکھ تسبیح اور سبز عمامہ وہ ساتھ لے کر آیا تھا۔ اگلے دو برس بڑی سعادت مندی' محنت اور ذوق و شوق سے وہ علومِ خفی' نوری' سفلی سیکھتا رہا۔ عملیات' تسخیرات' حاضرات' موکلات میں بھی خاصہ درک حاصل کرلیا۔ منگھوپیر کی ویران پہاڑیوں میں چلے اور مجاہدے بھی کئے۔ اک حلقہ معتقداں بھی پیدا ہو گیا تھا۔ بزرگ استاد نے بھی جی جاں سے اپنا سینہ اس پہ کھول دیا تھا۔

وقت نے ایک کروٹ بدلی' وہاں لسانی فسادات شروع ہو گئے۔ اکا دکا قتل ہوئے تو یہ سلسلہ چل نکلا۔ مسجدیں' گوٹھیں' علاقے' محلے' نسل' قومیت' زباں اور علاقائی تعصب کے خانوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک بلوے میں اس کے استاد مارے گئے تو چند روز بعد یہ اپنا اور ان کا سب کچھ سمیٹ سماٹ کر لاہور آگیا اور یہاں جو پہنچتا ہے' داتا سرکارؒ سلام کے لئے ضرور حاضر ہوتا ہے۔ جن کا مسلک حاضر ہونے میں مانع ہوتا ہے' کبھی نہ کبھی ادھر سے گزرتے ہوئے وہ نہ سہی' لیکن ان کا دل اور جھکی ہوئی نگاہیں ضرور سلام کرتی ہیں۔ جس کے پاس کھانے رہنے کا کوئی آسرا نہ ہو وہ داتا ہی کے مہمان ہوتے ہیں۔ داتا سرکارؒ بلا تخصیص تفریق' نسل و رنگ سب کی دلجوئی اور خاطرمدارت کرتے ہیں۔ ان کے دامن عافیت میں بڑی کشادگی ہے۔ اپنے قدموں میں حاضر ہونے والوں کا ماتھا چومتے ہیں اور یہ تو پانے والے کے ظرف اور نیت و عمل پر منحصر ہے کہ وہ کتنا فیض یاب ہوتا ہے۔ یہ بھی ناک کی سیدھ میں سرکارؒ کے قدموں میں حاضر ہو گیا۔ ایک آدھ روز لنگر' مسجد پہ گزارہ کیا' آرام تسلی کی پھر باہر آیا تو ہر چیز بدلی بدلی سی نظر آئی۔ سامنے کا میدان اب پلازہ میں تبدیل ہو رہا تھا۔ بازار' دکانیں' اردگرد بڑے بڑے ہوٹل' وہی گہما گہمی۔ دیگوں والے اور بھیک مانگنے والے' بھاٹی چوک کی وہی رونق' لوگوں کا ہجوم' ٹریفک۔۔۔ بھاٹی کے گندے نالے کے پاس ایک نمایاں بڑے بورڈ پہ نظر پڑی' ایک نورانی صورت والے باریش بزرگ کی تصویر تھی۔ اسے اپنا باپ یاد آگیا' وہ بھی جوانی میں ایسا ہی تھا۔ کافی دیر وہ کھڑا بورڈ کو دیکھتا رہا۔ بورڈ پہ لکھے ہوئے نمایاں الفاظ تھے۔۔۔

”جادو شکن' عملیات کے ماہر۔ ایک ہی رات کے عمل سے بگڑے مسئلے سنوارنے کے دعوے دار' کایا پلٹ۔ روٹھے ہوئے محبوب کو قدموں میں لا بٹھانے والے بابا“۔۔۔ پردہ ہٹا کر وہ اندر داخل ہوا' باہر کے بورڈ کی تصویر سے بہت ہی مختلف ایک تجل سی صورت والے مریل سے بابا فرشی نشست پہ تشریف فرما تھے۔ گوٹے کے ستاروں والی سبز چادر' سیاہ مخملی چھار



ٹوپی جس پہ نقرئی تلّے سے ”یا العلم الغیب“ کڑھا ہوا تھا۔ خضاب آلود داڑھی اور بال گنجے سر کے گرد ایک جھالر کی صورت میں تھے۔ اگربتیوں کے دھوئیں سے اندر کی فضا خاصی مکدر اور گھٹن زدہ سی تھی۔۔۔ اتفاق سے عامل صاحب فارغ بیٹھے چائے نوش فرما رہے تھے۔

”آیئے آیئے' جھجکیئے مت۔۔۔ آپ صحیح جگہ پہ تشریف لائے ہیں۔۔۔“ اس کے بیٹھتے ہی وہ کپ میں چائے انڈیلنے لگے۔ ”لیجئے گرم گرم چائے۔۔۔“

ظہوری بھی اسی دھندے میں تھا' عامل لوگوں کی ذو معنی باتوں کو سمجھتا تھا۔ اس نے مختصر سا اپنا تعارف کرایا' باہمی بات چیت شروع ہوئی تو شیطان کی آنت کی طرح طویل ہوتی چلی گئی۔ ظہر کی اذان تک وہ اس طرح باہم شیر و شکر ہو چکے تھے جیسے مدت سے ان کے مابین رفاقت و شراکت کے تعلقات ہوں۔۔۔ وہ اب ان عامل صاحب کی معاونت اور مصاحبت میں آگیا تھا۔ یہاں اس نے وہ سب کچھ سیکھا' جانا جس سے وہ اب تک محروم رہا۔ چال ڈھال' گفتگو' نفسیات' جیب خالی کروانے کے حربے' زائچے تیار کرنا۔ آنے والے پہ اپنی بالادستی قائم رکھنا۔ ذو معنی جواب دینا جس سے کامیابی' ناکامی دونوں کے مطلب نکلتے ہوں۔ جاہل ہلڑبازوں سے نمٹنے کے ڈھنگ۔۔۔ اب شاید کچھ بھی باقی نہ رہا جس کو سیکھنے کی ضرورت محسوس ہوتی۔ استاد کی دعا' برکت اور اجازت سے یہ ملتان روڈ پہ ایک مارکیٹ کی پہلی منزل پہ دو کشادہ کمروں کے دفتر میں آگیا جس کے قریب ہی ایک پلازہ کے تیسرے فلور پہ مس عاشی کا خوش نصیب میرج بیورو تھا' قریب ڈیڑھ کلو میٹر پرے حکیم جمالی کا دفتر بھی اسی سڑک پر تھا۔ گویا یہ سارے چٹے بٹے ایک ہی حلقہ زنجیر کے سلسلے تھے۔

ظہوری شاہ نے پہلے اپنے دفتر کو بڑے جدید انداز میں آراستہ کیا' روایتی غریب عاملوں کے طور طریقوں سے ہٹ کر ایک پروقار سنجیدہ سا ماحول پیدا کیا۔ جاذب نظر فرنیچر' قالین' ریشمی پردے' ویٹنگ روم' سیکرٹری' جدید انداز کا ٹیلی فون' فرشی نشست کے بجائے خوبصورت میز' کرسیاں' صوفے' سائیڈ ٹیبل' دفتر کے باہر اردو انگلش میں خوبصورت بورڈ۔۔۔ عامل ایم اے ظہوری شاہ محبوبی' ماہر فلکیات۔۔۔ یہ ظہور کا نیا روپ تھا۔ اس دفتر میں آکر وہ اپنے نحس ستاروں کا رخ کامیابی اور خوش حالی کے برجوں کی جانب موڑ چکا تھا۔ دنیا جھکتی ہے' جھکانے والا چاہئے۔ دنیا الّو بنتی ہے' بنانے والا چاہئے۔ بڑے بڑے بیوقوف ابن بیوقوف' احمقوں کی جنت میں رہنے والے' جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھنے والے' ایک رات میں امیر کبیر بننے والے' خوبصورت امیر لڑکیوں کو محبت کے جال میں پھنسا کر اپنے قدموں میں جھکانے والے اور پرائز بانڈز کے انعاموں سے حج عمرے' من پسند شادیوں' موٹر گاڑیوں' موٹر

سائیکلوں کے متمنی لوگوں کی کمی نہیں۔ ان بد نصیبوں کو اپنی ان خواہشوں کے حصول کا طریقہ تعویذ گنڈوں اور الٹے سیدھے عملیات میں نظر آتا ہے' وہ سمجھتے ہیں کہ ان نا عاملوں کے پاس ہی ان کی ناآسودہ آرزوؤں اور محرومیوں کے زہر کا تریاق ہے۔ اگر ایسا پاکستان کا ہر عامل ڈیفنس اور گلبرگ کی کوٹھیوں میں بیٹھا ہوتا۔۔۔ بیوک' مرسیڈیز او رائس ان کے قدموں تلے ہوتیں۔ ایئرپورٹ پہ ان کے ہیلی کاپٹر اور جہاز کھڑے ہوتے تو خود ہی جہاز ہوتے ہیں۔ سگریٹوں کے ٹوٹے اور گھٹیا منشیات استعمال کرتے ہیں' کرا کوٹھڑیوں اور کبوتروں کے ڈربوں میں سڑتے رہتے ہیں۔ یہ ڈھنگ کا لقمہ تو کھا نہیں دوسروں کی کایا پلٹ کیا خاک کریں گے۔ ان کا سارا کھیل تماشا جاہل' ان پڑھ' عقل اندھوں' جنسی حرصی بیماروں اور کسی نہ کسی طرح راتوں رات لکھ پتی بننے کے خواہش ہمتوں' بے کرتوتوں کے لئے ہوتا ہے۔ مردوں سے کہیں زیادہ عورتیں اپنے خاو ساسوں' نندوں اور سوکنوں کو راہ راست پہ لانے یا ٹھکانے لگانے کے لئے ایسے عاملوں کرتی نظر آتی ہیں۔ محبوب کو قدموں میں جھکانے والے' من پسند شادی جیسے حوصلہ اف پرکشش اشتہار پڑھ کر خود ان کے چنگل میں ایسی پھنستی ہیں کہ مال و زر کے علاوہ گوہر بھی لٹا بیٹھتی ہیں یا پھر زندگی بھر بلیک میل ہوتی رہتی ہیں۔

عامل ظہوری شاہ بھی ایسے ہی باکمال عاملوں کے درمیان ایک معتبر اور مشہور نام تھ کے مخصوص دوستوں کے علاوہ کوئی بھی اس کی گھناؤنی خصلت' گندی ذہنیت اور بد کر سے واقف نہ تھا۔ یہ سارے دوست ایک دوسرے کے کانے تھے۔ ایک جیسے' زانی' م کے عادی بلیک میلر' بردہ فروش۔۔۔ انہی صفات کی بنا پر ایک دوسرے کے قریب اور ن و پیالہ تھے' ہر شب یہ لوگ کسی نہ کسی کے ہاں شغل میلے کے لئے اکٹھے ہو جاتے۔

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری جانب مس عاشی تھی جو اسے آج رات اپنے دفتر لڑکی یعنی شمسہ کے بارے میں مشورے کے لئے بلا رہی تھی۔ عامل ظہوری نے رات پہنچنے کی بجائے اسے رات اپنے ہاں آنے پہ اصرار کیا۔

"کوئی خاص وجہ۔۔۔؟" مس عاشی نے پوچھا۔

"آؤ گی تو جان جاؤ گی۔۔۔ ہلکا سا اشارہ دیتا ہوں' تمہیں ایک نادر سی چیز دکھ ہوں۔۔۔"

اس نے لفظ "نادر" پہ زور دیا۔ مس عاشی نے لمبی سی ہوں کی اور بولی۔

"ٹھیک۔۔۔ میں حاضر ہو جاؤں گی۔۔۔"



عامل ظہوری کا دفتر جس مارکیٹ میں تھا۔ تین منزلہ اس عمارت میں سولہ دوکانیں گراؤنڈ فلور پہ تھیں۔ دوسرے اور تیسرے فلور پہ آٹھ فلیٹ تھے۔ جن میں کچھ تو کرائے داروں نے اپنی ضرورت کے مطابق دفتروں میں تبدیل کر لئے تھے' باقی میں رہائش تھی۔

مارکیٹ کے مالک حاجی عنایت اللہ کے اکلوتے بیٹے شایان سے اس کی ملاقات اور تعلقات اسی دفتر کے سلسلے میں ہوئے تھے۔ لاہور میں وہ پرائیویٹ پڑھتا بھی تھا۔ بلڈنگ کی دیکھ بھال' معاملات اور کرائے کی وصولی بھی وہی کرتا تھا۔ دو گھریلو ملازموں کے ساتھ سب سے اوپر والے فلیٹ میں رہتا تھا۔ سترہ اٹھارہ کا سن' پانچ بہنوں کا اکلوتا لاڈلا بھائی تھا۔ بچپن کا زیادہ حصہ' بہنوں اور لڑکیوں سے کھیلتے کھیلتے گزارا۔ کھلی صاف و شفاف رنگت' نیلم کے نگینوں ایسے نیلگوں نین' کھڑا ناک' چھوٹا سا دہانہ' نازک نازک ترشے ہوئے سرخ سرخ ہونٹ' چھریرا بدن' سنہری بال' گھر بھر کا دلارا اکلوتا ہونے کی وجہ سے انتہائی نگہداشت میں رہا اور گھر سے باہر نکلنے نہ دیا گیا۔ مدرسے مسجد بھی نہ بھیجا' معلم ماسٹر گھر پہ پڑھانے لگے۔ گلی ڈنڈا نہ کبڈی کھیلی' فٹ بال نہ کرکٹ۔ گلی محلے کے لڑکوں سے لڑا نہ دوستی بڑھائی۔ گھر' ماں باپ' بہنیں اور صحن' کوٹھا' دالان۔ بہنیں اٹھائے اٹھائے پھرتیں' اپنے ساتھ اس کی کنگھی پٹی بھی کرتیں۔ رنگ دار شوخ کپڑے' گڈی گڈا کے بیاہ' گھر گھر کھیلتے' نرگسی انداز جو در آئے تو نزاکت اور نفاست بھی آ گئی' چال اور بات چیت میں لڑکیوں جیسا انداز آ گیا اور پہناوا بھی لڑکیوں کا پسند آنے لگا۔ ماں باپ' بہنوں نے لاڈ پیار میں اس کے بدلتے ہوئے رجحانات پہ کوئی خاص توجہ نہ دی۔ اسی لولا پوپلی میں وقت آگے سرکتا رہا اور وہ وقت بھی آن لگا جب لڑکے بالے چہرے پہ استرا پھروانا شروع کر دیتے ہیں لیکن اس کے مخملی چہرے پہ ابھی تک سبز نازک روئیں اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ اس کے ساتھ ایک ستم یہ بھی ہوا تھا کہ بچپن میں گھر کے کنوئیں کی منڈیر پہ ننگے نہاتے ہوئے اس کی میمی پہ پیلے بھڑنے ڈنک مار دیا۔ لوہا گھسا' ننگچر

لگایا۔ ٹونے ٹوٹکے کئے مگر آرام نہ آیا۔ دو روز بعد ڈنگ والی جگہ پہ جنگلی بیر جیسی گانٹھ سی ب
گئی' پیشاب کے اخراج میں دقت ہونے لگی۔ ڈاکٹروں کو دکھایا۔ انہوں نے بھی اپنا اپنا ع
آزمایا مگر معمولی زخم ایک مستقل گلٹی کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ ماں باپ کی سٹی گم ہو گ
اسے اٹھایا اور لاہور لے آئے۔ روپے پیسے کی کمی نہیں تھی اور اکلوتا بچہ! نئے سرے
علاج معالجہ شروع ہوا مگر مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ آپریشن کا آپشن بھی سامنے آیا' ا
بات پہ سب متفق تھے کہ ہر دو صورت میں یہ شادی کے قابل نہیں رہے گا۔ ایک بھلے ڈا
نے مشورہ دیا کہ ایک دو برس انتظار کر لو' شاید بہتری کی کوئی صورت نکل آئے۔ اب تک
علاج سے یہ ہوا کہ آسانی سے پیشاب خارج ہو جاتا تھا ورنہ یہ ہوتا کہ مثانے میں ٹیوب ڈا
دی جاتی جو مستقل عذاب تھا۔ باپ کو یہ مشورہ مناسب معلوم ہوا۔ اسے لاہور رکھنے کا فیصلہ
لیا گیا۔ یہ بلڈنگ خریدی گئی' دو گھریلو ملازم اور اپنا ذاتی منشی ساتھ کر دیئے جو اس کی اور بلڈنگ
کی دیکھ بھال کے لئے کافی تھے۔

لاہور آکر جیسے وہ جنت میں آگیا ہو۔ کہاں شیخوپورہ اور کہاں لاہور' شہر نگاراں! م
ٹھیلوں' جلسے جلوسوں' ہنگاموں اور زندگی کی رعنائیوں توانائیوں سے لبالب ہر دم جواں
زندہ باش لاہور' اسے یہاں رہنا بہت اچھا لگا--- اس کا ایک سگا ماموں بھی یہاں رہتا تھ
بجری' اینٹ' روڑی کا کاروبار کرتا تھا۔ سیمنٹ کی ایجنسی بھی لے رکھی تھی۔ پڑھا لکھا کاروبا
آدمی تھا۔ عرصہ دراز سے لاہور میں کاروبار کرنے سے اس کے گھر کا ماحول' طور طری
خیالات بڑا اچھا رخ اختیار کر گئے تھے یا کم از کم اپنی برادری اور رشتے داروں سے بہتر تھ
بچے بھی بڑے اچھے ماحول میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ اس کی اکلوتی بیٹی نین تارا ایک مق
کالج میں سیکنڈ ایئر کی سٹوڈنٹ تھی' شوخ و شنگ اور بڑی تیز طرار طبیعت والی' کہیں بچپن
اس کی نسبت شایان سے طے کر دی گئی تھی۔ اسے وہ پسند بھی کرتی تھی' شیخوپورہ جاتی تو
ضرور ملتی اور پہروں اس کے ساتھ باتیں کرتی۔ . . . اس کی دلداری کرتی رہتی۔ وہ اس
بیماری سے واقف تھی' اس کے باوجود بھی اس کی محبت کا دم بھرتی۔ وہ اس کا پھوپھی زاد
منگیتر تھا' خوبصورت شہزادہ سا--- وہ من ہی من میں مستقبل کے سہانے خواب بُنا کرتی۔
اس کی جمال پسند اور رومانی طبع کے عین مطابق تھا۔ عید' تہوار' سالگرہ پہ وہ اسے خوبصور
کارڈ بھیجنا نہ بھولتی۔ اس کے لاہور شفٹ ہونے سے وہ بہت خوش ہوئی۔ وہ بھی اکثر ما
کے گھر آجاتا۔ خوب باتیں ہوتیں' ویڈیو پہ فلمیں چلتیں اور کھاتے پیتے وقت رنگین تتلیو
مانند کہیں اڑ جاتا۔ مناسب موقع پہ وہ اسے اپنی پڑھائی جاری رکھنے کی تاکید کرتی رہتی۔ اس



خواہش تھی کہ شایان خوب پڑھے اس طرح وہ مصروف بھی رہے گا' اپنی محرومی کو بھی بھول سکے گا اور کل مستقبل بھی سنور جائے گا۔ ظاہر ہے' وہ اس کے مستقبل کے خواب کی ایک حسین تعبیر تھا--- مارکیٹ کے سب ہی لوگ شایان کی بہت عزت کرتے تھے۔ وہ بھی ان کے مسائل مشکلات میں دلچسپی لیتا' انہیں ہر ممکن سہولتیں بہم پہنچانے کی کوشش کرتا۔

منشی کرم الٰہی اور ملازموں کی مدد سے وہ اپنے کاروباری معاملات بڑی خوش اسلوبی سے سرانجام دے رہا تھا۔ عامل ظہوری سے شایان کی دلچسپی یا عقیدت کی وجہ اس کی مسحور کن شخصیت' پُراسرار علوم کا ماہر ہونا تھی اور ویسے بھی وہ لوگ جو کسی نہ کسی جذباتی' جسمانی یا روحانی وجوہ کی بنا پر غیر متوازن شخصیت کے حامل ہوتے ہیں وہ پیروں فقیروں' بابوں سائیوں وغیرہ سے بڑی عقیدت و دلچسپی رکھتے ہیں' وہ انہیں اپنا نجات دہندہ اور ملجا و ماوا سمجھتے ہیں۔ اسی وجہ سے اس نے شروع سے عامل ظہور شاہ کو کرائے اور سیکورٹی میں خاص رعائیت دی تھی۔ دفتر' آرائش اور ٹیلیفون کے سلسلے میں مالی معاونت بھی کی اور عامل ظہوری شاہ بھی خوب سمجھتا تھا کہ یہ سونے کے انڈے دینے والی مرغی سدا بہار ہے۔ وہ اس سے انڈے حاصل کرنا چاہتا تھا مگر دھیرے دھیرے' مکمل طور پر اس پہ قابو حاصل کر کے اور اس ضمن میں پورا پلان اس کے شیطانی دماغ میں محفوظ تھا۔ وہ ہر کام اپنے صحیح وقت پہ سرانجام دینے کا قائل تھا--- شایان اسے کوئی سپر آفاقی مخلوق تو سمجھتا ہی تھا' وہ محض شوقیہ طور پہ اس سے خفیہ علوم سیکھنے اور ان سے استفادہ کرنے کا بھی خواہش مند تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اکثر اوقات اس کے پاس اٹھنے بیٹھنے لگا۔

شایان کے ذاتی فلیٹ کے نیچے' استاد شفقت حسین شفو کی میوزک اکیڈمی تھی جہاں اکثر اوقات طبلے کھڑکتے اور گھنگھرو چھنکتے رہتے۔ پروفیشنل' نان پروفیشنل لڑکیاں' لڑکے یہاں گانا بجانا اور ناچ سیکھنے آتے تھے۔ تانوں' تھاپوں' گتوں' توڑوں اور گھنگھروں کی چھنا چھن کے آہنگ سے ماحول لرزتا رہتا۔ پچھلی کھڑکیوں سے چرسیلے دھوئیں سے بادل اوپر اٹھتے تو اس کی کھلی کھڑکیوں سے داخل ہو کر اسے بھی مخمور کر دیتے۔ کئی بار اس کا دل چاہا کہ نیچے جا کر وہ بھی پگ گھنگھرو ڈال لے اور ناچے' لہرائے' بل کھائے۔ رقص سیکھنے والے زیادہ تر لڑکے نیم مخنث' تیکھے تیکھے نین نقشوں والے' ادائیں' نخرے' عشوے دکھانے والے۔ وہ تھے ہی ایسے یا اس ماحول اور اس فن کا اثر کہ زنانہ پن ان کی ضرورت اور فطرت ثانیہ بن چکا تھا۔ ان کے استاد بھائی شمشاد بھی اسی قبیل سے تعلق رکھتے تھے۔

فنون لطیفہ میں رقص بڑی لطیف' حساس اور جمالیاتی نزاکتوں' لطافتوں اور اشاروں

کنائیوں' کیفیتوں کی مظہر صنف ہے۔ اسے سیکھنے کے لئے جہاں ریاضت' صبر اور ذوق و شوق کی ضرورت ہوتی ہے وہیں چھریرا بدن' مناسب و متوازن اعضا' بولتے ہوئے خدوخال' خاص سن و سال اور رنگ و رامش سے معمور ماحول بھی ضروری ہے۔

رقص کو اعضاء کی شاعری کہا گیا ہے' ہڈیوں سے گودا نکلوا کر ربڑ رکھوانا پڑتا ہے۔ پاؤں کی پب پور' پوریوں پہ رکھیں تو وہ نہ ٹوٹیں۔ لبوں کی تھرتھراہٹ' انکھڑیوں کی جنبش و تاثرات اعضاء کی حرکات و سکنات سے مافی الضمیر بیان کرنا پڑتا ہے۔ انگ انگ انگڑائیاں' روم روم ردھم' یہ خالص نسائی' نرگسی' جمالی اظہارِ دلداری کا فن ہے۔ جنسِ ثقیل اپنی اعضائی عصبیت اور جبلی کثافت کی مجبوری کی بنا پر بھرپور توجہ اور پذیرائی حاصل نہیں کر سکی۔ گو اس فن کے ماہرین اور اساتذہ میں بڑے بڑے گرانڈیل شہرت یافتہ مردوں کے نام موجود ہیں مگر ماننا پڑے گا کہ یہ خالص نسائی سلسلۂ فن ہے۔ جنگل میں مور ناچا' کس نے دیکھا۔ مور میں لاکھ وجاہت خوبصورتی و خوش رنگی ہو اور ناچنے میں وہ کیسا ہی طاق و طرار ہو مگر اس کے نمایاں عیب اس کا نر ہونا اور بھدے پاؤں ہیں۔ رادھا ہی ناچتے ہوئے بھلی لگتی ہے اور یہ بات مردوں سے زیادہ زنانے بہتر سمجھتے ہیں اسی لئے وہ زنانہ روپ دھارتے ہیں۔ میک اپ اور مصنوعی بالوں کی وگ استعمال کرتے ہیں۔ ٹنڈا کرا' شیو بڑھا' مردانہ لباس پہن کر اگر ناچنا شروع کر دیں تو لوگ تھوکیں گے بھی نہیں۔ مرد یا نیم مرد' جب اس فن کو سیکھنے کی منزل میں ہوتا ہے تو دھیرے دھیرے اس کی مردانہ شناخت شانت پڑنا شروع ہو جاتی ہے اور پھر یہ ماحول! ہی ایسا ہوتا ہے کہ اچھا خاصا بال بچے دار مرد اگر ادھر محض بیٹھنا اٹھنا ہی شروع کر دے تو چند ہی روز میں اس کی مردانہ غدودیں سکڑ کر تباہ ہو جاتی ہیں اور یہ پھر آہستہ آہستہ "مؤرت" کی صورت میں بدلنا شروع ہو جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ وہ زنخا اور سانپ ہی کیا جو سیدھا چلے--- غدودوں کی ردو ریخت کا پہلا ردعمل چال اور اعضائے متحرکہ کے نچانے لہرانے اور تالی تپانے سے ظاہر ہوتا ہے۔

شایان پہ بھی یہ ماحول اثر انداز ہونے لگا۔ آتے جاتے ان لوگوں سے مڈبھیڑ ہو جایا کرتی تھی۔ ان کی چھت' اس کا فرش تھا اور پھر طبلہ ڈھولک اور شہنائی' وائلن' بانسری تو ایسے ساز ہیں جو سات پردے ڈھکے بجیں تو کن رسیئے' کان دھر لیتے ہیں۔ یہاں صرف چار پانچ انچ کا پردہ تھا۔ پہلے پہل کچھ الجھن ہوئی جو آہستہ آہستہ خوش آہنگی اور لطف و کیف میں بدل گئی۔ ہلکا سا آنا جانا شروع ہوا۔ اس کا نازک خوبصورت وجود' ناز و ادا اور زنانہ پن بھلا ان کی زمانہ اور زنانہ شناس نگاہوں سے کیسے چھپا رہ سکتا تھا۔



اس روز بھی نیچے حسب معمول ساز و سنگیت کا سلسلہ جاری تھا جس کا وہ اب عادی ہو چکا تھا مگر آج کچھ زیادہ ہی شور و غلغلہ بپا تھا، ٹوہ لینے کی خاطر وہ نیچے اتر آیا--- بڑے کمرے میں آرائش و صفائی کا آج کچھ خاص اہتمام تھا، کچھ آسودہ حال سے نئے چہرے بھی بیٹھے تھے۔ مسند خاص پہ بھائی شمشاد کے ساتھ ان کے پیر بھائی حاجی رجی بیگم بھی بڑے ٹھار ٹھسے سے نیم دراز تھے۔ طبلے پہ اکیڈمی کے ہیڈ طبلچی ماسٹر رؤف نیا جوڑا، تازہ شیو کیے تڑک دھم، تڑک دھام، فرما رہے تھے اور فربہ اندام سی خوبصورت لڑکی گھنگھرو باندھے، پیر سیدھے کر رہی تھی۔ گردن، ماتھے پہ پسینے کی ابرک چمک رہی تھی۔ بھائی شمشاد کی گردن، چنے ہوئے ابرو اور مسند کے ہتھے پہ دھری انگلیاں طبلے کی گت کے ساتھ ساتھ گویا رقص کر رہی تھیں جبکہ حاجی رجی بیگم کے پاؤں پڑے پڑے جنبش لے رہے تھے۔ بھائی شمشاد کا شاگرد خاص فلموں میں نووارد لڑکی کو اس کے سرپرستوں کی موجودگی میں ریہرسل کروا رہا تھا۔ شاگرد پیشہ مودب، باتمیز بیٹھے بڑے ڈسپلن کا مظاہرہ کر رہے تھے مگر جب شایان داخل ہوا تو آنکھوں کے شیشوں کو جیسے پسینہ آ گیا۔ غلمان صفت، شعلہ رو--- نگاہیں ہیبت جمال سے ترازو ہو گئیں اور ہنگامہ و آہنگ کو جیسے سکتہ نگل گیا۔ حاجی رجی بیگم کے سفید بالوں کی جڑوں کے خشک سوتوں میں تازہ خون ابل پڑا۔ ایسی مست خرامی جیسے کوئی آہو بچہ، انجانے میں کسی نخل ندا میں داخل ہوا ہو۔ ایسی چھب، ایسی دھج، کہ گریباں کی دھجیاں اڑا، ویرانوں کو نکل جائیں۔ اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی، وقت جیسے تھم گیا ہو--- پھر استاد شفو لپک کر آگے بڑھا، بڑے احترام سے ایک نمایاں جگہ بٹھانا چاہا مگر حاجی رجی بیگم نے ہاتھ کے اشارے سے پاس بلا کر اپنے دل کی جانب بائیں پہلو بٹھا لیا' سرک کر ماتھے پہ بوسے کی مُہر ثبت کی اور ہاتھ دہرے پلٹا کر بلائیں رد کیں--- "ماشاء اللہ! چشم بد دور" کہتے ہوئے زر بفت کے بٹوے کی طنابیں ڈھیلی کیں' ایک سو ایک روپیہ سر پہ سے وارتے ہوئے نابینے نعمت اللہ نال نواز کو بطور صدقہ عطا کر دیئے۔ یہ دونوں کی پہلی ملاقات تھی۔ اب کہاں کی محفل اور کدھر کی ریہرسل' سب کچھ پس منظر میں ڈوب گیا۔ رجی بیگم کے سامنے بس ایک ہی منظر تھا' ایک ہی چاند تھا جس کی ٹھنڈی کرنوں نے اس کے اندر کے سارے اندھیرے چشم زدن میں ختم کر دیئے تھے' اتنا اجالا' ایسی روشنی۔ ہزاروں قندیلیں' لاکھوں شمعیں اور کروڑوں فانوس ایک دم جگ مگ' جگمگا اٹھے ہوں۔

بوڑھا ہیجڑا ہو' بوڑھی طوائف یا کوئی بوڑھا دولت مند' ان کا عشق بڑا قیامت توڑ ہوتا ہے۔ جسم و جان کے فرسودہ اعضا' ایک جھٹکا برداشت نہ کر سکیں لیکن دل و نیت کی

حشر سامانیاں بڑی ولولہ خیز ہوتی ہیں۔ ان کے پوپلے منہ اور عشق اٹھانیں اور اظہار الفت کی تانیں اتنی پر شدت ہوتی ہیں کہ اچھے اچھے توانا عاشق شرمندہ ہو کر، داڑھی بڑھا کر نماز روزہ شروع کر دیتے ہیں--- سر یر سے سر یر جڑا ہوا تھا۔ اس کے تپتے ہوئے خیالات، جلتے ہوئے جسم کی حدت اور دھک دھک دھڑکتا دل۔

شایان کو کیا خبر ہوتی۔ وہ معصوم تو رقص کے توڑوں کی تکرار میں مگن تھا۔ لڑکی شاید بھاری پاؤں، وزنی گھنگھروؤں سے فرش کے لینٹر کی روڑی کوٹ رہی تھی۔ بار بار ایک ہی گت، ایک ہی توڑے کی تکرار--- مسلسل ناچتے ناچتے لڑکی کی فاضل چربی پسینے کی شکل میں جسم سے بہہ رہی تھی، بغلوں سے پرنالے چھٹے ہوئے تھے۔ اسے گھن سی محسوس ہوئی، وہ اٹھنے کی سوچ رہا تھا کہ محفل برخاست ہو گئی--- کچھ دیر بعد تنہائی میسر ہوئی تو استاد شفو نے باقاعدہ تعارف کرایا اور بات چیت کے دوران ہی حاجی رجی بیگم کے شک کو تقویت مل گئی کہ وہ اس کے کام کا بندہ ہے، کچی مورت ہے۔ رجحان اور میلان نرگسیت کی جانب ہے، یہ تو خیر پہلے ہی بتا بنایا تھا۔ رجی بیگم تو وہ جادوگر تھا کہ اگر پندرہ بچوں کے باپ کو پندرہ منٹ پاس بٹھالے تو جنم جنم کی مورت بنا دے۔

شایان جلدی اٹھ کر آیا، شام ظہوری شاہ سے ملنے کا وعدہ تھا۔



مس عاشی ساڑھے آٹھ بجے کے قریب حسب وعدہ عامل ظہوری کے دفتر پہنچ گئی۔ شام کے دھیمے رنگ کا لباس، ہلکے سے میک اپ میں وہ بڑی فریش نظر آ رہی تھی۔ خوبصورت نفیس پیکنگ میں وہ گورمے ڈیلائٹ سویٹ والوں کی مٹھائی لانا نہیں بھولی تھی۔ یہاں عامل صاحب بھی اپنے پسندیدہ گیروے رنگ کے سندھی کڑاھی والے کھلے لباس میں مشک بسائے چنبیلی کے تیل سے چپڑی دراز زلفوں پہ سندھی ٹوپی پہنے شایان سے محو گفتگو تھے۔ کالی پینٹ، مرون کلر کی بین کالر شرٹ، براؤن اٹالین شوز، سواتی یاقوت کے آتشیں نگینے والی انگشتری، گلابی کافوری مومی کلائی پہ وزنی کندنی زنجیر، سرامک اسٹریپ، کرسٹل سفائر، قیمتی راڈو۔ بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی کا آدھ انچ لمبا پالش کیا ہوا ناخن اور فرانسیسی شینل فائیو کی مخصوص مدھم سی مہکار--- وہ اسے مبہوت سی دیکھتی رہ گئی۔ یہ نہیں کہ وہ پہلی مرتبہ ملی تھی، اس سے پیشتر بھی سرسری سی دو چار ملاقاتیں اسی بلڈنگ کے اسی دفتر میں ہو چکی تھیں لیکن آج تو شایان، شایانِ شان تھا۔ نیلم سی نیلگوں آنکھیں، سونا برادے بال، لعل یمن سے تراشے لب، سیپی سپید دانت۔ وہ ایک رنگین مزاج عورت تھی، دانت کچکچاتی رہ گئی، اتنا خوبصورت، اتنا رسیلا کہ کچا چبا جانے کو دل چاہے--- مٹھائی کا ڈبا تھامے وہ سحرزدہ کھڑی تھی۔ ظہوری شاہ، اس کے اندر باہر کی کیفیت کو بھانپتے ہوئے، مترنم شعر پڑھنے لگا۔

"اے دیکھنے والے اس درجہ گستاخ نہ بن، بے باک نہ ہو
اس طرح لطافت جلوؤں کی مجروح نظر ہو جاتی ہے"

"میڈم! تشریف رکھیں پھر جی بھر شایان صاحب کو دیکھتی رہیئے، دیکھنے پہ کوئی ٹکٹ نہیں---"

ملازم ٹھنڈے مشروب کی بوتلیں میز پہ سجا کر باہر نکلنے لگا تو مس عاشی نے اسے روک لیا اور سو روپے کا نکور نوٹ تھماتے ہوئے کہنے لگی۔

"شایان صاحب کا سر صدقہ --- باہر محتاجوں میں تقسیم کر دو ---"

پھر اپنے ہاتھوں ظہوری شاہ اور شایان کو مشروب پیش کرنے لگی اور بولی۔

"ماشاءاللہ، نظر بد سے بچیں، آج تو شایان صاحب پہ نظر نہیں ٹھہرتی ---"

گلگوں ہونٹوں سے ٹھنڈا مشروب سِپ کرتے ہوئے تعریف کرنے لگی۔ ظہوری شاہ نے شرارت اور متانت کے ملے جلے لہجے سے اس کی بات پہ گرہ لگائی۔

"نظریں تو آپ کی کافی عرصہ سے ان پہ ٹھہری ہوئی ہیں ---"

جیسے ایک ساتھ کئی گلاس چھناکے سے ٹکرا گئے ہوں، وہ اتنا ٹوٹ کر ہنسی کہ آنسو نکل پڑے۔

"بہت خوب، شاہ جی! مزہ آ گیا۔ کیا برمحل چوٹ کی ہے ---" وہ ننھے سے رومال سے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ "اسی لئے تو ان کا صدقہ اتارا ہے --- اور آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ کم از کم میری نظر ان پر ٹھہر تو سکتی ہے مگر لگ نہیں سکتی ---"

وہ اسے معنی خیز نظروں سے تولتے ہوئے پوچھنے لگا۔ "وہ کیوں، کیا آپ کی نگاہوں میں ذوق نظارگی کی کمی ہے ---؟"

"جی نہیں --- ذوق نظارگی کی کمی ہے، نہ جلوہ بینی کی، آپ تو جانتے ہیں کہ ہیرے پہ کنکر کی چوٹ سے کوئی اچھا برا اثر نہیں پڑتا ---"

شایان بھنا کر بولا۔ "آپ دونوں کی تو برابر کی چوٹ ہے، مجھ غریب کو درمیان میں کیوں رگید رہے ہیں --- کون ہیرا، کون کنکر؟"

ظہوری شاہ لطف اندوز ہوتے ہوئے بولا۔ "واہ، بہت اچھے --- بڑی بی سو بڑی بی، چھوٹی بی سبحان اللہ ---!"

اب شاید شایان کے ہنسنے کی باری تھی، اس ہنسی پر بھی قربان۔ وہ ہنسا تو ملے ہوئے عنابی رسیلے ہونٹوں کے کناروں کے پاس ننھے ننھے ڈمپل نمایاں ہو گئے۔ بالکل جیسے پکے ہوئے آلوچے تمازت اور شیریں رس کی فراوانی سے پھوٹنے کو ہوں۔ ہنسی کیا تھی، جلترنگ کا آہنگ تھا۔ مس عاشی اب بھی محظوظ ہوئی، بولی۔

"آپ کی ہنسی پہ بھی قربان جانے کو جی چاہتا ہے ---"

شایان، ظہوری شاہ سے مخاطب ہوا۔ "آپ دونوں نے میرا کافی مذاق اڑا لیا ہے، اب میرے لئے یہی بہتر ہے کہ میں "نیواں نیواں" ہو کے یہاں سے نکل لوں، لیکن جانے سے پہلے آپ سے ایک شعر ضرور سنوں گا۔ مجھے تو آج معلوم ہوا آپ اتنا اچھا ترنم اور اتنا معیاری شعری ذوق رکھتے ہیں ---"



ظہوری اپنی تعریف سن کر مسکرایا، خوش ہوا۔ اک لمحہ آنکھیں میچیں اور بولا "لو بھئی، موقع کی مناسبت سے ایک شعر یاد آ گیا۔

"پھیلی ہوئی ہے آس پاس آنکھوں کے دھوپ سی
یہ آپ ہیں تو آپ پہ قربان جایئے"

سبحان اللہ --- "شایان نے داد دی اٹھتے ہوئے پرس سے پانچ سو کا نوٹ نکال کر سپرائیٹ کی خالی بوتل میں پھنسایا۔ "میری طرف سے مس عاشی کی خوش اخلاقی، خوش ذوقی اور خوش طبعی کا صدقہ اتار دیجئے گا ---" کوئی جواب لئے بغیر وہ باہر کھسک گیا، دونوں منہ کھولے ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھ رہے تھے۔ چند لمحے ساکت و جامد سے گزر گئے پھر مس عاشی نے پرس کھولا، بینسن کا پیکٹ نکالا۔ دونوں نے ایک دوسرے کے سگریٹ سلگائے۔

"اجازت ہو تو اب کچھ لڑکی کے بارے میں گفتگو کر لیں ---" بھرپور دھواں اگلتے ہوئے ظہوری شاہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ مس عاشی نے کہنا شروع کیا۔

"شاہ جی! لڑکی بڑی سوبر اور کواپریٹو ہے میرا خیال ہے، اس سے ہمیں کوئی پریشانی نہیں ہو گی --- گو شکل و صورت واجبی سی ہے لیکن تھوڑی سی محنت اور نوک پلک درست کرنے سے کہیں نہ کہیں کھپ ہی جائے گی۔ آپ کا کیا خیال ہے؟ --- ہاں، یاد آیا --- آپ نے اس کے سیارے نحس ہونے کی متعلق کچھ کہا تھا ---"

ظہوری شاہ نے کاغذ پہ کچھ تحریر کرتے ہوئے پوچھا۔ "اس کی موجودہ حالت کیسی ہے؟"

وہ دماغ پر زور ڈالتے ہوئے بتانے لگی۔ "ستر فیصد ہوش و حواس میں ہے۔ نہا دھو، کپڑے بدل، کھانا پینا کر کے میوزک سن رہی ہے ---"

لمبی سی "ہوں" کرتے ہوئے اس نے پھر سوال کیا۔ "کوئی سگریٹ وغیرہ ---؟"

"سادھے سگریٹ نہیں لیتی، تین بار بھرے ہوئے پیئے۔ پنی اور پوڈر کا تقاضا کرتی ہے --- ایک بار آپ کی دوا بھی دی تھی۔"

"گزری رات کی کوئی بات، اس نے اپنے یا تمہارے متعلق کوئی سوال پوچھا ہو ---؟"

رات وہ بے سدھ سوئی۔ اپنے اور میرے متعلق اس نے پوچھا تھا، میں نے اسے بتایا کہ معمولی سے حادثے میں اپنی یادداشت وقتی طور پہ کھو چکی ہے وہ میری چھوٹی بہن شمسہ ہے، میں اس کی بڑی باجی ہوں ---" وہ کچھ توقف کرتے ہوئے بولی۔ "شاہ صاحب! وہ اپنا ماضی بھول چکی ہے، اسے کچھ بھی یاد نہیں ---"

عامل ظہور شاہ کچھ سوچتے ہوئے پھر حساب کتاب میں مشغول ہوگیا اور کچھ دیر
آنکھیں موندھ کر کہنے لگا۔

"اس کا زائچہ تیار کرنے کے لئے اس کا اور اس کی ماں کا نام تاریخ پیدائش جاننا ضرو
ہے۔۔۔ میں نے پہلے جس خدشے کا اظہار کیا' وہ محض ماتھا دیکھ کر کیا تھا۔ یہ محض آدھا سچ
ہے' پورا نہیں۔۔۔"

وہ قدرے تشویش کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔ "اب کیا کریں۔۔۔ اس کے پاس تو
ایسا نشان یا اتا پتا نہیں۔ جس سے اس کا نام' ماں کا نام یا پیدائش کی تاریخ معلوم ہوسکے۔۔۔

"تم ٹھیک کہتی ہو۔۔۔ استاد قربان کو یہ لڑکی بڑی بری حالت میں ملی تھی' اس دن ہی
کی جسمانی اور ذہنی حالت کا اندازہ ہوگیا تھا پھر اس کا لباس بھی بتا رہا تھا کہ کسی جگہ اس
ساتھ بہت زیادتی ہوچکی ہے۔ لڑکی کافی عرصہ سے منشیات استعمال کرتی چلی آرہی۔
زیادتی سے پہلے' زیادتی کے درمیان اور بعد میں بھی اسے منشیات کے انجکشن دیئے گ
مختلف انجکشنوں کی زیادتی نے اس کے دماغ کے اندر یادداشت کے خلیوں کو بے ح
ناکارہ کردیا ہے۔۔۔ رہا اس کی شناخت کا مسئلہ تو ظاہر ہے کہ زیادتی کرنے والوں نے اس
پرس کے ساتھ بھی کوئی شریفانہ سلوک نہیں کیا ہوگا۔ نقدی' شناختی کارڈ' ڈائری وغیرہ'
کچھ صاف کردیا ہوگا۔۔۔"

مس عاشی مایوس ہوکر بولی۔ "اب۔۔۔؟"

"اب صرف انتظار کے علاوہ اور کیا ہوسکتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس کی کھوئی
یادداشت واپس آجائے یا پھر کبھی نہ آئے۔۔۔"

کچھ دیر دونوں پر خاموشی کی دھند چھائی رہی' پھر جیسے مس عاشی کو امید کی کوئی کرن د
پڑی۔

"شاہ جی! آپ کوئی ایسا عمل کریں کہ اس کی یادداشت کبھی واپس نہ آئے۔ اس طر
اس کو نیا نام' نیا کام اور نئی زندگی دیں گے۔ اپنے ڈھب پہ لاکر نوٹ کمائیں گے۔۔۔"

"میڈم! آپ کو یہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ کچھ دن تیل دیکھیں' تیل کی دھار دیکھ
پھر دیکھیں گے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔۔۔ فی الحال آپ اس کا دل جیتنے کی کوشش کریں
طرح سے آرام اور سکون بہم پہنچائیں۔۔۔ اور ہاں' میری دی ہوئی دوا کا استعمال
رکھیں۔۔۔"

وہ قدرے مطمئن سی اٹھتے ہوئے بولی۔ "کبھی شایان صاحب کو ہمارے غریب خا



ی لائیں' کچھ ہمیں بھی ان کی خدمت کا موقع ملے۔۔۔"

وہ دزدیدہ نگاہوں سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ "میڈم! یہ مرغی کاٹ کر کھانے والی
ین ہے' انڈے دینے والی ہے۔۔۔ میرا خیال ہے کہ آج بھی آپ نے صدقہ اتار کر کچھ
یادہ ہی بے تکلفی برتی ہے۔۔۔"

"شاہ جی! واقعی وہ آج بڑا پیارا لگا اور پیاری چیز کو میری نظر بڑی جلد لگ جاتی ہے' اسی
ئے صدقہ اتارا۔ ورنہ ایسی ویسی کوئی بات نہیں۔۔۔"

وہ زیر لب مسکراتی ہوئی' اللہ حافظ کہہ کر دروازہ کی جانب بڑھ گئی۔

☆☆☆

عامل ظہوری شاہ خوب جانتا تھا کہ شایان اس کی شخصیت اور عامل ہونے کے حوالے سے
ں کی بڑی عزت کرتا ہے' اس سے متاثر اور مرعوب بھی ہے۔ وہ جب سے اس کا کرایہ دار
تھا' اس کی ذات شخصیت کردار طبیعت کا بغور مشاہدہ کر رہا تھا۔ اس کی ساتویں شیطانی حس
ر تجربے نے اشارہ دے دیا تھا کہ یہ دوہری شخصیت کا شہزادہ اس کے لئے سونا نہیں بلکہ
ٹینم کے انڈے دینے والی مرغی ثابت ہوگا۔ وہ اس کی بتدریج بدلتی ہوئی نرگسی تبدیلی سے
ں آگاہ تھا' اس نے یہ بھی محسوس کرلیا تھا کہ شایان ہمیشہ اس وقت اس کے پاس آنے کی جستجو
رتا ہے جب دفتر خالی ہوتا ہے۔ اس نے اشارہ بھی دیا تھا کہ وہ اپنے کسی ذاتی پرابلم پہ بات کرنا
ہتا ہے مگر ظہوری شاہ جان بوجھ کر اسے وقت فراہم نہیں کرتا تھا۔ وہ اس کی طلب کو ہوا دے
تھا' وہ شروع ہی سے ٹھنڈا کر کے کھانے کا عادی تھا اور اب شاید کھیر ٹھنڈی ہوچکی تھی۔

ایک روز' ٹھنڈے پہر دروازے پہ ملازم بیٹھا تھا۔ عام ملاقاتیوں کے لئے داخلہ بند تھا'
ر وہ ایک امیدوار کونسلر کا زائچہ تیار کر رہا تھا۔ میز پہ کتابیں' ستاروں برجوں کے نقشے' ہاتھ
ے پرنٹ پھیلے پڑے تھے۔ ایش ٹرے سگریٹ کے ٹوٹوں سے بھری پڑی تھی۔ چرس' تمباکو
ر دیسی شراب کی ملی جلی بدبو سے کمرے کی فضا بوجھل تھی کہ تب ہی اچانک شایان کے آنے
ی اطلاع ملی اور وہ لپک کر خود ہی باہر کمرے میں آگیا۔

"شاہ صاحب! آپ مصروف دکھائی دیتے ہیں' میں بے وقت آنے کی معافی چاہتا
ں۔۔۔ ادھر سے گزرا' باہر ملازم کو بیٹھے دیکھا' اس سے آپ کی طبیعت کا معلوم کیا اور
رے نہ' نہ کرتے ہوئے بھی اس نے آپ کو میرے آنے کی اطلاع کردی۔۔۔"

ظہوری شاہ بڑے دلار سے اس کے شانے پہ اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے بڑی اپنائیت سے کہا۔
"شایان صاحب! جب آپ آہی گئے ہیں اور آپ کے مقدر کی چائے میرے ہاں لکھی ہی گئی

ہے تو پھر تکلف کیسا' اسی بہانے میں بھی چائے پی لوں گا--- آیئے---"

اس کے پرائیویٹ کمرے میں داخل ہوتے ہی اسے ابکائی سی آئی--- کھٹی کھٹی بدبو--- اس کا دماغ پھٹنے لگا جب اندر آ ہی گیا تھا تو منہ سے کیا بولتا' صبر کر کے بیٹھ گیا اور بکھرے ہوئے "ملبے" کو تجسس بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا۔ "شاہ جی! آ کچھ زیادہ ہی مصروف دکھائی دیتے ہیں---"

"ہاں' شایان صاحب! ایک سیاسی شخصیت الیکشن لڑنا چاہ رہی ہے' اس سلسلے میں م ہوں---"

وہ دلچسپی لیتے ہوئے مزید کریدنے لگا۔ "الیکشن کے سلسلے میں آپ اس کی کیا مدد ہیں---؟"

"یہ ہاتھوں کے پرنٹ آپ دیکھ رہے ہیں---" وہ ایک پرنٹ لائیٹ بکس کی سک لٹکاتے ہوئے دکھانے لگا۔ "یہ ریکھائیں' ابھار' دائرے' جھرمٹ' مکھٹ' کہکشائیں' کے اندر اس کی ناکامی یا کامیابی چھپی ہوئی ہے--- اور یہ دیکھیں اس کا زائچہ' اسی کتاب اور ستاروں کی چالوں کے حوالے سے وہ اپنی کامیابی کے امکانات کا اندازہ لگانا چا اور میرے حساب کتاب کے مطابق اس کی کامیابی کا چانس ساٹھ فیصد ہے۔ عطارد' دلو کے قریب بھٹک رہا ہے اور بس یہیں خرابی پیدا ہونے کا خدشہ ہے---"

وہ مزید دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھنے لگا۔ "آپ کے خیال میں اس کی کا گراف ساٹھ فیصد سے اوپر جا سکتا ہے---؟"

"دعویٰ تو نہیں' کوشش کی جا سکتی ہے۔ کامیابی' ناکامی تو اللہ کے ہاتھ ہے۔ بند محض کوشش اور دعا کر سکتا ہے---"

ذرا وقفہ ملا تو ظہوری شاہ سگریٹ بنانے لگا اور بولا۔

"شایان صاحب! موڈ اور ماحول بنانے کے لئے مجھے بھرے ہوئے سگریٹ کی طل ہے' خصوصاً" اس حساب کتاب میں دماغ خشک اور ڈل ہو جاتا ہے۔ اسے فعال اور رکھنے کے لئے اس سے بہتر اور کوئی چیز نہیں---" وہ چرس کی پھکی کو گرم کر کے سگر تمباکو میں مسل رہا تھا۔ "وجدانی کیفیتوں اور باطنی توجہ کو ایک نقطے پہ جمع رکھنے کے لئے اکسیر ہے---"

سگریٹ بھر کر سلگایا۔ ایک دو لمبے لمبے دم' دو کشوں میں ہی سگریٹ آدھا جل سگریٹ کی جلی ہوئی راکھ ہتھیلی پہ جھاڑ کر زبان سے چاٹ لی۔ کمرہ غلیظ اور کثیف دھو



بھر گیا' شایان کو کھانسی کا پھندا لگ گیا۔ اتنے میں ملازم چائے لیئے اندر آ گیا۔

"شایان صاحب! کھل کر کھانسیں' سینے میں رکی ہوئی کھانسی بلغم پیدا کرتی ہے اور اسی طرح دل میں دبائے ہوئے دکھ اور غم بھی انسان کے لئے موت کا سامان پیدا کرتے ہیں۔ جو سینے اور دل میں ہو' اسے فوراً" باہر نکال دینا چاہیے---" کثیف دھویں کے مرغولے اور چھلے بنا کر اس کے چہرے پہ پھینکتے ہوئے ظہوری شاہ نے آنکھیں بند کر لیں۔ "جب آپ اندر داخل ہوئے تھے' آپ کو اندر کی فضا بڑی بوجھل اور کچھ بدبودار سی محسوس ہوئی تھی۔ میں نے آپ کے چہرے کے تاثرات سے محسوس کر لیا تھا مگر آپ نے اظہار نہیں کیا اور بات اندر رکھ لی۔ یہی بات میں آپ کو سمجھانا چاہتا تھا کہ دھواں یا دکھ' بات یا مات اندر رہے اور کمرے یا منہ کی کھڑکی نہ کھلے تو بڑی گھٹن اور گھٹنا پیدا ہو جاتی ہے--- ظہوری شاہ نے اٹھ کر بند کھڑکیاں کھول دیں' تازہ ہوا کے جھونکے اندر آنے لگے۔ "دیکھا آپ نے' پل بھر میں فضا بدل گئی---"

وہ مسکراتے ہوئے ایک اور سگریٹ تیار کرنے لگا۔ شایان بڑے غور سے اس کی باتیں سن رہا تھا--- کتنی خوبصورت مثالیں تھیں' کیسے دل نشین اور پُر اثر انداز میں اس نے سمجھا دیا تھا کہ بات کو باہر نکالو۔ کوئی مخلص انسان نہ ملے تو دیواروں' دروازوں' کھڑکیوں سے ہی اپنا دکھ کہہ دو کہ اس طرح انسان ہلکا اور تر و تازہ ہو جاتا ہے۔ سگریٹ بنا کر سلگاتے ہوئے پھر ظہوری شاہ کہنا شروع ہوا۔

"یہ بھرا ہوا سگریٹ اندر کی بھڑاس نکال دیتا ہے۔ اس کی کڑواہٹ' اندر کی کڑواہٹ کو کاٹ دیتی ہے۔ یہ انسان کو اس کی اوقات کے حصار سے باہر نہیں نکلنے دیتی اور اس کے اُبلتے ہوئے جذبات' خیالات اور احساسات کو آہستہ آہستہ تھپک کر میٹھی نیند سلا دیتی ہے۔ اس کا دھیان اندر کی طرف دھکیل دیتی ہے--- یہ چرس ہے۔" وہ اسے چرس کی گولی دکھانے لگا۔ "شایان صاحب! یہ درویشی تحفہ اور فقیری دھواں ہے' دھیانی گیانیوں کی دَین ہے۔ مہاتما بدھ نے جب دھیان گیان کی خاطر برگد کے نیچے آسن جمایا تو من کی چِنتا' سنسار کے جوکھم اور اکھیوں کی نِندیا کارن جب بہت دُکھیا ہوا اُنگلیاں ڈال ڈیلے نکال باہر پھینک دیئے۔ ڈیلے مٹی کے ڈھیلے سے ملے تو حشیش کا پودا پھوٹ پڑا۔ تب سے اب یہ کالی دیوی' دھیانیوں' گیانیوں' منیوں' رِشیوں اور خفی علوم کے طالبوں پہ اپنی مدھرتا کی چھپر چھایا کیے ہوئے ہے---" شایان تو چرس پیئے بغیر ہی قریب قریب مدہوش ہو گیا--- حلق خشک لیکن دماغ تر ہو گیا تھا۔ ایسی باتیں کبھی سنی نہ تھیں۔ اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے اس کے آدھے دَلدر دُور ہو چکے ہیں'

وہ خود کو ہلکا پھلکا سا محسوس کرنے لگا۔۔۔۔یہ نہیں کہ اس نے کبھی سگریٹ نہیں پیا تھا' شغ
کے طور اکثر وہ سگریٹ پی لیا کرتا تھا۔ چرس ورس کے چکر میں نہیں پڑا تھا مگر اتنی تعریف ا
فائدے سن کر اس کا دل چاہا کہ شاہ صاحب ایک آدھ کش اسے بھی عنایت کریں۔

"لو' شایان صاحب! ہلکے سے ایک کش لگا کر دیکھو اور میری ان باتوں کی خود ہی تصد
کرلو۔۔۔۔"

جیسے اس نے شایان کا ذہن پڑھ لیا تھا۔۔۔۔ دو چار کشوں سے واقعی وہ ہوا میں اڑنے ا
دماغ کافور کی ڈلی کی مانند ٹھنڈا' روئی کا گالا بن گیا۔ ایسا سرور' ایسا سکون' سرمستی اور
فراموشی اسے پہلے کبھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ نیلگوں خواب خواب غزالی اکھڑیوں میں
کے دیئے سے روشن ہوگئے۔

"واہ' سرور آگیا' شاہ جی۔۔۔!" وہ خشک لبوں کو زبان سے تر کرتے ہوئے کہنے لگا۔ "
جی! کبھی میرا حساب یعنی زائچہ بھی بنایئے۔۔۔"

عامل ہوشیار اور مکار تھا' معمول مدہوش اور معصوم۔۔۔ ظہوری شاہ کے ہونٹوں پر ا
سِفلی سی مسکراہٹ تیر رہی تھی۔ اس نے سرور کے سمندر میں ڈوبتے ہوئے شایان کو جو
دیا۔

"گولی کِدی تے گہنے کِدے۔۔۔جب آپ حکم کریں' زائچہ تیار ہو جائے گا لیکن زا
تو دکھی' پریشان اور زندگی کی دوڑ میں ناکام لوگ بنواتے ہیں۔۔۔" اس نے کمال مکاری
اسے کریدتے ہوئے یہ بات کہی تھی۔ وہ تو بڑا تجربہ کار' عیار شکاری تھا' شکار کو قوت اور
تکلیف دے کر شکار کرنے کا قائل نہیں تھا۔ وہ حالات اور ماحول پیدا کرکے اسے ا
وزن' کسی غلطی یا کمزوری کے ہاتھوں بے بس کرکے شکار کرنا پسند کرتا تھا۔ بڑی لمبی پلاننگ
انتظار صبر کے بعد' آج وہ موقع حاصل کرنے میں کامیاب ہوا تھا۔ وہ اس کی کوئی دکھتی
پکڑنا چاہتا تھا' کسی کمزوری یا خامی کو نظر میں رکھنا چاہتا تھا۔ اسے نامحسوس شریفانہ بلیک
سے اپنا آلہ کار بنا کر وسیع تر مفاد حاصل کرنا چاہتا تھا۔۔۔۔ شایان چرس کے سرور میں یا ظ
شاہ کی بات پہ غور کرتے ہوئے گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا یا وہ یہ سوچ رہا تھا کہ اپنی بات
سے شروع کرے؟۔۔۔ ظہوری شاہ نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے پھر اسے جھنجھ

"شایان جی! آپ کو ماشاء اللہ کس چیز کی کمی ہے۔ جو زائچہ بنوانے کی سوجھی۔۔۔؟"

"شاہ جی! جیسے ہر خوبصورت چیز کے پیچھے کوئی نہ کوئی بدصورتی چھپی ہوئی ہوتی
طرح ہر امیر کے ساتھ بھی کہیں غریبی لپٹی ہوئی ہوتی ہے۔ بظاہر خوش اور مطمئن دکھائ



والا چہرہ ہو سکتا ہے کہ اپنی اوٹ میں ناآسودگی اور اضطراب اضمحلال کی کوئی کیفیت رکھتا
ہو۔۔۔"

ظہوری شاہ تو جیسے کش لے کر دھواں خارج کرنا ہی بھول گیا تھا۔ ناک' منہ کی بجائے
کانوں سے دھواں نکلنے لگا' اس کے کانوں سے بات ہی ایسی ٹکرائی تھی۔ ایسے شیشہ بدن سے
گفتگو میں ایسی سنگ مرمری کی امید نہ تھی' چرس کے چند کشوں نے نادان سے فلاسفر بنا دیا تھا۔
ایسی بات' ایسی سوچ۔ شاید وہ بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ کیا کہہ گیا ہے۔ بے خودی کے عالم میں
شاید شعور کی شعبدہ بازیاں' شوریدگیاں منہ ڈھانپ کر کہیں سو جاتی ہیں' لاشعور اور تحت
الشعور بیدار ہو جاتا ہے اور پھر وہی بولتا ہے۔ خدشوں' خساروں سے بے خطر' اپنی ہی ہانکتا
ہے۔ ایسے ایسے انکشاف اعتراف اور اذکار کرتا ہے جن کی توقع عالم ہوش میں نہیں ہوتی۔۔۔
ظہوری شاہ اپنی حیرت پہ قابو پاتے ہوئے بولا۔ "خدا نہ کرے' آپ کو کوئی پریشانی ہو۔۔۔ پھر
بھی اگر کوئی ایسی بات ہو تو بے تکلف کہیئے' میں ہر ممکن مدد کے لئے حاضر ہوں۔۔۔ اور ہاں'
میرے اس پیشے میں رازداری بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ آپ بڑی تسلی اور کھل کھلا کر بات
کرسکتے ہیں۔"

"شاہ جی! بچپن میں نہاتے ہوئے میرے ایک حساس عضو پہ پیلے بھڑ نے کاٹ لیا تھا۔
معمولی بات سمجھتے ہوئے کوئی توجہ نہ دی اور دوا پٹی سے بھی کوئی افاقہ نہ ہوا۔ چھوٹی سی گلٹی سی
بن گئی۔ ڈاکٹر نے لاہور دکھانے کا مشورہ دیا۔ یہاں مختلف علاج' کئی ڈاکٹر بدلے مگر بجائے
آرام افاقے کے مسئلہ اور بگڑ گیا۔ پیشاب کے اخراج میں دقت تھی' اب کچھ افاقہ ہے
مگر متاثرہ جگہ کی نشوونما شروع سے ہی رک گئی تھی۔ ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ آپریشن سے
میں ازدواجی زندگی بسر کرنے کا اہل نہیں رہوں گا۔ یہ مشورہ دیا گیا ہے کہ سال' دو سال انتظار
کرلیا جائے تو شاید کوئی بہتری کی صورت نکل آئے۔۔۔"

ظہوری شاہ نے بات سن کر اسے ایک تازہ بھرا ہوا سگریٹ پیش کیا' کش لیتے ہی کھانسی کا
جو دورہ پڑا تو آنسو نکل آئے۔ سگریٹ واپس کرتے ہوئے شایان کہنے لگا۔

"شاہ جی! بس۔۔۔ میرا سر گھومنے لگا ہے۔ میں اس کا عادی نہیں' سادہ سگریٹ بھی کبھی
شغل کے طور پہ پی لیتا ہوں۔۔۔" لوڈشیڈنگ سے جیسے ایک دم اندھیرا چھا جاتا ہے' اسی طرح
ہنستا مسکراتا یہ ماحول بھی اداسی کے اندھیرے میں ڈوب گیا۔ "شاہ جی! آپ کو ہمدرد اور بزرگ
سمجھ کر دل کی یہ بات بتائی ہے۔۔۔ ایک بات اور۔۔۔ بچپن میں میری منگنی' ماموں کی بیٹی سے
طے ہو چکی ہے' ہم ایک دوسرے کو بے حد چاہتے ہیں۔" کچھ کہتے کہتے وہ پھر خاموش ہو گیا

جیسے کہوں‘ نہ کہوں کی کیفیت میں مبتلا ہو۔۔۔ ”شاہ جی! ذرا سگریٹ دیں‘ صرف ایک کش۔۔۔“

انسان بھی کیا چیز ہے۔ عجیب و غریب جانور! گھڑی میں تولہ‘ گھڑی میں ماشہ‘ تلوّن کی تلو
ہاتھ میں ہو تو ہر چیز‘ ہر خواہش‘ ہر خواب کاٹتا چلا جاتا ہے۔ مستقل مزاج ہو تو دلدل پہ بھ
توازن قائم رکھتا ہے۔ اس کے اندر کا بچہ اور بزرگ اسے تگنی کا ناچ نچاتے رہتے ہیں۔ دود
میں پانی ڈالو اور پھر ضد کہ پانی نکالو۔ کھلونے کے لئے رو رو آنکھیں سجا لینا پھر انہیں توڑ
تالیاں بجانا‘ ریت کی دیواروں پہ بڑے بڑے قلعے تعمیر کرنے پہ کمربستہ‘ مضبوط فصیلوں کے ا
آئینہ خانے بنانے کا خواہاں‘ روشنی میں آنکھیں بند اور اندھیروں میں روزن تلاش کرے
پھنسے تو پکارے۔۔۔ پہلے ظہوری شاہ نے سگریٹ دیا تو واپس کر دیا‘ اب خود مانگ رہا تھا۔ ج
کوئی پھنسی ہوئی پھانس کو کھینچ کر نکال دیتا ہے۔۔۔ آخر اسے کہتے ہی بنی۔

”شاہ جی! یوں محسوس ہوتا ہے میں اپنی منگیتر کو کھو دوں گا۔۔۔“ اٹک اٹک کر بولا
الفاظ حلق میں مچھلی کا کانٹا بن گئے ہوں۔ ”۔۔۔میں شاید اسی کا شوہر بننے کے قابل
رہوں۔۔۔ شاہ جی! میں تو شاید قسمت کے لکھے پہ صبر کر لوں مگر اس کی زندگی برباد ہو جا
گی۔ وہ میرے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔۔۔“

بہت دیر بعد ظہوری شاہ کو بولنے کا موقع ملا ورنہ وہ تو گُم سُم‘ اس کا ”کھُل جا سم سم“
رہا تھا۔ ”آپ کی منگیتر کو ان باتوں کا علم ہے۔۔۔“ ظہوری شاہ نے کریدا۔

”ظاہر ہے۔۔۔ وہ میری کزن ہے‘ اس بات سے باخبر ہے لیکن اس تکلیف نے جو
صورت اختیار کر لی ہے اس سے وہ ابھی لاعلم ہے۔۔۔“

ظہوری شاہ جیسے کسی نتیجے پہ پہنچ چکا تھا‘ پھیکے سے مسکراتے ہوئے اسے تسلی دینے
”شایان صاحب! میں سب کچھ سمجھ گیا‘ آپ مطمئن رہیں انشاء اللہ! سب ٹھیک ہو جائے
آپ نے جو کچھ مجھے بتایا ہے‘ کسی اور سے اس کا ذکر نہ کریں۔ میں جو کچھ بھی کر سکتا ہ
کروں گا۔ میں اس ضمن میں اپنے دوست حکیم جمالی صاحب سے بھی مشورہ کروں گا جو
امراض اور معاملات میں بڑے سیانے اور تجربہ کار ہیں۔ ان کے ہاتھ میں بڑی شفا ہے‘
اللہ بڑی رازداری سے سب کام ہو جائے گا۔۔۔“

”اس کے باوجود میں چاہتا ہوں کہ آپ میرا مکمل زائچہ تیار کریں۔۔۔ مجھے یقین
ٓپ میری پریشانی دور کر سکتے ہیں‘ میں آپ کی ہر طرح کی خدمت کے لئے تیار ہوں۔۔۔
یہ نیل کنٹھ اب پوری طرح ظہوری شاہ کے جال میں پھنس چکا تھا



شایان کے رخصت ہوتے ہی ظہوری شاہ نے ٹیلی فون پہ حکیم جمالی سے رابطہ قائم کیا‘ معلوم ہوا کہ وہ ڈیرے پر کچھ دوائیں تیار کرنے گیا ہوا ہے۔۔۔ کونسلر کے زائچے اور شایان سے وہ کافی سر کھپائی کر چکا تھا‘ طبیعت بوجھل بوجھل سی محسوس ہو رہی تھی۔ موڈ کا رنگ بدلنے کی نیت سے وہ سوڈیوال روانہ ہو گیا‘ ڈیرے پہنچ کر معلوم ہوا کہ حکیم جمالی حاجی رجی بیگم کے ہاں دھرا ہوا ہے‘ اُدھر گیا تو کمرے کی فضاء اشتہا انگیز کھانوں کی مہک سے لبریز تھی۔ فرشی دسترخوان پہ‘ بریانی‘ شامی کباب‘ تلی ہوئی مچھلی‘ قورمہ اپنی اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ یہ منظر دیکھتے ہی اس کی بھوک چمک اٹھی۔ حاجی رجی بیگم‘ نے جی بسم اللہ کہتے ہوئے استقبال کیا‘ حسب دستور بلائیں لیں اور دُعائیں دے کر اپنے پاس بٹھایا۔ حکیم جمالی اس سے نظریں چرا رہا تھا‘ ظہوری شاہ نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔

”حکیم صاحب! آج اکیلے اکیلے ہی کھابہ کھانے چلے آئے‘ یاروں کا کھانا پینا اکٹھے ہی اچھا لگتا ہے۔۔۔“

حکیم جمالی اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہنے لگا۔ ”سرکار! میں کسی باقاعدہ پروگرام کے تحت یہاں نہیں آیا تھا۔ رات یہاں کچھ مرکبات پخت ہونے کے لئے رکھوائے تھے‘ سو آج یہاں پہنچا تو حاجی صاحب نے کھانے میں شامل ہونے کا حکم دیا اور آپ جانتے ہیں‘ ان کا حکم ٹالا نہیں جا سکتا۔۔۔“ پھر وہ شامی کباب بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”ذرا چکھیں اور خدا لگتی کہیں‘ ایسے لذیذ خستہ شامی آپ نے کہیں اور کھائے ہیں۔۔۔؟“

حاجی رجی بیگم نے ہری مرچ‘ لہسن اور ہرے دھنیئے کی چٹنی بڑھاتے ہوئے ترغیب دی۔ ”ذرا اس کے ساتھ تناول فرمایئے۔۔۔ صدقے جاؤں‘ لذت کام و دہن تنبورے کی طرح تنتنانے نہ لگے تو رجی کو رجی نہ کہیئے گا۔۔۔“

اب ظہوری شاہ کی باری تھی۔ کہنے لگا۔ ”سچی بات تو یہ ہے‘ حاجی صاحب! جو لطف

ولذت اور نفاست آپ کے دسترخوان پہ ہے' اس کی نظیر کم از کم لاہور میں تو نہیں ملتی۔
حکیم جمالی نے گرہ لگائی۔ "---اور جو رکھ رکھاؤ اور سبھاؤ' قرینہ اور کھلانے پلانے
ذوق آپ کے ہاں ہے وہ اس دور بے سواد میں ناپید ہے---"
حاجی صاحب آداب بجالاتے ہوئے بولے۔ "اے حضور! قربان' صدقے واری،
کس کاج کی' یہ تو بڑے کھوں کے پیروں کا صدقہ ہے--- باوا حضور کے نعمت خانے میں راج
کے شاہی باورچی استاد کالو رام پوری بگھار لگاتے تھے' وہ یکتا ہنرمند اب کہاں--- اب تو
بھڑ بھونجے' پانی ٹماٹر کے تڑکے میں اُبلی بوٹیاں ڈال کر قورمے کا نام دے دیتے ہیں---
جانیں ادرک کا سواد؟--- جائفل جاوتری' لونگ الائچی' کاجو کشمش' زیرہ زعفران' کستوری
کیوڑہ' سونڈ سونف' ماجو مکرہ--- کانگڑے کا وہ زرد روغن' ڈیرہ دونی باسمتی چاول۔ ہائے
کون ہے جو ان نعمتوں کو جانے پہچانے' ان کے خواص استعمال کو سمجھے۔ اب نہ وہ پکانے وا
رہے اور نہ وہ کھانے والے---"
"سبحان اللہ کیا سچی تصویر کھینچی ہے آپ نے--- سبحان اللہ!" حکیم جمالی نے بڑا
لقمہ منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔
تیسری مرتبہ۔ "سبحان اللہ" حاجی صاحب کے منہ سے نکلا کہ دروازے پہ شایان اور
عامل ظہوری شاہ کا ملازم ہاتھ میں رقعہ لیئے کھڑا تھا۔ حاجی رجی بیگم کپکپاتی ٹانگوں سے است
کے لئے اٹھے۔
"میں قربان' میری جان! دل ما روشن' چشم ماشاد--- او لونڈیو! اٹھو' گل پاشی کرو
چاندنی' اے نازو' گلبدن! آگے بڑھو' چوکھٹ پہ تیل مانڈن کرو---"
محفل میں جیسے کھلبلی سی مچ گئی۔ ظہوری شاہ نے بڑے تپاک سے گلے لگایا۔ کمرے
موجودہ مورتوں کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ رعنائی' نزاکت' وقار و تمکنت کا ایسا حسین و
پیکر کہ کیا کوئی دیکھے' کیا کوئی سنے۔ وہاں موجود بزعم خود پری چہرہ' نازک رووں' عشوہ طراز
شیشہ بدنوں نے عالم محویت میں "ہائے اللہ" کی چھریوں سے اپنے دستِ حسرت زخمی
ڈالے۔ حاجی صاحب تو جیسے باؤلے ہوگئے تھے' کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا کہ کیا کریں؟
نیا دسترخوان بچھانے کا حکم دیا۔ ہڑبونگ سی مچی ہوئی تھی۔ دوسرے کمروں سے کواڑوں
اوٹ' چلمنوں کے پیچھے' کئی مورتیں' ٹکٹکی لگائے' حسرت بھری نظریں جمائے اس پری
دیدار کر رہی تھیں اور شایان بے چارہ' عالم بے چارگی میں نکو بنا کھڑا تھا' اس کی سمجھ میں
آ رہا تھا کہ وہ کہاں پھنس گیا ہے۔ وہ کونسلر صاحب کا ایک بہت ضروری پیغام لایا تھا' ملا



لف دینے کی خاطر یہاں پہنچا تھا' اسے کیا خبر تھی کہ اس کے ساتھ ادھر یہ حشر ہوگا--- حاجی
صاحب نے اسے حکیم جمالی اور ظہوری شاہ کے ساتھ بٹھایا اور بریانی کا پہلا نوالہ بسم اللہ پڑھتے
ہوئے شایان کے منہ میں رکھا۔ پھر چار و ناچار اسے بہت کچھ کھانا پڑا۔ کھانا پینا تمام ہوا تو موقع
محل کی مناسبت سے ناچ گانے کا اہتمام ہونے لگا۔ مورتیں تیاری میں جت گئیں۔ اسی دوران
ظہوری شاہ نے بڑے اچھے انداز میں حکیم جمالی سے شایان کا تعارف بھی کرا دیا۔ حاجی صاحب
تو پہلے ہی دو چار بار رسمی طور پر مل چکے تھے' پکی مہر اس ملاقات سے لگ گئی---
مغرب کی نماز تک محفل جمی رہی۔ رقص و سرور کی اس محفل سے شایان بڑا لطف اندوز
ہوا' نازو اور نیرا نے وہ رنگ جمایا کہ واہ واہ کرا اٹھا' کئی بار اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ خود
"باندھ گھنگھرو میرا ناچی" نرت کر رہا ہو۔ ردھم' تال' سم پہ اس پاؤں خود بخود تھرکنے کے لئے
بے چین ہو جاتے۔ شاید اس کی یہ کیفیت' ان قیامت کی نظر رکھنے والوں سے پوشیدہ نہ رہی
تھی۔ واپسی پر حاجی صاحب نے پیشانی چومتے ہوئے گورو گوتھ کے گڑ کی بھیلی چٹائی اور ایک
اشرفی قیمتی کشمیری شال کے پلو سے باندھ کر اس کے شانے پہ ڈال کر دعاؤں کے ساتھ رخصت
کیا۔ مغرب کے بعد اس نے ٹیوشن کے لئے جانا تھا۔
فرصت نصیب ہوئی تو یہ تینوں کشمیری چائے کے گرد بیٹھ گئے۔ کئی دنوں سے ان کے
مابین بابا میاں ہنگا شاہ کے عرس کی بابت بات چیت چل رہی تھی۔ اتفاق سے آج یہ تینوں اکٹھے
تھے۔ موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حاجی صاحب نے اس موضوع پہ گفتگو چھیڑ دی۔ مزار پہ
بجلی' نلکا لگ چکا تھا۔ ارد گرد کی جگہ صاف کر کے پیڑ پودے بھی جما دیئے گئے تھے' شہتوت کے
پیڑ پہ سبز جھنڈا بھی لہرا رہا تھا۔ ظاہر ہے' یہ سارے مصارف حکیم جمالی کی جیبِ خاص سے نکلے
تھے۔ عرس کے انتظامات اور دیگر اٹھنے والے سارے صرفے بھی حکیم صاحب نے اپنے ذمے
لئے۔ عرس میں پاکستان' ہندوستان کے تمام چیدہ چیدہ ہیجڑا منڈلیوں برادریوں کو مدعو کرنے کا
پروگرام طے ہوا۔ آخری دن اختتام پہ حاجی صاحب کو طلائی مکٹ پہنانے کی رسم' کھانا پینا'
مہمانوں کے قیام و آرام' ہر پہلو پہ بات ہوئی۔ مشاورت ختم ہوئی تو حاجی صاحب نے شایان
خوش جمال کا ذکر چھیڑ دیا۔
"میں قربان' جمالی صاحب! ناچیز نے بڑے بڑے فرخندہ جمال اور ناہید خصال دیکھے ہیں مگر
اللہ قسم! شایان جیسا نادر دُرِّ نایاب آج تک نظر سے نہیں گزرا--- وہ آنکھوں اور ہاتھوں
سے اس کی تصویر کھینچنے لگا۔
"نیلے سمندر سے گہرے نین' گلاب کی پنکھڑیوں ایسے یاقوتی لب' ننھے ننھے گڑھوں

والے شہابی عارض، صراحی جیسی گردن، سچے موتیوں کی مانند تابدار دانت، سانچے میں ڈھ
موی بدن، معصوم ادائیں، ناز و نزاکت، اللہ، اللہ! کس کس کی تعریف کروں۔ پگ میں
باندھ، سج دھج سامنے آجائے تو قیامت سے پہلے قیامت نہ ٹوٹے تو بندی کا نام بدل دیں۔

حکیم جمالی نے سانس لینے کا موقع دیا، بولا۔ "واقعی حسین لڑکا ہے، نرم و نازک۔۔۔ تعریف کی جائے کم ہے۔"

حاجی صاحب جھٹ لپکے۔ "ماشاءاللہ! ناچیز کی نگاہ کہتی ہے کہ اسے ناچ گانے سے بھ ہے۔ آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ وہ کیسا محظوظ ہو رہا تھا، کیسے پرجوش انداز میں داد د تھا۔۔۔" تعریف کرتے کرتے وہ کچھ دیر مراقبے میں چلے گئے، کچھ دیر بعد سر اٹھا کر ٹھ ٹھہرے لہجے میں عامل ظہوری شاہ سے مخاطب ہوئے۔ "شاہ صاحب! میں قربان واری۔۔۔ میں تو یہ سمجھوں کہ اس کے ستارے، ہم "جتی ستی" لوگوں سے ملتے ہیں۔ ذرا اس کے ستارے ملاحظہ کیجئے گا۔۔۔"

ظہوری شاہ نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا اور رخصت کی اجازت چاہی۔ حکیم جمالی کے ہاتھوں میں ہاتھ دیئے۔ پچھلے دروازے سے بابا ہنگا ثانی کے مزار پہ آگیا۔ ملنگ بیٹھے بھنگ ترنگ کر رہے تھے۔ کچھ دیر وہ دونوں عرس کے انتظامات اور دیگر مسا گفتگو کرتے رہے، بھنگ سردائی چکھی اور وہاں سے ڈیرے پہ آگئے۔ کچھ ملازم کشتوں دواؤں کی تیاری میں لگے ہوئے تھے۔ یہ اپنی باتوں کی پٹاری کھول کر بیٹھ گئے۔

موضوع سخن شایان کے علاوہ اور کیا ہو سکتا تھا۔

زندگی کرنے کا یارو یہ بھی اک دستور ہے
وہ میرے امکان میں ہے پھر بھی مجھ سے دور ہے

☆☆☆

"شمسہ" مس عاشی کے لئے چکنی مچھلی بنی ہوئی تھی۔ جو دسترس میں ہوتے ہو گرفت میں نہیں آتی۔ بڑی اور چھوٹی بہن کا رشتہ دن بہ دن بڑا مضبوط ہوتا جا رہا تھا۔ وہ بہت خیال رکھتی تھی۔ کھانا، پلانا، نہلانا، سلانا۔۔۔ بہت کم اسے اکیلا چھوڑتی، اس کی کے لئے بہت سا سامان تھا۔ کھیلتی، کھاتی پیتی، میوزک سنتی اور دوا پی کر سو جاتی۔ نہ کبھی اداس ہوئی یا ضد کی۔ فرمانبردار اور معصوم سی۔۔۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے حکیم جمالی نے اسے بالکل بکری بنا دیا ہے، بچہ بنا دیا ہے۔ کبھی عجیب عجیب سی فرمائشیں کرنے لگی "مجھے گڑیا چاہیے، میں اس کا بیاہ کروں گی۔ آپ گڈے والی بن جائیں۔ کبھی کھلونے ما



چکی چولہا، دہی بلونے کی مدھانی، رنگین گوٹے والے کپڑوں کی کترنیں، چھوٹے چھوٹے زیور۔ کبھی کبھی عاشی اس کی فرمائشیں پوری کرنے سے عاجز آجاتی، روٹھ جاتی تو وہ منانے بیٹھ جاتی۔ کھانا سامنے دھرا رہتا اور وہ ویڈیو، ٹیلی ویژن پہ کارٹون کی ضد کرتی، دن بہ دن اس کا بچپنا اور الہڑپن جیسے جوان ہوتا جا رہا ہو۔ اس کی یہ کیفیت دیکھتے ہوئے مس عاشی نے عامل ظہوری شاہ کو بلایا اور ساری "روداد الم" اسے کہہ سنائی۔ اس نے بڑے انہماک سے ساری بات سنی، بڑا گہرا غور و خوض کرنے کے بعد بولا۔

"میرا خیال ہے، اس کی یادداشت بری طرح متاثر ہوئی ہے۔ اس کا ذہن ماضی کی جانب سفر کرتے ہوئے، بچپن کی حدود میں ٹھہر گیا ہے۔۔۔"

"شاہ جی! بیس اکیس برس کی جوان لڑکی تین چار برس کی بچی کا ذہن۔۔۔ یہ تو بڑی پریشانی کی بات ہے۔ دیکھیں نا! میں اب اپنے کام دھندے کو چھوڑ کر اس کے ساتھ گڈی گڈے کا بیاہ رچانے سے تو رہی۔۔۔" وہ بڑی مایوسی کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔ "پہلے ہی بہت رقم خرچ کر چکی ہوں، مجھے تو اب یہ دکھائی دے رہا ہے کہ اس ننھی بچی کی تعلیم و تربیت پہ مزید خرچ بھی کرنا پڑے گا اور جب یہ ذہنی طور پر اٹھارہ برس کی ہوگی تو جسم عمر سے بوڑھی خچر ہو گئی ہوگی۔ یہ سراسر، سردردی اور گھاٹے کا سودا ہے۔"

مس عاشی کی یہ توجیہہ سن کر ظہوری شاہ ہلکے سے مسکرا دیا۔

"میں مصیبت میں پڑی ہوں او آپ ہنس رہے ہیں۔۔۔؟" وہ خفگی کا اظہار کرتے ہوئے ناراض سی دکھائی دینے لگی۔

"بھئی، ہنس نہیں رہا، صرف مسکرا رہا ہوں۔۔۔ ہنسنے اور مسکرانے کا فرق تو آپ جانتی ہیں۔۔۔؟"

وہ بھی ہنس دی، پھر التجا بھرے انداز میں کہنے لگی۔ "شاہ جی! آپ ذرا اسے مل لیں۔ اس کی حالت دیکھ لیں، بات چیت کریں، اس کا ماتھا پڑھیں اور پلیز! پھر کوئی حل نکالیں۔۔۔ اس کی تھوڑی سی بھی حالت درست ہو جائے۔ تو اسے کہیں نہ کہیں نکالنے میں دیر نہیں کروں گی۔ بلکہ ایک دو پینڈو آسامیاں موجود ہیں۔ جن سے خاصی رقم نکلوائی جا سکتی ہے۔۔۔"

وہ دونوں جب اس کے کمرے میں دبے پاؤں داخل ہوئے تو وہ پلنگ پہ آلتی پالتی مارے، بڑے چاؤ اور اطمینان سے اپنی گڑیا کا بناؤ سنگھار کر رہی تھی۔ اس کے سر پہ آن کھڑے ہوئے تب بھی اس کی محویت نہ ٹوٹی۔ آگے بڑھ کر مس عاشی اس کی گڑیا کا گھونگھٹ درست کرتے ہوئے بولی۔

"شمسہ رانی! دیکھو تو' کون آئے ہیں---یہ تمہارے پیارے ابو ہیں۔"

وہ گڑیا چھوڑ' اپنے ابو کو بٹ بٹ دیکھنے لگی۔ اچانک وہ اسپرنگ کی مانند اچھلی اور "میرے ابو آئے' میرے ابو آئے" کہتی ہوئی ظہوری شاہ سے لپٹ گئی---ابو کے لفظ اور رشتے نے ظہوری شاہ کے کانوں میں توپ کا دھماکا تو کر دیا لیکن اس کا اس طرح سینے سے چمٹنا ایسے لگا جیسے بجلی کی تاروں کی لپیٹ میں آگیا ہو۔ یہ سب کچھ اتنا اچانک ہوا کہ سنبھلنے کا موقع ہی نہ ملا۔ پہلی رات حکیم جمالی کے ڈیرے' اجتماعی زیادتی کے شغل میں یہ بھی تو اس سے لپٹا رہا تھا۔ اس لپٹ اور اس لپٹ میں کچھ نمایاں فرق بھی تھا۔ وہاں وہ اسے محض عورت سمجھ کر لپٹا تھا اور یہ یہاں اسے ابو کہہ کر لپٹی تھی۔ یہ دھماکا اسی لپٹا لپٹی کا ردعمل تھا۔ اسے گمان تک نہ تھا کہ وہ اسے ابو تک کہہ دے گی--- ہلکی سی ضمیر کی بیداری کو اس نے شیطنت بھری مسکراہٹ کی بوجھل میں دبا دیا۔ بات تو حیا' غیرت اور ضمیر کی ہوتی ہے اور یہ صفتیں رزق حلال اور خوفِ اللہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ پانی ہی ناپاک اور گندلا ہو تو چائے' چینی کیا لذت اور مہک پیدا کرے گی۔ احساس کی باریکیوں' جذبوں کی پاکیزگیوں اور حقیقتوں کی سچائیوں کے منکر یہ بے نم و نظر پتھر دل کیا جانیں کہ رگِ گل صرف اک نظر سہو سے بھی ریشہ ریشہ ہو سکتی ہے' انسان اور اس کا دل' پھر بھی بڑی چیز ہے--- بادل نخواستہ اسے علیحدہ کرتے ہوئے پلنگ پہ بٹھایا' پاس پٹی پہ بیٹھے ہوئے بڑے دلار سے پوچھا۔

"کیا حال ہے' میری بے بی کا---؟"

"ہم اچھے ہیں' باجی ہمارا بہت خیال رکھتی ہیں۔ کھلونے اور اچھی اچھی چیزیں لا کر دیتی ہیں---" پھر روٹھتے ہوئے منہ پھلا کر شکایت سی کرنے لگی۔ "ہم باجی سے تھوڑے سے ناراض بھی ہیں۔ یہ ہمیں پارک میں سیر کرانے اور برگر کھلانے نہیں لے جاتیں---"

"بھئی' باجی تمہاری بہت مصروف رہتی ہیں۔ ہم لے کر جائیں گے اپنی بے بی کو اور ٹافیاں' آئس کریم' برگر کھلائیں گے--- شاباش! چلو' تیار ہو جاؤ---"

"اچھا---" وہ تالیاں بجانے لگی۔ "باجی! مجھے جلدی سے نئے کپڑے پہناؤ' بال بناؤ' ہم ابو کے ساتھ پارک جائیں گے' آئس کریم کھائیں گے---"

مس عاشی' باپ بیٹی کا تماشا دیکھ رہی تھی' بولی۔ "اچھا' تم جلدی سے نہا لو۔ میں تمہارے کپڑے تیار کرتی ہوں۔"

وہ بھاگ کر غسل خانے میں گھس گئی' یہ دونوں ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ مس عاشی سگریٹ سلگاتے ہوئے کہنے لگی۔



"دیکھ لیا' شاہ جی---؟"

"ہاں' دیکھ لیا--- اور سن بھی لیا۔" وہ قدرے خفا ہوتے ہوئے پوچھنے لگا۔ "مس عاشی! تم نے میرا اور اس کا جو رشتہ قائم کیا ہے۔ اس کو میں کیا سمجھوں؟ کم از کم تم سے مجھے یہ امید نہ تھی--- تم سب کچھ جانتی بھی ہو اس کے باوجود--- تم نے ایسا کیوں کیا؟"

وہ معذرت بھرے لہجے میں شرمندہ سی ہو کر کہنے لگی۔ "شاہ جی! بخدا' یہ سب کچھ بوکھلاہٹ اور غیر ارادی طور پر سرزد ہو گیا۔ اس وقت اچانک میرے منہ سے نکل گیا' بعد میں مجھے شدت سے اپنی حماقت کا احساس ہوا--- میں عرض کر رہی تھی" شاہ جی! آپ نے اس کی یہ حالت ملاحظہ کر لی۔ مجھے تو لگتا ہے' میری رقم ڈوب گئی---"

"ابھی میں مایوس نہیں ہوا' میڈم! جو کچھ میں نے دیکھا ہے' یہ کچھ حوصلہ افزا نہیں ہے پھر بھی ہمیں انتظار اور صبر سے کام لینا ہو گا--- ایک بات میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ اس کے ستارے تمہارے حق میں فی الحال کچھ اچھی پوزیشن میں نہیں ہیں---"

وہ شمسہ کے لئے الماری سے کپڑے نکالتے ہوئے پوچھنے لگی۔ "شاہ جی! یہ ستارے اپنے راستے بدل بھی سکتے ہیں یا---؟"

"بالکل' یہ اپنے راستے اور برج بدلتے رہتے ہیں۔ اسی لئے تو صبر اور انتظار کے لئے مشورہ دیا ہے---" ظہوری شاہ نے جواب دیا۔

"باجی! میں نہا چکی---"

دونوں کی نظریں باتھ روم کی جانب اٹھیں تو سوکھے کاٹھ کی مانند انہیں جیسے آگ سی لگ گئی۔ آنکھیں' پلکیں' ابرو' ان کے جسم جیسے حیرت اور اچنبھے کی تمازت سے جھلس گئے۔ وہ بے دھڑک غسلخانے کے دروازے پہ مونالیزا سی مسکراہٹ لئے کھڑی تھی--- حیرت شاید وقت کے تھم جانے کا نام ہے۔ لمحے ہوں یا صدیاں' حیرت کی کیفیت' رواں آبِ جُو پہ جمی ہوئی جامد و ساکت سبز کائی کی طرح ہوتی ہے۔ وہ دونوں منہ کھولے' پھٹی پھٹی آنکھوں سے حیرت کی تصویر بنے اس "وینس" کو دیکھ رہے تھے۔ وہ معصوم بچوں کی مانند اٹھلاتی ہوئی ان کے قریب آگئی۔ عورت کیسی بھی ہو' مستور ہو تو دیوی لگتی ہے اور لباس سے بے نیاز ہو تو ذوق جمال کو مجروح کرتی ہے۔ اس روپ کو دیکھ کر ان بدروحوں کو بھی تریلی سی آگئی' دماغ مفلوج سے تھے۔ جانے مس عاشی کو کہاں سے عقل آگئی' جلدی جلدی سے الٹے سیدھے کپڑے پہنائے اور پھر سنگار میز کے آگے بٹھا کر دونوں دوسرے کمرے میں آگئے۔

"شاہ جی! خدا کے لئے فوری طور پہ کچھ کریں' مجھے تو یہ معاملہ مزید بگڑتا ہوا دکھائی دے رہا

ہے---" مس عاشی کا لہجہ فکر مند تھا۔

"ظہوری شاہ اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے پوچھنے لگا۔ "نشہ سگریٹ وغیرہ ہے یا وہ بھی بھول چکی ہے---؟"

"سادے، بھرے ہوئے، سب پی لیتی ہے اور نہ دو تو مانگتی نہیں--- البتہ دوا کے بے چین سی رہتی ہے۔"

ظہوری شاہ نے جواب دینے کی بجائے اک لمبی سی "ہوں" کی، پھر جیسے کچھ سوچتے ہو ٹیلی فون کی جانب متوجہ ہو گیا۔ اس کے بلانے پر حکیم جمالی نے پندرہ منٹ سے زیادہ لگائے۔

"خیریت---؟" اس نے آتے ہی استفسار کیا۔

ظہوری شاہ نے پاس بٹھاتے ہوئے جواب دیا۔ "پچاس فیصد---"

"آپ لوگ ایک سو ایک فیصد کھل کر بات بتائیں، پہیلیاں نہ بجھوائیں---"

"حکیم صاحب! ہماری پریشانی کا باعث یہ لڑکی ہے، بلکہ یوں سمجھیں کہ یہ جب س ہے، ہم مسلسل اذیت میں مبتلا ہیں---"

ظہوری شاہ نے اسے سگریٹ پیش کرتے ہوئے کہا۔ "یار! اس لڑکی کی یادداشت ا ناقص ہے، اس کا ذہن پانچ چھ سالہ بچی کا ہے اور ہر ممکنہ کوشش کے باوجود ہم اسے حالت میں نہیں لا سکے--- یا تو یہ شروع سے ہی ایسی تھی یا پھر اوور ڈوز کی وجہ سے ہے۔ ظاہر ہے، میڈم نے اسے جس مقصد کے لئے حاصل کیا تھا۔ اس حالت میں وہ مقص نہیں ہو سکتا۔ بلکہ الٹا رقم ڈوبنے کا رسک بھی موجود ہے۔ تمہیں تو اس لئے زحمت دی۔ ایک تو تم حکیم ہو، دوسرے یہ لڑکی تمہارے ہی اڈے پہ لائی گئی تھی۔ اسکے متعلق اگر۔

حکیم جمالی نے بات پوری ہونے سے پہلے ہی بولنا شروع کیا۔ "جہاں تک مجھے عل استاد قربان جب اسے لایا تھا تو اس وقت بھی یہ شدید نشے اور جسمانی طور پر بڑی بری حالت میں تھی۔ اس کا جسم بتا رہا تھا کہ یہ بری طرح جنسی تشدد کا شکار ہوئی ہے۔ جب میرے ڈیرے پہ رہی، اس نے چند بار آنکھیں ضرور کھولیں لیکن مکمل طور پہ ہوش میں آئی۔ دو چار بار عالم مدہوشی میں ہی بیمار ماں کی دوا اور پیسوں کے متعلق بڑبڑاتی رہی--- ہاں، اس کے پاس پرس ضرور تھا مگر خالی---"

میڈم بولی۔ "آپ کی گفتگو سے تو یہی نتیجہ نکلتا ہے یہ شروع سے ہی ایسی تھی---"

"ہاں، آپ یہ کہہ سکتی ہیں اور اسی لئے شاید اس نے اپنی یہاں موجودگی کے بار۔



کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا--- باقی رہی آپ کے نقصان کی بات، تو یہ مسئلہ نہیں۔ آپ کی رقم محفوظ ہے۔ جب چاہیں، حاضر ہے--- آپس داری کی بات ہے---"

میڈم، ظہوری شاہ کو ٹٹولتی ہوئی پوچھنے لگی۔ "اب آپ فرمائیں، کیا کیا جائے---؟"

ظہوری شاہ نے ٹھوڑی کھجاتے ہوئے جواب دیا۔ "حکیم صاحب نے تو بات صاف کر دی ہے--- جو ہوا سو ہوا، آپ چاہیں تو رقم واپس لے لیں اور نہ چاہیں تو لڑکی پاس رکھیں اور کچھ اور صبر کریں---"

باتیں ہو رہی تھیں کہ دروازہ پہ تھپ تھپ ہونے لگی، شمسہ چلا رہی تھی۔

"ابو، ابو! میں تیار ہوں---"

سب ہی ایک دوسرے کے منہ کی طرف دیکھنے لگے۔ ظہوری شاہ نے میڈم کو دروازہ کھولنے کا اشارہ کیا۔ "ایسے میں کوئی چھم سے جو آجائے تو کیا ہو" والی کیفیت تھی۔ اندر آتے ہی وہ ظہوری شاہ کی گود میں ڈھیر ہو گئی اور بولی۔ "ابو! ہم تیار ہیں--- اٹھئے، چلئے نا---!"

ظہوری شاہ محجوب سا اسے گود سے اٹھانے کی اپنی سی کرنے لگا۔ تبھی میڈم اٹھ کر پاس آئی۔

"آؤ، بے بی! اپنے انکل سے ملو---"

اب حکیم جمالی کی باری تھی۔ ابو کا لفظ وہ پہلے ہی سن چکا تھا، اپنے بارے میں انکل کا لفظ سن کر اس کی حالت بھی ظہوری شاہ جیسی ہو گئی۔ عجیب خجالت آمیز مسکراہٹ سے اس نے شمسہ کی جانب دیکھا۔

"کیسی ہو، بے بی---؟" اس نے بڑے اوپر سے انداز سے رسمی طور پر پوچھا۔ تصور میں وہ سین ابھر آئے۔ جن کی شوٹنگ، تھری ڈی ہائی سپیڈ موشن کیمرے سے ہوئی تھی۔ سر جھٹک کر اس نے اپنے حواس کو تصور کے آزار سے آزاد کرانے کی کوشش کی۔

"ابو! چلئے نا---!" وہ ضد کرنے لگی۔

مس عاشی نے اسے دوسرے کمرے میں تقریباً "دھکیلتے ہوئے کہا۔ "بے بی! اب ہم نہیں جا سکتے--- کل چھٹی ہے، پارک میں خوب رونق ہو گی، کل چلیں گے---"

دروازہ بند ہوتے ہی حکیم جمالی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہنے لگا۔ "ظہوری شاہ! یہ لڑکی کہیں ڈرامہ تو نہیں کر رہی---؟"

اس سے پیشتر کہ ظہوری شاہ کوئی جواب داغتا، میڈم عاشی کہنے لگی۔

"نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ پہلے مجھے بھی شک گزرا تھا۔ مگر ایسا نہیں۔ میں نے اپنے

خفیہ وسائل سے اس کی مکمل نگرانی کی ہے' اس معروضے کو خارج از بحث سمجھیں۔۔۔"
عامل ظہوری شاہ کے اندازے کے مطابق اب وہ وقت آ گیا تھا۔ جس کا اسے انتظار
اس کے علم یا خیال کے مطابق یہ لڑکی اس کے لئے بڑی سعد تھی' اس کے لئے وہ اپنے دل
ایک نرم گوشہ محسوس کرتا تھا۔ جسے شاید کوئی نام نہیں دیا جا سکتا تھا۔ محبت' ہمدردی' غر
محض؟۔۔۔" ویسے تو کھچڑی مس عاشی نے بھی دھری ہوئی تھی جس کے بارے میں یقین
کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ پکے یا نہ پکے لیکن جمالی کا مچھلی پلاؤ "تقریباً" تیار تھا' بس قاب
نکالنے کی دیر تھی۔ نکالنے کے لئے وہ ہاتھ کس اور کے استعمال کرنا چاہتا تھا اور یہ ہاتھ
جمالی اور مس عاشی کے ہی ہو سکتے ہیں۔۔۔ خاموشی گہری دھند کی مانند چھائی ہوئی تھی۔ ت
سگریٹ پھونکنے کے ساتھ ساتھ اس مسئلے کے جوہڑ میں اترے ہوئے' سوچوں کے سنگھا
کی جڑوں سے الجھے ہوئے تھے۔ تینوں ہی کی کوشش تھی' کہ کوئی قابل قبول حل کا کنول
لگ جائے۔

"کیا سوچ رہے ہیں حکیم صاحب؟"

میڈم کی آواز اس خاموشی میں ابھری تو حسب عادت داڑھی کھجاتے ہوئے حکیم صا
بولے۔

"اس کا حل سوچ رہا ہوں۔۔۔ اس کی موجودہ حالت ہمارے لئے پریشانیاں پیدا کر
ہے' اسے باہر نکالا نہیں جا سکتا' یقیناً" اس کی گمشدگی کی رپوٹ کسی تھانے چوکی میں بھی
لواحقین بھی تلاش میں سرگرداں ہوں گے۔ یہ ایک نفسیاتی اور منشیاتی کیس ہے' کسی ڈا
اسپتال دکھانا بھی رسک ہے مگر اندر بھی اسے لمبے عرصے تک باندھ کر نہیں رکھا جا سکتا۔
قابل عمل اب صرف دو حل ہیں ایک یہ کہ اسے کہیں آگے بڑھا دیا جائے اور اپنی رقم و
کر لی جائے اور دوسرے اسے کسی ویران جگہ لے جا کر چھوڑ دیا جائے۔ کوئی استاد قربان
مل گیا تو پھر ہمارے جیسوں کے کسی اڈے پہ پہنچ جائے گی اور اگر کوئی شریف آدمی مل گیا
دارالامان' اخبار کے دفتر یا اسپتال' تھانے پہنچ جائے گی۔ اس کے علاوہ اور کوئی حل
آپ۔۔۔"

ظہوری شاہ نے اپنی خاموشی توڑی' بولا۔ "سیدھی سیدھی بات تو یہی ہے جو آپ
بتائی ہے' باقی سارے حل رسکی ہیں جو ہم میں سے کوئی بھی نہیں چاہے گا۔۔۔"
مس عاشی نے ایک آخری کوشش کے طور کہا۔ "آپ کوئی عمل کریں' یہ معمولی
آپ کے لئے کیا مشکل ہے۔۔۔"



"میڈم! آپ کئی بار کہہ چکی ہیں اور میں بھی کئی مرتبہ عرض کر چکا ہوں کہ اس وقت اس
کے ستارے صحیح راستے پہ نہیں ہیں۔ میں اس کے ہاتھ کی لکیریں دیکھ سکتا ہوں مگر اس کا مکمل
زائچہ تیار نہیں کر سکتا۔ جمع' تفریق' تقسیم کے لئے اعداد کی ضرورت ہوتی ہے۔ نام' والدہ کا
نام' تاریخ پیدائش' بنیادی چیزیں ہیں جن میں سے ایک بھی موجود نہیں' محض ہاتھ کے پرنٹ
سے مکمل اور صحیح زائچہ نہیں بن سکتا۔۔۔ ہاں' سفلی ذرائع سے کچھ ہو سکتا ہے مگر اس کے
لئے بھی مجھے اس کے تالو کے بال چاہئیں' اس کے ایام کے خون سے نقش لکھنا پڑے گا' نتیجے کی
گارنٹی پھر بھی نہیں دے سکتا۔ یہ بھی صرف کوشش ہو گی لیکن ہم یہ ساری سر دردی مول
کیوں لیں' ہمیں کالے کتے نے کاٹا ہے؟۔۔۔ کسی سے پیسے کھرے کر کے آگے بڑھا دیں یا
جیسے حکیم صاحب نے کہا ہے' رقم واپس لے کر مال ان کے سپرد کر دیں۔ قصہ ختم۔۔۔"
شکاری اپنا دام بچھا چکا تھا۔ دانہ پانی تیار تھا' بس شکار پھنسنے کی دیر تھی۔
میڈم بولی۔ "حکیم صاحب! آپ فرمائیں۔۔۔؟"
"میڈم! پہلے بھی عرض کیا ہے۔۔۔ آپس داری کی بات ہے' آپ اپنی رقم واپس لے
لیں اور لڑکی واپس کر دیں۔ میں جانوں اور لڑکی۔۔۔ آپ پریشان نہ ہوں اور نہ ہی کوئی رسک
لیں۔"

"رقم کا مسئلہ اتنا اہم نہیں' اہم یہ بات ہے کہ اس کا کیا ہو گا۔۔۔ نہ جانے کیوں مجھے اس
سے ہمدردی اور انس سا ہو گیا ہے۔ مجھے رقم ملے یا نہ ملے' میں چاہتی ہوں کہ یہ بیچاری جو
بھوگ چکی ہے وہی اس کی بربادی کے لئے کافی ہے۔ مزید یہ کہیں خراب نہ ہو۔۔۔"
حکیم جمالی نے جواب دیا۔ "پھر آپ ہی اس کا کوئی حل اپنے ذہن رسا سے نکالیں۔۔۔"
مس عاشی' حکیم جمالی کو ٹٹولتے ہوئے پوچھنے لگی۔ "اچھا' یہ بتائیں کہ اگر یہ لڑکی آپ کو
واپس کر دی جاتی ہے تو اس کا کیا کریں گے۔۔۔؟"
بغیر سوچے سمجھے اس نے جواب دیا۔ "کرنا کیا ہے' وہی ہو گا۔ جو اس سے پہلے ہو چکا ہے۔
اس قسم کی منشیات کی عادی لڑکیاں جو گھر بار سے فارغ ہوں' بھلا اور کس مصرف کی رہ جاتی
ہیں۔۔۔ دوست یار چار دن عیش کریں گے۔ پھر کہیں آگے ٹہلا دیں گے۔۔۔ ہم سب اس
حمام میں ننگے ہیں' سب ہی مجرم ہیں' فرق صرف نوعیت کا ہے۔ اب میں اس سے شادی کرنے
سے تو رہا' بہن بیٹی کی جگہ تو نہیں دے سکتا۔۔۔ نا!"
مس عاشی تلخ تند جواب پا کر ٹھنڈی ٹھار ہو چکی تھی۔ عامل ظہوری شاہ مسکرایا' بولا۔
"یار' حکیم! بہن بیٹی اگر نہیں بن سکتی تو بیوی تو بن سکتی ہے۔ لوگ طوائفوں سے بھی تو

شادی کر لیتے ہیں اور یہ تو تم کہہ ہی چکے ہو کہ ہم سب حمام میں ننگے ہیں---"

حکیم جمالی ابھی تک بھاگتے گھوڑے پر سوار تھا' اسی لہجے میں بولا۔ "عامل صاحب! سرے سے رشتوں کا قائل ہی نہیں۔ یہاں ماں تب ماں ہے اگر بیٹا کنگن پہناتا ہے۔ باپ باپ ہے اگر بیٹا کماؤ ہے اور بیٹی تب بیٹی ہے اگر حجاب میں ہے اور بیوی! یہ تو پھوکٹ کا ہے۔ خاوند اگر روٹی ہانڈی' کپڑا' بچہ نہ دے تو بیوی دوسرے روز عدالت چڑھ جاتی ہے۔ آ آدھ اگر ایسا نہ بھی کرے تو اس کی کوئی مجبوری' معذوری ہوتی ہوگی۔ ماں باپ کی عزت' لحیا' دینی تعلیم یا کوئی اور وجہ ہو سکتی ہے ورنہ باقی سب ایک جیسے ہی ہیں۔ میرے گورو مہار نے مجھے یہی سبق دیا تھا کہ بیٹا! اس سنسار میں سب پیٹ پاپی ہیں' رشتے ناطے سب پیٹ ہیں اور ناری نرکھ کی آگ ہے۔ اسے صرف اتنا چاہو جتنا چلم میں انگارہ چمکتا ہے' دامن چھپاؤ گے تو بھسم کر دے گی--- کوئی بندھن ایسا نہیں جو ٹوٹنے کے لئے نہ ہو---" تھو سی خاموشی کے بعد وہ شمسہ کے متعلق بات کرتے ہوئے بولا۔ "ظہوری شاہ تم اسے اپنے کیوں نہیں رکھ لیتے' کوئی بھی رشتہ قائم کر لو---"

شکاری' شکار پھانس چکا تھا۔ وہ حالات ہی ایسے پیدا کر چکا تھا کہ حکیم جمالی اور مس نے خود ہی شمسہ اس کے حوالے کر دی' بیس ہزار نقد ادا کر کے اسی شام اس نے جعلی نکا تیار کروایا اور شمسہ کو اپنے فلیٹ پہ لے آیا۔

☆☆☆



نین تارا کئی دنوں سے شایان کی راہ دیکھ رہی تھی۔ پانچ روز بعد جمعہ کے دن اس کی اٹھارویں سالگرہ تھی' یہی دن شایان کی سالگرہ کا بھی تھا۔ دونوں نے ایک ہی دن' دو گھنٹے کے وقفے سے جنم لیا تھا' یعنی وہ صرف ایک سو بیس منٹ نین تارا سے بڑا تھا۔ بارہ تیرہ برس سے دونوں اپنی سالگرہ' یہیں' اسی گھر میں مناتے چلے آ رہے تھے۔ شایان چھ بہنوں کا اکیلا بھائی اور نین چار بھائیوں کی آنکھوں کا اکلوتا تارا! وہ پھوپھی زاد' یہ ماموں زاد۔ بچپن بھی اکٹھا گزرا تھا' مستقبل بھی ساتھ ساتھ گزارنے کا وعدہ تھا۔ کھاتے پیتے' کاروباری گھرانے تھے۔ سالگرہ پہ خوب رونق اور دھاچوکڑی ہوتی۔ شیخوپورے سے یہ سارے لاہور آ جاتے۔ اس طرح مل ملا بھی لیتے اور بچوں کی سالگرہ' خوشیاں بھی دیکھ لیتے۔ اب تک ان کے ہاں یہی سلسلہ چلا آ رہا تھا--- شایان کے مستقل لاہور آ جانے سے نین تارا کو یہی امید بندھی کہ اب اس کا باقاعدہ آنا جانا لگا رہے گا۔ پچھلے برس' سالگرہ کے موقع پہ وہ نہیں آیا تھا' شاید وہ اپنے علاج کے سلسلے میں مصروف اور پریشان تھا۔ اس کے بغیر سالگرہ کا کیا مزہ آتا؟ اس دن وہ آنسوؤں کی پگھلتی ہوئی گرم گرم موم سے تکیئے کو بھگوتی رہی' اس کی سوچوں کی گونج اکلاپے کی تنہائی اور یرانی میں چیختی چلاتی رہی۔ لاہور میں آدھے گھنٹے کے فاصلے پہ ہونے کے باوجود وہ اس سے ہت دور تھا۔ ٹھیک ہے' وہ مارکیٹ کے معاملات اور پڑھائی یا اپنی بیماری کی وجہ سے مصروف اور پریشان ہوگا مگر ایسا بھی کیا کہ چند لمحوں کے لئے آ بھی نہ سکے اور اصولاً" تو اسے اپنے ماموں کے ہاں ہی رہنا چاہیے تھا۔ یہاں کوئی اجنبیت یا غیروں والی بات نہیں تھی۔ یہاں سب ہی س سے محبت اور پیار کرتے تھے--- پچھلی بار جب وہ شناختی کارڈ کے فارم دینے آیا تھا تو نین تارا نے اسے سالگرہ یہاں منانے کی تاکید کر دی تھی۔ اب سالگرہ میں پانچ دن باقی تھے اور شایان نے ٹیلیفون کیا' نہ کوئی چکر لگایا۔ یہی سوچتے سوچتے' اداس سی وہ ان تحفوں کو دیکھنے لگی۔ جو وہ اس کے لئے لائی تھی۔ اس کی پسندیدہ پرفیوم' امپورٹڈ جوگر' جوگنگ سوٹ اور

امریکن روسٹڈ کاجو---'

بدھ کی شام سخت حبس میں اک جاں افروز تازہ ہوا کے جھونکے کی مانند وہ آ گیا لیکن اِ
اجنبی کی مانند' پہلی نظر میں اسے کوئی پہچان ہی نہ پایا۔ سیٹ کیے ہوئے بال' مونچھیں غائب
شوخ رنگ کی سلکی شرٹ' آف وائٹ پینٹ' بدلا بدلا سا چہرہ۔ بہار کی رُت میں خوشبوؤں
بوجھل کسی مست خرام جھونکے کی مانند۔ سب اسے دیکھتے ہی رہ گئے۔ منہ سے کوئی کیا
اندر ہی اندر سب ہی اِک عجیب سی کشمکش میں مبتلا تھے۔ مونچھیں منڈھوانے سے منہ
ہوبہو ماش کی دال کی مانند سفید ملائم ملوک سا نکل آیا تھا۔ قدرتی آپس میں ملے ہوئے اَ
موچنے سے چن کر علیحدہ کر دیئے گئے تھے' چہرے پہ نامعلوم سا میک اپ صاف نظر آ رہا
تھوڑی دیر وہ ممانی کے پاس بیٹھا باتیں کرتا رہا اور ممانی باتیں تو کیا کر رہی تھیں' بٹ بٹ
کے زنانوں جیسے حلیے کو دیکھ دیکھ کر اندر ہی اندر کڑھ رہی تھیں--- چائے پانی کے بعد نین
اسے لاؤنج میں گھسیٹ لائی اور چھوٹتے ہی بولی۔ "میں تم سے بہت ناراض ہوں---"

"بالکل ٹھیک--- اگر تم ناراض نہ ہوتیں تو میں تمہاری اس حماقت پہ تم سے ناراض
جاتا---"

"کیا مطلب---؟" وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولی۔

"---مطلب یہ کہ تمہیں مجھ سے ناراض ہونا چاہیئے تھا--- دیکھو' نا! پچھلی سال
میں غائب تھا' پھر لاہور رہتے ہوئے بھی بہت کم یہاں آیا۔ اب اس سالگرہ پہ بھی میں
پریشان کر رہا ہوں۔ تمہیں ناراض ہونے کا پورا پورا حق ہے---" وہ سرخم کرتے ہو
لگا۔ "جو چاہو' سزا دو۔ میں واقعی بہت غیر ذمہ دار ہوں---"

نین تارا نے ہلکے سے اس کے بال پکڑ کر اس کا سر اوپر اٹھایا۔ "مجھے "لوسیاں" لگا
کوشش مت کرو' میں سب سمجھتی ہوں۔ لاہور آ کر تم بہت بدل گئے ہو اندر سے بھی ا
سے بھی--- فیشن کرنا آ گیا ہے' باتیں بنانی آ گئی ہیں اور ماشاء اللہ ستانا اور تڑپانا بھی---

وہ اُٹھ کر شیشے کے سامنے اپنے بال درست کرنے لگا۔ بولا۔ "تم نے میرے بال خر
دیئے' گویا تم نے مجھے سزا دے دی--- اب راضی ہو جاؤ اور بتاؤ کہ سالگرہ پہ تمہیں
دوں---؟"

"مجھے کسی تحفے کی ضرورت نہیں--- بس تم اپنا یہ حلیہ درست کر لو' میرے
تحفہ ہو گا۔"

وہ وہیں شیشے کے سامنے کھڑے کھڑے اپنے سراپے پہ نظر ڈالتے ہوئے بو



"حلیہ--- کیا ہوا ہے میرے حلیئے کو؟--- میرا خیال تھا' تم تعریف کرو گی مگر تم الٹا یہ کہہ رہی
ہو کہ میرا حلیہ درست نہیں---" ذرا توقف کے بعد پھر کہنے لگا۔ "لاہور آ کر بھی تم پینڈو کی
پینڈو ہو---"

وہ اس کے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔ "تم نے مونچھیں کیوں صاف کروا دیں' ان
کے ساتھ تم کتنے سمارٹ دکھائی دیتے تھے اور یہ ابرو بھی درمیان سے اکھاڑ دیئے۔ آپس میں
ملے ہوئے ابرو تو بڑے نیچرل اور خوش بختی کی علامت ہوتے ہیں اور مرد کے چہرے پہ
مونچھیں تو مردانگی کی نشانی ہوتی ہیں---"

سیلاب کے ریلے کی زد میں کچی دیوار کی مانند شایان دھب سے صوفے پہ ڈھے گیا۔
لحوں پہلے کی بشاشت' بشرے پہ بسنت کی زردی کی طرح کھڈ گئی زبان پہ چپ جمی اور تھوڑی
سینے سے ٹِک گئی۔ مرد چاہے مردانہ صفات سے محروم ہی کیوں نہ ہو' زبان سے اعتراف کرتے
ہوئے کتراتا ہے--- مرد--- مرد--- مرد---" بے ہنگم اور صوتی لحاظ سے بے سُرا یہ لفظ
ہتھوڑے کی طرح اس کی کنپٹیوں پہ پڑنے لگا۔ سارے جسم کا لہو کھنچ کر دماغ میں جمع ہو گیا'
آنکھوں کا نیلگوں سمندر سرخ ہو گیا۔

ستاروں کا حساب' ریکھا کتاب' زائچہ نصاب دیکھ پڑھ کر عامل ظہوری شاہ نے پچاس فیصد
سے اوپر' کامیابی کی نوید سنا کر اسے حکیم جمالی کے حوالے کر دیا تھا۔ حالات' تفصیلات اور
جسمانی معائنے کے بعد حکیم جمالی نے بھی پچاس فیصد سے زیادہ کامیابی کا مژدہ سنایا تھا۔ شفا
منجانب اللہ تعالیٰ اور بندے کی کوشش کو بنیاد بنا کر بتیس ہزار صرف ادویات' مقویات' حلویات
اور کشتہ جات کا خالی خرچہ طے پایا۔ محنت معاوضہ "حساب دوستاں در دل" کے مطابق رقم کی
ادائیگی مرحلہ وار پانچ پانچ ہزار کی چھ اقساط میں طے پائی۔ اِدھر "حق دوستی" کے اظہار کے طور
پر ٹاپ فلور پہ اپنے فلیٹ کے ساتھ دو کمروں کا فلیٹ بھی بغیر سیکورٹی اور معمولی کرائے پر عامل
ظہوری شاہ کو دے دیا' ظہوری یہاں شمسہ کو رکھنا چاہتا تھا۔ عامل ظہوری شاہ اور حکیم جمالی
کے دِل دلاسوں جسمانی روحانی علاج کی کامیابی کی پوری پوری امید کے باوجود قریباً" پچاس فیصد
ناکامی کے ببول کا کانٹا اس کے احساس کو لہولہان کر رہا تھا۔ دونوں نے صاف صاف پچاس فیصد
کامیابی کی امید دلائی تھی لیکن اس کے اندر' بہت اندر کوئی کہہ رہا تھا کہ وہ پچاس فیصد اوپر کی
جانب نہیں جا سکے گا' مایوسیوں اور رسوائیوں کی گہری دھند ہی اسے کوئی واضح راستہ دکھائی
نہیں دے رہا تھا۔

"کیا ہوا' یہ سر جھکائے کیا سوچ رہے ہو---؟" نین تارا اسے محویت میں ڈوبا ہوا دیکھ کر

پریشان سی پوچھنے لگی۔ "میری بات بری لگی ہے کیا۔۔۔؟"
بجائے منہ سے جواب دینے کے اس نے "نہیں" کے انداز میں سر ہلا دیا' پھر وہ چونکتے ہوئے اسے خالی خالی نظروں سے دیکھنے لگا۔
"کچھ منہ سے بھی بولو۔۔۔ کیا سوچ رہے ہو؟"
اس بار نین تارا نے مسکراتے ہوئے پوچھا' شایان کے لبوں پہ بھی اب پھیکی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔
"تمہارے سوا بھلا میں کیا سوچ سکتا ہوں' میری تو سوچ ہی تم ہو۔۔۔"
"باتیں نہ بناؤ۔۔۔ سر درد ہے کیا۔۔۔؟" وہ پھر الجھی۔
"ہاں۔۔۔ تم نے بال پکڑے تھے' درد نے سر کو پکڑ لیا۔" شایان بولا۔
"اچھا' بابا! مجھے معاف کر دو۔۔۔ میں نے تو تمہارے بالوں کو چھوا تھا' مجھے علم نہیں تم لاہور آکر ایسے نازک مزاج ہو گئے ہو۔۔۔" پھر وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ "میں تمہارے لئے درد کی گولیاں لاتی ہوں' پھر کچھ دیر یہاں آرام کرو۔ اتنی دیر میں تمہارے لئے کریلے قیمہ کرتی ہوں' باقی باتیں کھانے کے بعد ہوں گی۔۔۔"
نین تارا کے جاتے ہی جیسے دنیا بھر کے کریلوں کی کڑواہٹ سے کمرا بھر گیا ہو۔۔۔
بھرے کریلے جن پہ لمبا مسالے میں لت پت الجھا ہوا دھاگا لپٹا ہوتا ہے' اسے بہت پسند خالی کریلے کھانا بڑا جی گردے کا کام ہے لیکن قیمے' گھی' مرچ مسالے اور پکانے والے کی ہنر سے کڑوے تلخ کریلے بھی لذیذ ترین پکوان بن جاتے ہیں' تلخی' لذت میں تبدیل ہے اور اب وہ بھی اپنے احساس محرومی کے نیم چڑھے کریلے کی تلخی کو کسی گوارہ سی لذ تبدیل کرنے کا خواہاں تھا۔ حکیم جمالی' ظہوری شاہ' مس عاشی' گرو حاجی رجی بیگم' ان جیسے ہنرمندوں' صلاح کاروں' قدر دانوں اور ہمدردوں کی رفاقت میں ذاتی طور پر قدرے آسودگی اور دلبستگی کا احساس تو ہوا تھا لیکن دل اور لاشعور میں نین تارا اور چاہت آسیب بن کر چمٹ گئی تھی۔ وہ اسے ٹوٹ کر چاہتی تھی' اسے اپنی منزل سمجھتی تھی اسے کیا بتاتا کہ جسے وہ اپنی منزل سمجھ رہی ہے وہ سراب کے سوا اور کچھ نہیں۔ نین والد' اسکے ماموں' اس کی بہن کا رشتہ بھی مانگ رہے تھے' رضامندی کا اظہار بھی ہو شاید یہ "وٹے سٹے" کی شادیاں اکٹھی ہی کرنا چاہتے تھے۔ اب صرف نین تارا کے کرنے کی دیر تھی۔ مگر گھر والوں کو کون بتاتا کہ وہ جو خواب دیکھ رہے ہیں' وہ کبھی پورے ہوں گے۔ اس قسم کی باتیں سوچتے سوچتے وہ پاگل سا ہو جاتا۔ رسوائیوں' بدنامی



اندیشوں کے سپنولیئے دن رات اس کے احساس کو ڈنکتے رہتے۔ وہ اب جیسے زہریلا سا ہو گیا تھا۔ حالات' وقت اور قسمت کے تیز دھارے میں غرق ہوتے ہوئے' ہاتھ پاؤں چلانا فضول سمجھ کر اس نے اپنے آپ کو ہونی کے سپرد کر دیا تھا۔ یہ حلیہ' طور طریق' اس کے نفسیاتی طور پہ بدلتے ہوئے رجحانات کا پیش خیمہ تھا۔ عمر کے اولین عرصے میں جب مردانگی کا احساس کمزور پڑ جاتا ہے تو ناز و ادا کی ردائیں در آتی ہیں۔ یہ سب کچھ خود بخود میکانکی انداز میں ہوتا رہتا ہے' خود کو محسوس نہیں ہوتا جبکہ دوسروں کی نظروں سے چھپا نہیں رہتا۔ بالکل ایسے ہی جیسے شایان یہاں اپنے طور پر بڑا سمارٹ اور باوقار جنٹلمین بن کر آیا تھا' خود کچھ بھی محسوس نہیں ہوا لیکن دوسروں کی نظر میں آگیا' وہ باوقار مرد دکھائی دینے کے برعکس زنانہ سا عامی لگا۔
کریلے قیمہ' دیسی گھی سے تلے پراٹھے' رائتہ' سلاد' حلوہ کدو کا میٹھا۔۔۔ کھانا بڑا مزیدار تھا۔ وہ چپ چاپ بیٹھا' چھوٹے بچوں کی طرح چھوٹے چھوٹے نوالے توڑتا رہا۔ نین تارا شدت سے محسوس کر رہی تھی کہ وہ یہاں نہیں ہے' ٹٹولتے ہوئے پوچھنے لگی۔
"شاید تمہیں کھانا اچھا نہیں لگا۔۔۔ جلدی میں تیار کیا ہے نا! اور جلدی کا کام ایسا ہی ہوتا ہے۔"
وہ ایک کریلے سے الجھا ہوا دھاگا اتارتے ہوئے فوراً بولا۔ "۔۔۔اور کبھی کبھی دیر سے کرنے والا کام بگڑ بھی جاتا ہے۔۔۔ ویسے کھانا ہمیشہ کی طرح لذیذ ہے۔۔۔" وہ کریلے سے الجھا ہوا دھاگا اتارنے میں اس کی مدد کرتے ہوئے بتانے لگی۔ "گت کریلے' پائے' سیویاں اور آم کھانے کے لئے ذوق' اشتہا اور اچھے معدے کے ساتھ ساتھ ہنرمندی کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔۔۔"
"یہ انکشاف کرنے کی کیا ضرورت پیش آئی۔۔۔؟" وہ پوچھنے لگا۔
"آپ بھی تو بڑے عالمانہ موشگافیاں فرما رہے ہیں۔ میں نے جانا کہ چلو' میں بھی کچھ انکشافات کر کے پڑھی لکھی لگوں۔۔۔ ویسے تمہاری یہ دیر سے کام بگڑ جانے والی بات سمجھ میں نہیں آئی۔۔۔؟"
سلاد سے ایک ثابت ہری مرچ منہ میں رکھتے ہوئے وہ کہنے لگا۔ "میں نے سنا ہے کہ تمہارے ہمسائے تم سے دلچسپی رکھتے ہیں اور شاید تمہارا رشتہ بھی مانگا ہے۔۔۔"
وہ لاپرواہی سے بولی۔ "ہاں' میں نے بھی سنا ہے لیکن تمہیں کیسے معلوم ہوا۔۔۔؟"
"ممانی نے سرسری ساذکر کیا تھا کہ جلدی جلدی تم پڑھائی مکمل کر لو تاکہ تمہاری شادی کر دیں' آئے دن کوئی نہ کوئی منہ اٹھائے چلا آتا ہے۔ اسی ضمن میں ہمسایوں کا ذکر بھی ہوا کہ

انہیں معلوم بھی ہے کہ نین تارا کی منگنی ہو چکی ہے' اس کے باوجود بھی ان کی دلچسپی کم نہ ہوئی---"

"ہاں--- ویسے بڑے اچھے لوگ ہیں' ان سے بڑے اچھے تعلقات ہیں۔ اللہ ا ہمسائے سب کو دے---"

"لڑکا کیا کرتا ہے۔ ذات' برادری---؟"

اس نے ہری مرچ کی سی سی کو ختم کرنے کے لئے پانی کا گلاس منہ سے لگایا۔ تو نین تا قینچی چلنے لگی۔

"ذات کے راجپوت ہیں' موٹروں کا شوروم ہے۔ نام ذوالفقار ہے' کہلاتا زلفی۔ ایف اے میں چھوڑ دیا تھا۔ شریف لڑکا ہے۔ سگریٹ نہیں پیتا' خوبصورت اور زندہ دل۔ اس کی بہن کی زبانی معلوم ہوا کہ مجھے پسند کرتا ہے---" پھر وہ مسکرا کر اس کی طرف غور دیکھتے ہوئے بولی۔ "جسم کسرتی اور منہ پہ مونچھیں ہیں--- اور کچھ؟"

وہ بڑے سکون سے بولا۔ "اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ رشتہ بہت اچھا ہے--- گاڑیو شوروم ہے' ذات برادری ایک ہے' گھر پاس اور سب سے بڑی بات کہ اس کی مونچھیں ہیں---"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو---؟" وہ چونکتے ہوئے کہنے لگی۔

"---وہی' جو تم نے کہا ہے---" اس نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"میں تو تمہیں ستانے کے لئے کہہ رہی تھی' محض مذاق---"

وہ بھی اسی لہجے میں بولا۔ "مگر میں تم سے مذاق نہیں کر رہا' ایسا رشتہ نصیبوں سے ہے---"

وہ یکبارگی اٹھی' پانی کا جگ چھناکے سے زمین پہ گرا۔ نین تارا روتی ہوئی باہر نکل شایان بھی چلا آیا۔

☆☆☆

سالگرہ کے روز' نماز جمعہ کے بعد شایان آگیا۔ شیخوپورہ سے اس کے گھر والے آئے تھے۔ اس کے والد کے ایک دوست الیکشن لڑ رہے تھے' اس سلسلے میں وہ مصروف تھے۔ گزری جمعرات وہ گھر شیخوپورہ گیا' تو اس کی والدہ نے اس کے ہاتھ کچھ اور مٹھائی وغیرہ بھجوائی تھی۔ اس نے خود بھی اسپیشل کیک تیار کروایا تھا۔ غبارے' موم اور دیگر آرائشی سامان لئے جب وہ یہاں پہنچا تو گھر میں کوئی سالگرہ والی گہما گہمی نظر نہ آ



نہ ہی اسے نین تارا دکھائی دی۔ ممانی سے پوچھا' معلوم ہوا کہ وہ دو دنوں سے اپنے کمرے میں بیمار پڑی ہے۔ دبے پاؤں وہ کمرے میں داخل ہوا تو نین تارا آنکھیں موندھے بے سدھ سی بخار میں تپ رہی تھی۔ وہ سرہانے کے پاس کھڑا اسے محبت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ حسن بیمار ہو یا سوگوار' اپنی ایک الگ سی شان اور جاذبیت رکھتا ہے۔ بوسکی رنگت چہرے پہ پسینے کے آبدار موتیوں کی افشاں' نازک سی ناک کے ننھے ننھے نتھنوں میں کمزور سی سانس کا ارتعاش' بخار کی تپش سے سرخ سے ہونٹوں پہ خفیف سا لرزہ--- وہ مبہوت سا کھڑا دیکھ رہا تھا کہ نین تارا نے ہلکی سی کراہ کے ساتھ کروٹ بدلی اور شایان نے اپنا ہاتھ اس کے ماتھے پہ رکھ دیا۔

"نین! اٹھو--- آج ہماری سالگرہ ہے اور--- اور تم یہاں بستر پہ پڑی ہو---"

اس نے ہولے سے آنکھیں کھولیں اور اس کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

"یہ بخار کا کیا ڈرامہ ہے---؟" پلنگ کی پٹی پہ بیٹھتے ہوئے چھیڑنے لگا۔

پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ نین تارا کہنے لگی۔ "ہاں' یہ سب کچھ ڈرامہ ہی تو ہے۔ ہم تم' وعدے وفائیں' بخار پیار' یہ سب کچھ---"

وہ اس کے ہونٹوں پہ اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ "اچھا' اچھا زیادہ مت بولو--- اٹھو اور جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ میں تمہارے لئے بہت سے اچھے اچھے تحفے لے کر آیا ہوں' دیکھو گی تو تمہارا یہ بخار وخار سب اڑنچھو ہو جائے گا---"

وہ بمشکل اٹھ کر پلنگ پہ نیم دراز ہوتے ہوئے اسے کہنے لگی۔ "مجھ میں ہمت نہیں ہے شایان!--- پلیز' تم یہ سب کسی اور وقت کے لئے اٹھا رکھو---"

"افوہ---" وہ الجھتے ہوئے بولا۔ "چھوڑو یہ سب باتیں--- دیکھو' بہت سے کام کرنے والے پڑے ہیں۔ وقت ضائع مت کرو---" وہ اسے سہارا دیتے ہوئے زبردستی اٹھانے لگا۔

"آج میں نے اپنا حلیہ بھی تم سے چیک کروانا ہے--- دیکھو' میری یہ شلوار قمیض' اسپیشل سالگرہ کے لئے سلوائے ہیں اور آج میں تمہیں ایک سرپرائز دینے والا ہوں' تم بھی کیا یاد کرو گی کہ کسی رئیس سے پالا پڑا ہے---"

اسے تیار ہونے کا کہہ کر وہ باہر بڑے کمرے میں آگیا۔ ماموں سے ملاقات ہوئی۔ وہ کئی روز کوئٹہ گزار کر آئے تھے۔ بڑی شفقت سے پیش آئے' حال احوال اور پڑھائی کے بارے میں دریافت کرتے رہے۔ شایان کے لئے ڈرائی فروٹ' بلوچی ٹوپی' واسکٹ لائے تھے۔ آج چھٹی بھی تھی اور سالگرہ بھی۔ گھر کے سب لوگ انتظامات میں جتے ہوئے تھے۔ نین تارا کی چند قریبی سہیلیاں بھی مدعو تھیں۔ قریبی ہمسایوں کے ہاں سے بھی بچے بالے' لڑکیاں آ جا رہی

تھیں۔ بڑے کمرے کے درمیان' کشادہ سی میز لگا دی گئی۔ ساتھ لاؤنج میں مردوں کے لئے بیٹھنے کا بندوبست تھا۔ شام پانچ بجے تک تمام انتظامات مکمل تھے' صرف ویڈیو کی فلم تیار کرنے والوں کا انتظار تھا۔ نین تارا تیار ہو کر باہر آئی تو جوالا مکھی بنی ہوئی تھی۔ کامدار پنک ساڑھی' اسی شیڈ کا ہلکا سا میک اپ' کانوں میں اک لڑی موتی بندے' جوڑے میں گل شبنم کے پھول' کلائیوں میں موتیے کی کلیوں کے گجرے۔۔۔ شایان کے منہ سے بے اختیار "ماشاءاللہ" نکلا۔ ذرا قریب آئی تو اسے چھیڑنے کے لئے ہولے سے کہا۔

"بخار نے تو بڑا نکھار پیدا کر دیا ہے۔۔۔ چشم بددور' نظر نہیں ٹھہرتی۔۔۔"

وہ اس کی تعریف کو نظرانداز کرتے ہوئے کہنے لگی۔ "باتھ روم جا کر اپنا حلیہ درست کر کے آؤ' تمہارے لئے کپڑے وہاں رکھ آئی ہوں۔۔۔"

ویڈیو بنانے والے آ چکے تھے' بڑا کمرا کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ خوشبوئیں' روشنیاں' چہکتے دمکتے مسکراتے چہرے' بچوں کی بہار۔ درمیان میز پہ کیک پہ استادہ موم بتیاں جلنے' بجھنے کا انتظار کر رہی تھیں۔ بوسکی کا مغلئی تراش کھلا کرتہ' ملائی لٹھے کا چوڑی دار پاجامہ' سلیم شاہی پہنے شایان جب کمرے میں داخل ہوا تو ہر اٹھنے والی نظر' نورو جمال کے اس پیکر کی چھب دیکھ کر خیرہ ہو گئی۔ کئی حسین آنکھیں پلکیں جھپکنا بھول گئیں' کئی دلوں کی دھڑکنیں اتھل پتھل ہو گئیں۔ نین تارا کے ہرنیوں سے نین بھی اس نوچندی کے چاند کو چاہت بھری نظروں سے تک رہے تھے۔ وہ نین تارا کے دائیں پہلو کھڑا ہو گیا' نین تارا نے اسے بائیں پہلو کھڑا ہونے کو کہا۔

"ادھر کیا برائی ہے' جو مجھ ادھر کھڑا کر رہی ہو۔۔۔؟" شایان بولا۔

نین تارا نے اسے دیکھے بغیر جواب دیا۔ "دل دائیں جانب نہیں ہوتا' بائیں طرف ہے۔۔۔"

ایک ساتھ دونوں نے موم بتیاں بجھائیں' سلامت مبارک اور تالیوں سے کمرا گونج اٹھا۔ ایک دوسرے کو کیک کھلائے گئے' تحفے تحائف دیئے گئے' کیمرے فلش ہوئے۔ نین تارا بظاہر بڑی خوش تھی لیکن گہری نظر دیکھنے سے محسوس ہوتا تھا۔ جیسے وہ اندرونی الجھن میں مبتلا ہو۔ بخار کی وجہ سے کمزوری' نقاہت کا اثر یا دل و دماغ میں کوئی خدشہ' کچھ نہ کچھ ضرور تھا' جو اس کے دل یا دماغ میں مچھلی کانٹے کی طرح پھنسا ہوا تھا۔۔۔ شور گہما گہمی سے گھبرا کر شایان بھی لاؤنج میں آ گیا۔ یہاں ماموں زاد بھائی اپنے دوستوں میں محفل جمائے بیٹھے تھے' ویڈیو فلم بن رہی تھی۔ اس کے اندر داخل ہوتے ہی جیسے ایک دم وولٹیج اپ ہو گئے ہوں' باتوں کے کیسٹ



پلیئر کا فیوز اڑ گیا ہو۔ سب اس کی جانب دیکھ رہے تھے۔ حور کی زیبائی' غلمان کی رعنائی' دودھ شہد اور میدے کے ملیدے سے اگر کوئی صنم گر' کوئی پیکر تخلیق کرتا تو اس سے ماورا کیا ہوتا۔۔۔ دید تماشا تمام ہوا تو اس کے کزن نے اپنے دوستوں سے اس کا تعارف کرایا۔ سلمان' عباس' وحید' شبیر' ندیم اور افتخار زلفی۔۔۔ زلفی نے بڑی گرمجوشی کا اظہار کرتے ہوئے اسے اپنے بائیں پہلو' صوفے پہ بٹھا لیا' اچانک شایان کے منہ سے نکلا۔

"آپ نے بھی مجھے بائیں جانب بٹھایا ہے۔۔۔"

زلفی کے منہ سے بھی جیسے فی البدیہہ ہی نکل گیا۔ "شایان بھائی! دل اسی جانب دھڑکتا ہے۔۔۔"

"لیکن جگر تو دائیں جانب ہوتا ہے۔" شایان نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

زندگی کی توانائیوں سے لبریز' جوانی کی مسحور کن خوشبوؤں سے سرشار' زمستانی سا نبھرسا خوبصورت جسم' بازوؤں میں پھڑکتی ہوئی مچھلیاں' گنجان سیاہ بالوں سے بھرا ہوا سینہ' خوبصورت مونچھیں۔ شاہ بلوط کے تنے ایسے زانو۔ ہنسوڑا' زندہ دل باخلاق۔۔۔ نین کو اور کیا چاہیے۔ اس کے اندر چکی سی چلنے لگی۔ سوچ کے قطب کے گرد حقیقت کا بھاڑی پڑ دڑ دڑ گھومنے لگا۔ نیچے پڑ' اوپر پڑ کسی حتمی فیصلے کے دانے ہوں تو یہ دڑ دڑ ختم ہو مگر اندر اندھیر خالی گھر میں کیا ملتا؟ ضمیر کی کوٹھڑی میں مٹھی بھر دانے شرافت کی پوٹلی میں پڑے تھے' وہی ڈال دیئے۔۔۔ وقت کی تسبیح کا دانہ دانہ بھی مغرب کے امام تک آ پہنچا تھا۔ نین نے اسے بلا بھیجا تھا' اندر پہنچا تو نین تارا نے اسے ڈانٹا۔

"تم میرے پاس آئے ہو یا علیحدہ دوستوں کی محفل جمانے۔۔۔؟"

جواب میں وہ صرف خفیف سا مسکرا دیا۔ اس وقت بھی وہ اپنی چند شوخ و شنگ' بنی سنوری سہیلیوں کے جھرمٹ میں چندر روتی بنی بیٹھی تھی۔ اسے معلوم ہوتا تو وہ ہرگز اندر نہ آتا' وہ اس وقت سوال جواب کے موڈ میں نہیں تھا۔

"نین! انہیں کم از کم بیٹھنے کو تو کہو۔۔۔" ایک بے تکلف منہ چڑھی سہیلی نے پہلا پتھر پھینکا۔

"ماشاءاللہ' چشم بددور۔۔۔ شہزادہ سلیم لگ رہے ہیں' بس شیرازی کبوتروں کی جوڑی کی کمی ہے۔۔۔"

یہ اک دوسری پھلجھڑی چھوٹی اور اس سے پیشتر کہ باقاعدہ آتش بازی کا سماں پیدا ہوتا' سر درد کا بہانہ بنا کر وہ نین کے کمرے میں صوفے پہ نیم دراز ہو گیا۔ اندر کی چکی ابھی تک چل رہی

تھی' گو فیصلے کا گلا ڈال دیا تھا لیکن دانتوں تلے تل دبانے اور خالی پیٹ چکی میں چند دانے ڈالنے
سے خاک پیٹ بھرے گا؟--- اب تو واقعی سر درد شروع ہو گیا تھا۔ سوچوں کا رخ بدلنے کی
غرض سے وہ کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ چھوٹا سا قرینے سے سجا ہوا کمرا' نین کے پسندیدہ کلر' ہلکے
گلابی' کرٹن' بیڈ شیٹ' تکیئے' کارپٹ۔ کمرے کے ایک کونے میں سالگرہ پہ ملنے والے تحفوں
کے پیکٹوں کا انبار' خوبصورت رنگ برنگے نیلے پیلے ربنوں والے--- ایک پیکٹ سب سے
نمایاں اور خوبصورت تھا' ہلکے نیلے رنگ پہ سفید موگرے کے پھولوں والا چمکدار پیپر سرخ
ربن کی گرہ میں بالشت بھر' ہری ٹہنیوں پتوں سمیت تازہ بہ تازہ گلاب کے پھول اور ایک ٹہنی
کے ساتھ سنہری ڈوری سے بندھا ہوا ننھا سا لفافہ--- بس' شاید ایک ہی کسر رہ گئی تھی کہ بھیجنے
والے نے اپنا دل سینے سے نکال' شاپر بیگ میں ڈال کر ساتھ نہیں رکھا تھا۔ ورنہ تو اس نے اپنی
چاہت اور خلوص کے اظہار میں کوئی کمی باقی نہیں چھوڑی تھی۔ یونہی آگے بڑھ کر پیکٹ
اٹھایا' الٹ پلٹ کر دیکھا۔ مگر کوئی نام پتہ نظر نہ آیا۔ لفافہ کھولا تو ایک معطر بھینی بھینی خوشبو
کاغذ کا ایک ٹکڑا--- " لکھا تھا۔

"کب سے گوش بر آواز ہوں' پکارو بھی!"

اس کے لبوں پہ معنی خیز مسکراہٹ سی پھیل گئی۔ اندر چلتی ہوئی چکی کی گڑگڑاہٹ جیسے
تھم سی گئی۔ سوچوں خیالوں کی چیختی چلاتی' پھڑپھڑاتی پاگل چمگادڑیں کہیں دور نئے ویرانوں کی
تلاش میں نکل گئیں۔ فضا جیسے پرسکون اور نکھری سی گئی۔ سائیڈ ٹیبل پہ رائٹنگ پیڈ نظر آیا۔ بڑا
جاذب نظر' نفیس فرنٹ کور پہ ہلکے رنگوں میں بڑا دل فریب منظر' پس منظر میں پہاڑی ٹیلے
جن کی اوٹ میں سرخ سورج غروب ہو رہا تھا۔ لہو رنگ شفق جیسے آسمان خون کے سمندر میں
اتر گیا ہو اور دور ایک پرندہ اڑتا ہوا۔ اکیلا' تنہا!--- کچھ سوچتے ہوئے شایان نے قلم اٹھایا۔

"نین! میں نے کہا تھا' سالگرہ پہ میں تمہیں ایک ایسا تحفہ دوں گا جسے پا کر تم بھی یاد کرو گی
کہ کسی رئیس سے پالا پڑا ہے۔ مجھے اپنا کہا ہوا یاد ہے--- سب سے پہلے میں یہ اعتراف
کر لوں کہ میں جو کچھ محسوس کرتا ہوں یا جو کہنا چاہتا ہوں اس کے لئے میرے پاس نہ تو مناسب
الفاظ ہیں اور نہ ہی حوصلہ لیکن میرے لئے اپنے احساسات اور فیصلہ تمہارے علم میں لانا انتہائی
ضروری ہے۔ اس لئے میرے ان ٹوٹے پھوٹے الفاظ کی وساطت سے میرا مافی الضمیر سمجھنے کی
کوشش کرنا۔ میں کوشش کروں گا کہ اختصار سے کام لوں۔ غور سے پڑھو--- میں بقائمی
ہوش و حواس' پوری ایمانداری سے یہ محسوس کرنے پہ مجبور ہوں کہ میں بحیثیت جیون
ساتھی' اس معیار پر پورا نہیں اترتا جو ایک خاوند اور بیوی کے درمیان بنیادی حیثیت رکھتا



ہے۔ تم میرے عارضے کے بارے میں سب کچھ جانتی ہو' باوجود ممکنہ علاج و کوشش میں صحت
یاب نہیں ہو سکا۔ ڈاکٹروں کی تشخیص اور رائے کے مطابق میں ازدواجی ذمہ داریوں کو نبھانے
کا اہل نہیں ہوں۔ مجھے اپنی موجودہ حالت' آئندہ کی زندگی' ماں باپ' تم اور تمہارے جذبات'
غرض ہر بات اور ہر چیز کا احساس' ادراک اور اندازہ ہے۔ ان حالات میں میرے سامنے صرف
دو ہی راستے ہیں' تیسرا نہیں۔ ایک راضی برضا' صبر اور شکر ہے اور دوسرا خودکشی--- میں
نے پہلے راستے کا انتخاب کیا ہے۔ گو یہ راستہ بڑا کٹھن اور رسوائیوں' محرومیوں کے کانٹوں سے
بھرا ہوا ہے لیکن یہ خودکشی سے بہتر ہے۔ اس ذلت بھرے پُرہول راستے پہ چلنے کے لئے مجھے
اپنے کندھوں پہ سے سارے بوجھ اتارنے ہوں گے۔ ایک یہ ماں باپ' بہنیں ہیں اور دوسرا
بوجھ تم ہو---

نین! ہم آپس میں کزن ہیں۔ ہمارا یہ اٹوٹ رشتہ ہے جو سدا قائم رہے گا۔ میں محض اپنی
انا' دنیا دکھاوے یا خاندان کی خاطر تمہاری خوشیاں اور زندگی داؤ پہ نہیں لگا سکتا--- میری
آنکھوں کے چین' میری نین! محبت خود غرضی کا نہیں' قربانی اور ایثار کا نام ہے۔ تم پڑھی
لکھی' بیدار مغز اور ذہین لڑکی ہو۔ نفسیات کی طالبعلم ہو اور سینے میں بڑا درد مند دل رکھتی ہو۔
تم مجھے' میرے دکھ اور میری مجبوری کو اچھی طرح سمجھ سکتی ہو۔ مجھے یقین ہے کہ اس نازک
معاملے میں تم میرا ساتھ دو گی اور مجھے حرام موت سے بچالو گی--- ہاں' یاد آیا اور تمہیں بھی
یاد ہوا کہ تم نے میری مونچھوں کے بارے میں کچھ کہا تھا اور میں--- محض مسکرا کر رہ گیا تھا'
مسکرانے کے علاوہ میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ میں تمہیں کس طرح بتاتا کہ میرے محسوسات اور
خیالات میں واضح تبدیلیاں ظہور پذیر ہو رہی ہیں۔ مجھے ان تبدیلیوں پہ کوئی اختیار حاصل
نہیں' میں اپنے نصیبوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا اس لئے میں نے اپنے آپ کو حالات اور قسمت
کے سپرد کر دیا ہے۔ میں جینا چاہتا ہوں (اگر تم نے میرا ساتھ دیا) جیسے بھی صورت ہو' جو بھی
ہو' جیسے بھی ہو--- گفتگو طویل ہو گئی ہے' سمیٹنے کی غرض سے آخر میں التجا کرتا ہوں کہ تم بھی
حالات سے سمجھوتا کرتے ہوئے۔ مجھے بھول جاؤ۔ اپنی زندگی اور مستقبل کو دھیان میں رکھو۔
تم عورت ہو' تمہیں عزت' تحفظ' خوشیاں' آسائشیں چاہئیں۔ آسودہ حال پیار کرنے والا ساتھی
چاہیے۔ ماں بننا ہر عورت کی سب سے بڑی خواہش ہوتی ہے مگر میں تمہیں یہ سب کچھ نہیں
دے سکتا--- چونکنامت۔ مجھے یہ ساری خوبیاں زلفی میں نظر آتی ہیں' وہ تمہیں دیوانگی کی حد
تک چاہتا بھی ہے۔ اس کا ثبوت یہ کہ کئی بار انکار کے باوجود بھی وہ ابھی تک مایوس نہیں ہوا۔
جبکہ اسے علم ہے کہ تمہاری منگنی بچپن سے طے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمہاری بہتری اور میرے

بھلے کے لئے انتظام کر دیا ہوا ہے۔ تم اس کے تحفے اور تحریر سے بھی اس حقیقت کی سچا
محسوس کر سکتی ہو۔ میں نے آج اسے بہت قریب سے دیکھا' باتیں کیں۔ تمہارے ہو
والے شوہر کے حوالے سے ہر طرح سے اسے جانچا اور میں نے پوری ایمانداری سے محسو
کیا کہ وہ ہر لحاظ سے تمہارے لئے ایک آئیڈیل ساتھی ثابت ہوگا۔ میری آخری درخواست
غور کرو' اس پہ عمل کر کے میری مدد کرو۔ ورنہ میں سمجھوں گا کہ تم نے اپنے ہاتھوں سے م
گلا گھونٹ دیا ہے۔ میری یہ تحریر پڑھنے کے بعد جلا دینا اور کسی سے ان باتوں کا ذکر نہ کرنا۔ م
نے تمہیں اپنی نسبت سے آزاد کیا' یہی میرا تمہاری سالگرہ پہ تحفہ ہے۔ ہر سانس تمہار
لئے دعائیں اور میری طبعی موت کی دعا کرنا۔۔۔

شایان جو تمہارے شایان شان نہیں

☆☆☆

شمسہ کے ستارے عامل ظہوری شاہ کے حق میں واقعی بڑے سعد ثابت ہو رہے تھ
جب سے یہ ستارہ جبیں اس حرص و ہوس کے "ثنیا برج" میں داخل ہوئی تھی' ہُن تھا کہ
کی مانند برس رہا تھا۔ شہرت پر باندھے سرخاب کی اڑان بنی ہوئی تھی۔ جس کسی سیاسی شخص
کا زائچہ بنایا' وہ کامیاب ہوگیا۔ پیش گوئیاں حرف بہ حرف سچ نکلیں۔ پرائز بونڈ کے جس ن
کی نشاندہی کی' کوئی نہ کوئی نمبر ضرور لگ گیا۔ ایک نادہند صنعت کار کے ستاروں کا رخ
تبدیل کیا کہ اس کا قرضہ معاف ہوگیا۔ اس نے حق محنت کے عوض تین سال پرانی سوزو
کی چابی عطا کر دی۔ ایک فرنیچر والے کے ستارے ایسے پالش کئے کہ اس کی من چاہی
خود ہی دلہن بن کر اس کے قدموں میں آگئی' صدقے میں اس نے شمسہ والے فلیٹ کا ف
بھجوا دیا۔ یہ فلیٹ' شایان کے فلیٹ کے ساتھ اوپر چھت پہ تھا' اوپر صرف یہی دو فلیٹ
شمسہ والا فلیٹ دراصل شایان کا سرونٹ کوارٹر تھا جہاں پہلے اس کے ذاتی ملازم رہتے تھے
بعد میں اس کے اپنے فلیٹ کے بیرونی کمرے میں آ گئے۔ اپنے فلیٹ کے آگے کھلے صح
پھول پھلواری کھلا رکھی تھی' کبوتروں کا ڈربہ اور چھتری بھی تھی۔ بنیروں پہ باڑ لگا' جھو
چڑھا دی تھی۔ پلاسٹک کی کرسیاں میز' بڑا اچھا ماحول بنا رکھا تھا۔ دوسری جانب شمسہ
کمروں کا فلیٹ' درمیان میں قد آدم دیوار اور سیڑھیاں بھی الگ۔

شایان کے ذاتی ملازموں میں منشی کرم الٰہی بڑا ایماندار اور وفادار شخص تھا۔ برس
سے اس کے والد کے ہاں منشی گیری کر رہا تھا۔ حساب کتاب کا سچا' کاروباری اور انتظامی
ماہر تھا۔ شایان اسے ادب لحاظ سے چاچا کہتا تھا۔ اس کے ذمہ مارکیٹ کا حساب کتاب اور



کی وصولی وغیرہ تھی۔ دوسرا نذیر عرف جیرا باورچی تھا۔ کھانا پکانا' صفائی ستھرائی' کپڑا لتا اس کے
ذمہ تھا۔ تیسرا رحمت علی عرف رحمتا مخولیا تھا جو یہاں لاہور میں بڑھئی کا کام کرتا تھا۔ پارٹ ٹائم
شایان کے پاس آجاتا' اکثر یہاں سو بھی جاتا۔ ہنسی مذاق' جگتیں یا پھر پاؤں دابتا رہتا۔۔۔ منشی
کرم الٰہی مالکوں کی مرضی میں دخل تو نہیں دیتا تھا لیکن جب کبھی کاروباری اصولوں کے خلاف
کوئی بات دیکھتا تو خاموش بھی نہ رہتا' مناسب طریقے سے اشارہ کر دیتا۔ ظہوری شاہ کو بغیر
سیکورٹی فلیٹ دینا بھی اسے اچھا نہ لگا تھا۔ وہ اس کے شب و روز کے مشاغل اور پڑھائی میں عدم
دلچسپی کو بڑی تشویش بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا مگر اپنے کام سے کام رکھنے کے اصول کے
پیش نظر خاموش تھا۔ وہ اسے اپنے بچوں کی طرح عزیز رکھتا تھا۔ اندر ہی اندر کڑھنے کے سوا وہ
شریف بوڑھا آدمی کر بھی کیا سکتا تھا۔ خاص طور پر پیچھے استاد شفو کی میوزک اکیڈمی میں شایان
کی آمد و رفت اسے بہت کھلتی تھی۔ وہ تو پہلے دھمتے کی جگتوں اور سوقیانہ حرکتوں سے بیزار
تھا۔ اکیڈمی میں تو درجنوں میراثی' ناچے' خوشامدی' جی حضوری اور مطلب برآوری جن کی
گھٹی میں پڑی ہوتی ہے۔ آسامیاں پھانسنے کے ماہر جن کی صحبت اختیار کرنے سے اچھی خاصی
حیثیت کا انسان دو کوڑی کا ہو کر رہ جاتا ہے لیکن شایان شاید دل بہلانے کی خاطر وہاں چلا جاتا
تھا۔ طبلے کی تھاپ' ہارمونیم کے سُر اور تانپورے سارنگی کی جھال اسے بڑی بھلی لگتی' آواز بری
نہیں تھی لیکن گانے سے کوئی خاص دلچسپی بھی نہیں تھی۔ یوں ہی کبھی کبھی وہ ہارمونیم پہ
انگلیاں سیدھی کرنے بیٹھ جاتا' اور ہی امروہی بھی نکال لیتا۔

اس روز بھی اکیڈمی کی ایک سینئر سنگر' ڈانسر' آرٹسٹ مس نیلما کی سالگرہ تھی۔ پچھلے
دنوں ایک صنعت کار کے ہاں شادی کے فنکشن میں اس کی اعلیٰ اور مالی لحاظ سے شاندار
کارکردگی کے اعتراف میں جشن تاج پوشی کا اہتمام تھا' دونوں فنکشن اکٹھے منائے جا رہے تھے۔
استاد شفو نے حسب روایت اپنے تمام کرم فرماؤں' سرپرستوں کو بھی بطور خاص مدعو کیا ہوا
تھا۔ حکیم جمالی اور ظہوری شاہ نے اصرار کر کے شایان کو مہمان خصوصی بنا دیا۔ رات گیارہ
بجے تک رنگ و رامش کا پروگرام ہوتا رہا۔ اسی محفل میں حاجی رجی بیگم نے بصد اصرار'
شایان کو بابا ہنگاٹانی کے عرس پہ بطور مہمان خصوصی تشریف لانے کی دعوت دی۔ پروگرام کے
بعد خاص نشست کا انتظام اوپر کھلی چھت پہ کیا گیا' جہاں کھانے پینے کا وافر انتظام تھا۔ کھانے
پینے کے بعد "عامی" تو عازم راہ ہوگئے مگر "خاصی" یہیں ظہوری شاہ کے فلیٹ میں رک گئے
جہاں شراب کباب کے ساتھ شباب بھی تھا۔ ایک نمبر وائٹ ہارس اسکاچ کے دو ہلکے پیگ'
سوڈے کے ساتھ' ہنگو کی خالص نفیس ترین چرس کے چند کش۔۔۔ شایان کے چودہ طبق

روشن ہوگئے۔ دھیمے دھیمے سرور اور خمار سے اس کی خوبصورت آنکھوں کے ڈورے کھنچ
گئے۔ شراب، پھر سکاچ۔ پہلی پہلی آشنائی تھی۔ انسان جب کسی وجہ سے بھی اپنے اندر ریز
اپنی ذات سے ناراض ہو جاتا ہے تو پھر باہر کی ہر چیز سے آشنائی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اپنی ذات
کو مات دینے کے بہانے تلاش کرتا رہتا ہے۔ ہر اس سوراخ میں انگلی گھسیڑتا ہے جہاں کوئی
کالا سانپ گھسا ہوتا ہے۔ اسے اپنے آپ کو رسوائیوں، بربادیوں کے زہریلے بچھوؤں سے
کٹوانے کی عادت سی پڑ جاتی ہے۔ یہ نشے کی پینگ میں گندی موریوں میں پڑے ہوئے لوگ
جوتے، گالیاں اور ٹھڈے کھاتے ہوئے نوجوان۔ اپنی رگوں میں سرنجیں گھونپتے اور زبانوں
پہ سانپ ڈسواتے ہوئے انسان شاید اپنے آپ سے ناراض اور اپنے اندر سے باہر ہوتے ہیں
ورنہ اپنی کشتی کون ڈبوتا ہے۔

شراب، چرس، یہ پراگندہ لوگ، یہ کم سوادوں کی محفلیں شایان کی شایان شان نہیں
تھیں۔ کمینوں کی چار یاری کی یہی تو ایک خرابی ہے کہ یہ خانہ خراب کر دیتی ہے۔ شراب کبھی
چکھی نہ تھی، آج اس کے خون میں ٹھاٹھیں مار رہی تھی۔ اب وہ سرور کے گھوڑے پہ سوار
خراماں خراماں وادی بے خودی کی سیر کر رہا تھا۔ بوتلوں کے کاگ اڑے تو رہی سہی انسانیت
بھی کافور کی مانند اڑ گئی۔ اکیس انچ سونی ٹی وی پہ سولہ سولہ برس کی برہنہ لڑکیاں، ایسے حیا
منظر کہ چشم کور کو بھی پسینہ آجائے۔ استاد شفو کے سامنے کھلے ہوئے سگریٹوں کا ڈھیر
جنہیں وہ بڑی پھرتی اور مشاقی سے "مشرف با چرس" کر رہا تھا۔ انگلیاں اِدھر، آنکھیں اُدھر
حکیم جمالی اور ظہوری شاہ بڑی محویت اور دلچسپی سے مناظر کی فنی باریکیوں پہ تبصرے
ساتھ ساتھ چسکیاں اور کش بھی لے رہے تھے، استاد قربان تو ایک ایک سین پہ قربان ہو
تھا۔ رفیق ڈوگر مودب اور دو زانو بیٹھا تھا۔ سین پہ سین آتے گئے، کردار اور انداز بد
گئے۔ ایک، دوسرا، تیسرا--- عامل ظہوری شاہ اٹھا، پچھلے کمرے میں گیا۔

دیوار کے اس پار بوڑھا دردمند منشی کرم الٰہی بھی کبھی اندر جاتا، کبھی باہر آتا۔ دیوار
اس پار دیکھتا، نظریں دیواروں سے ٹکرا کر لہولہان ہو جاتیں۔ وہ دیکھ تو نہیں سکتا تھا مگر
اندازہ تھا کہ اندر کیا ہو رہا ہے۔ وہ کبھی آسمان کی جانب دیکھتا، کبھی اپنی اوقات کی طرف اور
اپنی روزی کی طرف---

عامل ظہوری اپنے کمرے سے اکیلا نہیں نکلا۔ وہ شمسہ کی کلائی تھامے، اسے ساتھ
آیا۔ شب خوابی کے نیم عریاں لباس میں وہ کوئی اور ہی مخلوق دکھائی دے رہی تھی۔ اندر
ہوتے ہی وہ کسی معصوم بچے کی مانند اٹھلانے لگی، انگڑائی توڑ کر وہ ٹیلی ویژن کے آگے



گئی۔ ٹیلی ویژن پہ بڑے گرما گرم سین چل رہے تھے، وہ بڑی محویت سے انہیں دیکھ رہی
تھی۔

"ابو---" ایک دم ظہوری شاہ نے اسے اشارہ کیا، وہ جیسے سہم گئی--- "ابو---
نہیں، شاہ جی--- ہاں، شاہ جی! یہ لڑکی کیا کر رہی ہے۔" وہ دیکھتے ہوئے تالیاں بجانے لگی۔

حکیم جمالی نے نشے میں دھت شایان کا کندھا ہلایا۔ بڑی سی "ہوں" کرتے ہوئے اس
نے ہلکے سے پپوٹے کھولے اور چاٹی سے مِلائی مِلا دودھ ڈکوستے ہوئے بانگڑ بلے کی طرح وہ
آنکھیں سکیڑے پھر مُنڈی ڈال گیا۔ حکیم جمالی نے جیب سے ایک چھوٹی شیشی نکالی، چٹکی سے
ایک دوا اس کی ناک میں سونگھائی۔ تابڑ توڑ دو چھینکوں سے اسے قدرے ہوش آگیا، آنکھیں
پٹ پٹا کر دیکھنے لگا۔

"شایان صاحب! بس، دو پیگ ہی سے لمبے پڑ گئے---؟" پھر وہ شمسہ کی جانب اشارہ
کرتے ہوئے، آنکھ دبا کر کہنے لگا۔ "ابھی تو یہ سولہ سالہ پرانی شیواز وسکی بھی آپ نے چکھنی
ہے---"

وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ شمسہ کی جانب دیکھنے لگا جو بڑی گرم جوشی سے تالی بجا کر ٹیلی ویژن پہ
گرم گرم سین دیکھتے ہوئے خوش ہو رہی تھی۔ حکیم جمالی نے شمسہ کا رخ شایان کی جانب
موڑتے ہوئے کہا۔

"بے بی! انہیں دیکھو، یہ شایان ہیں---" وہ ایک دم شایان سے چمٹ گئی۔

"اخاہ! میرا گڈا! میں اپنی گڑیا کی شادی اس سے کروں گی--- ابو--- نہیں نہیں، شاہ
جی! اسے آپ مجھے دے دیں---"

وہ ضد کرنے لگی--- شایان کچھ نہ سمجھتے ہوئے پریشان سا ہو گیا۔ ایک اور چھینک نے اسے ہلا
کر رکھ دیا تھا۔ ظہوری شاہ نے ایک بھرا ہوا سگریٹ اس کے ہونٹوں سے لگاتے ہوئے کہا۔

"دم مارو، شہزادے! یہ سب کچھ تمہارے علاج کا حصہ ہے۔ بس عیش کرو، شہزادے،
عیش---"

دو چار بھرپور کشوں نے اسے پھر سرور کے گھوڑے پہ بٹھا دیا مگر اب کے گھوڑا دلکی چال
پہ تھا--- ٹیلی ویژن پہ سین ہی کچھ ایسے تھے، منہ سے باتیں ضرور ہو رہی تھیں لیکن نگاہیں
وہیں جمی تھیں۔ شایان اور شمسہ بھی کسی نہ کسی طور ان میں شامل تھے، سب اپنے اپنے ظرف
مزاج اور خیالات کے مطابق لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ظہوری شاہ نے شمسہ کو ایک ڈبل
پیگ سکاچ کا پلایا اور اپنے قریب کرتے ہوئے اس کی گردن کے پیچھے ہاتھوں سے مساج

کرنے لگا' ہاتھ اور آنکھ کے اشارے سے اسنے رفیق ڈوگر کو ایک خاص فلم لگانے کا حکم دیا
کمرے کی ساری لائیٹیں بجھا کر سرخ لائٹ جلادی گئی۔ پھر لباس' شرم' شرافت' حیا' سب ک
اتار کر کونے میں رکھ دیئے گئے۔ رقص ابلیس شروع ہوگیا۔ ہر سین سے جیسے مقابلہ شرو
ہوگیا۔ دونوں جانب حیا سوز مناظر تھے' شیطانی قہقہے اور تبصرے بھی جاری تھے۔ گدلا بدبو
دُھواں' ہلکی ہلکی سسکاریاں' دیواروں پہ ٹیلی ویژن کی منعکس شعاؤں کے تھرکتے سائے۔
شایان آنکھیں پھاڑ پھاڑ کبھی اِدھر' کبھی اُدھر دیکھ رہا تھا۔ ہوش مدہوشی' تجسس تردد کی درمی
کیفیتوں میں غلطاں' حیراں اور پریشاں ایک مظلوم بے بس سی عورت اور کئی وحشی مرد۔ خو
میں چنگاریاں اٹھاتی ہوئی شراب' دماغ میں فتور مچاتی ہوئی چرس' نگاہوں میں ناچتی ہوئی حرم
رات بھی شاید ان شرمناک مناظر کو دیکھنے کی تاب نہ لاکر اپنی آنکھیں چھپانے لگی تھی۔

شمسہ ایک گھائل نیل گائے کی مانند پڑی تھی۔ آنکھیں کھلی تھیں۔ بے جان نظر
سے دیوار پہ منعکس بھوتوں جیسے سائے تھرکتے دیکھ رہی تھی اور شایان اس کو دیکھ رہا تھا
بیک وقت کئی کتے بھیڑیئے' گیدڑ' بھنبھوڑ رہے تھے۔ جسمانی طور پر نہ سہی' تصور کی حد
اور ذہنی طور پہ جیسے وہ بھی اسے بھنبھوڑ رہا ہو' نوچ اور رگید رہا ہو۔ پیادے' گھوڑے' ہ
رخ' سب باری باری اوندھے پڑتے جارہے تھے اور کوئین' بے چاری کی جان پہ بنی
تھی' بچھی بساط پہ اکیلی پڑی تھی۔ عامل ظہوری نے شایان کو ایک نیٹ ڈبل پیگ حلق
انڈیلتے ہوئے' زبردستی شمسہ کے قریب کرکے میوزک آن کر دیا گیا' روشنیاں جلادی گئیں
تیز آنکھوں کو چکاچوند کردینے والی روشنیاں اور تیز نیٹ وسکی نے اندر آگ لگادی' دماغ
کردیا۔ خمار کے بوجھ سے بند ہوتی آنکھیں' روشنیوں کی چبھن--- شمسہ نے اسے گو
لیا۔

"میرا گڈا!!--- میں اپنی گڑیا کی اس سے شادی کروں گی---"

وہ چہکارنے لگی۔ بے آواز' کیمرے مختلف زاویوں سے تصویریں بنا رہے تھے اور بس
وہ دو مہرے تھے' جنہیں کھیل کر ظہوری شاہ ایک بڑی بازی جیتنا چاہتا تھا۔ پھر بساط سے
مہرہ اٹھالیا گیا۔ رفیق ڈوگر میدان میں آگیا۔ شایان اور وہ--- فلیش چمکتے رہے' زاو
انگ انداز بدلتے رہے۔ رات روتی پیٹتی' چیختی چلاتی کہیں دور نکل گئی۔ صبح سے پہلے شا
حلیہ درست کرکے اس کے فلیٹ پہ پہنچادیا گیا۔

منشی کرم الٰہی جاگ رہا تھا' اسے پلنگ پر لٹا کر نماز کی تیاری میں لگ گیا۔



شمسہ پچھلے کمرے میں بستر پہ پڑی اپنی گڑیا کے بال برش کر رہی تھی۔ رات کے راہی'
ح کے اُجالے سے پہلے ہی غائب ہوچکے تھے۔ ظہوری شاہ ویڈیو' ٹیلی ویژن کیمرے اور ایکسپوز
ی ہوئی فلمیں لے کر اپنے دفتر چلا گیا۔ شمسہ اپنے اردگرد کے ماحول' رات کی دُرگت سے بے
باز چڑھی ہوئی آنکھوں سے اپنی گڑیا کو سنوار رہی تھی۔ بے حسی کے گہرے پانیوں ڈوبی ہوئی
دداشت' سانس درست کرنے کے لئے ابھرتی بھی تو اگلے لمحے ہی وقت اور مقسوم کا مگر مچھ پھر
ں کی ٹانگیں کھینچ کر گہرے پانیوں میں لے جاتا اور پھر وہ کانٹے میں پھنسی مچھلی کی مانند ڈوری
کے رحم و کرم پہ کھنچتی ہوئی چلی جاتی اور یہ ڈوری ظہوری شاہ کے ہاتھ میں تھی۔ جب سے وہ
ں کے ہاتھ آئی تھی' کوئی شب بھی تو ایسی نہ گزری جب وہ اس کے یا اس کے کسی دوست کی
لبستگی کا سامان نہ بنی ہو۔ حکیم جمالی بھی اپنے مریضوں پہ اپنے کشتوں اور مقویات کے اثرات
یکھنے کے لئے عملی مظاہرات اسی پہ کراتے اور ظاہر ہے' اس کام کی وہ بھاری فیس علیحدہ
صول کرتے جو دونوں بانٹ لیتے۔ یہ سب کچھ ایسی رازداری اور احتیاط سے ہوتا کہ اردگرد
ے لوگوں کو کانوں کان خبر تک نہ ہوتی کہ اس کاروبار مرکز میں قحبہ گیری کا مکروہ کام بھی ہوتا
ہے۔ شمسہ اس گدگدی کی ایسی عادی ہوچکی تھی کہ کبھی وہ خود بھی کہہ دیتی۔ بات تو ساری
ساس اور اندر کی ہوتی ہے' جب یہ دونوں چیزیں سرد ہوجائیں تو انسان ایک پتھر کی مانند ہو
تا ہے۔ اس پتھر سے چکی بنالو یا بھگوان تراش لو' شولنگ کا سروپ بنادو یا اشوکا کی لاٹ گھڑلو یا
نتا الیورا کے شاہکار تخلیق کرلو۔ پتھر تو پتھر ہوتا ہے' اصل چیز تو اس کی تراش خراش اور اس کا
تعمل ہے۔

اس جوان جسم و جان کے پتھر کو ظہوری شاہ نے حرص و ہوس کی ایک ایسی جیتی جاگتی
رتی میں ڈھال دیا تھا جو نشاط پسندوں کے تلذذ کی جملہ ضرورتوں کو انتہائی خاموشی سے پورا
تی تھی۔ ظہوری شاہ نے شمسہ کی جملہ ضرورتوں اور دیکھ ریکھ کے لئے ایک بوڑھا کھوسٹ
ٹرا رکھ چھوڑا تھا۔ نواب بی بی نام کا یہ خرانٹ کھسرا حاجی رجی بیگم کے کیمپ سے حاصل کیا

تھا۔ دانت آنت سے خالی' جاڑو پھیرا چہرہ' تالو' تلوے کی طرف صاف' بلغم پھینکتا اور دن
کھوں کھوں کرتا رہتا' افیم کا عادی تھا' معدہ خراب کرنے کی اس عمر میں اچھا کھانا پینا اور پڑ
رہا تھا تو اور کیا چاہیے؟ کچی خمیری تندوری روٹی کے کناروں جیسے لٹکے ہوئے ہونٹوں پہ
اسٹک تھوپ' سرکنڈے کے کھیت جیسے تھوبڑے پر سرخی پوڈر پوت' سفید موتیا بند ز
جیسی آنکھوں میں کجلا بروت کر جب وہ چھت پہ لہرا لہرا کر اٹکھیلیاں لیتا تو اس بے کار بو
اونٹ کی طرح دکھائی دیتا۔ جو شتربان کے ہاں نہ باربرداری کے قابل ہوتا ہے اور نہ ذ
لائق--- گڑیا اس کے ہاتھ سے علیحدہ کرتے ہوئے وہ اسے نہلانے کی تیاریاں کر
اسے سہارا دے کر اٹھاتے ہوئے وہ محسوس کر رہا تھا کہ رات اس کے ساتھ برا حشر ہوا
جسم پہ جا بجا نیل اور سوجن تھی' اسے شدید گھن سی محسوس ہو رہی تھی--- وہ اسے پکڑ
لگا۔

"اٹھ' میری لاڈو' میری جان! میں صدقے' قربان--- اٹھ' نہا دھو--- پھر دونوں
سے نہاری کلیجے سے ناشتہ کریں گے۔ اس کے بعد سارا دن آرام کرنا---"

"آنٹی! میں اپنی گڑیا کو بھی نہلاؤں گی' اس کی بڑے خوبصورت گڈے سے شادی
گی--- آنٹی! میں نے گڈا دیکھا ہے' بڑا ہی خوبصورت ہے---"

وہ اس کے بازوؤں میں جھولتی ہوئی غسل خانے چلی گئی۔

ادھر شایان قدرے ہوش میں اپنے شاندار پلنگ پہ ٹوٹا ہارا پڑا تھا۔ رت جگے ا
ہوئے خمار سے سرخ آنکھیں' گردن پٹھے اکڑے ہوئے' سر بھاری' ہلکا ہلکا درد اور م
کڑوی رطوبت سے بھرا ہوا--- اس نے جیرے سے چائے کا گرم گرم کپ طلب کیا۔
سرکتے ہوئے' آہستہ آہستہ ایک ایک کر کے گذری شب کے چہرے سے پردے سرک
رنگ و رامش کی محفل' فلمیں' شراب' بھرے ہوئے سگریٹ' تیز میوزک' آنکھ
چندھیا دینے والی روشنیاں' ایک لڑکی۔ لڑکی نے اسے اپنے ساتھ چمٹایا' کوئی گڈی گ
بات کی پھر--- پھر رفیق ڈوگر--- اس کی آنکھیں مارے خوف کے ابل پڑیں۔ ا
ساتھ ہونے والی زیادتی کا احساس بھی ہو چکا تھا۔ وہ خجل سا چائے کے کپ میں جیسے ڈو
کا سوچ رہا تھا' اسے ظہوری شاہ کے الفاظ بھی یاد آئے کہ یہ تمہارے علاج کا حصہ
کے ذہن کی عجیب سی کیفیت تھی' کچھ بھی تو واضح نہ تھا۔ اس کے اندر جیسے پھریریاں سی
تھیں' ذہن مختلف قیاس آرائیوں اندیشوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا---
منشی کرم الٰہی بھی اپنی چارپائی پہ تسبیح پکڑے چپ چاپ بیٹھا تھا' انجانے اندیشہ



اندھیروں میں امید و فلاح کے ننھے ننھے جگنوؤں کی جلتی بجھتی روشنی میں خیر و سلامتی کی کوئی
راہ تلاش کر رہا تھا اور ایسی کوئی راہ فی الحال اسے سجھائی نہیں دے رہی تھی۔ شایان کو اچھائی
برائی سمجھانا بے کار تھا۔ وہ اپنے ذاتی معاملات میں کسی کی بھی مداخلت پسند نہیں کرتا تھا۔
والدین بھی اس کے آگے سرنگوں تھے اور شاید اس کی وجہ اس کا اکیلا بچہ ہونا یا بیمار اور حساس
ہونا ہو۔ وہ اس کے باپ سے بھی اس کی راہ روش کی شکایت کرنا مناسب خیال نہیں کرتا تھا'
شاید وہ ان کی آزردگی اور پریشانی کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ایک ہی راستہ تھا کہ وہ صدق دل سے
اللہ سے اس کی سلامتی اور نیک چلنی کی دعا کرے--- دوپہر تک شایان بے خبر سوتا رہا۔ دو
بجے کے قریب نذیر باورچی نے اسے جگا کر کھانے کے متعلق پوچھا۔ نہا دھو کپڑے بدل کر
کھانے کے لئے بیٹھا ہی تھا کہ حکیم جمالی کا فون آ گیا' وہ اسے حاجی رجی کے ڈیرے پہ لے
جانے کے لئے آ رہا تھا' عرس کے متعلق کوئی میٹنگ تھی اور حاجی رجی بیگم نے خاص طور پر
شایان کو ساتھ لانے پہ اصرار کیا تھا۔ آدھ گھنٹے بعد وہ آیا تو شایان کھا پی کر فارغ ہو چکا تھا مگر
دسترخوان ابھی لگا ہوا تھا۔

"شہزادے! اکیلے اکیلے بھنڈی گوشت اڑا رہے ہو---"

یہ کہہ کر حکیم جمالی خود ہی شروع ہو گیا' کھاتے ہوئے اس کی نظریں شایان پر تھیں۔ اس
کی طبیعت ابھی تک بوجھل تھی۔ کسلمندی' ذہنی اضطراب کے اثرات ابھی تک اس کے
چہرے سے ہویدا تھے۔ حکیم جمالی کی آمد بھی خالی از علت نہ تھی' رات والی واردات پہ وہ اس کا
ردعمل دیکھنا چاہتا تھا لیکن سے اس کے رویئے یا برتاؤ میں کوئی خاص تبدیلی نظر نہ آئی اور نہ
ہی اس نے گزری رات' کی بات یا اپنے ساتھ ہونے والے کسی برتاؤ کا اظہار کیا۔ حسب
معمول بڑی سعادت مندی اور احترام کا اظہار کر رہا تھا' یہ صورت حال حکیم جمالی کے لئے بڑی
تقویت اور اطمینان کا باعث تھی--- سیڑھیاں اترتے ہوئے' حکیم جمالی اس کے کندھے پہ
ہاتھ رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"شایان صاحب! رات مزہ آ گیا۔ ایسی محفلیں اور جشن تو ہوتے ہی رہتے ہیں مگر آپ کی
شمولیت سے جو لطف اور رونق پیدا ہوئی ہے اس کا نشہ ہی الگ ہے۔ اسی لئے حاجی صاحب
نے آپ کو عرس کے موقع پہ خاص الخاص مہمان بنایا ہے اور آج بے حد اصرار کر کے بلایا بھی
ہے---" سوزوکی اسٹارٹ کرتے ہوئے بڑے رازدارانہ لہجے میں کہا۔ "حاجی رجی بیگم بڑی
پہنچی ہوئی ہستی ہیں۔ وہ آپ کی بہت تعریف کرتے ہیں--- بڑے قسمت والے ہو'
بھئی---"

"ان کی بڑی مہربانی ہے' میں کس قابل ہوں ——" شایان نے انکساری سے جواب د
ڈیرے پہنچے تو حسبِ معمول بڑی رونق تھی۔ بڑی گرم جوشی' شفقت سے پذیرائی
حاجی صاحب نے حال احوال پوچھا' منہ چوم کر اپنے پہلو میں مسند پہ جگہ دی۔ چائے پانی
فراغت ہوئی ہی تھی کہ ظہوری شاہ اور وہ کونسلر جن کا زائچہ اور ستارے سیدھے کر
کامیاب کروایا تھا' تشریف لے آئے۔ عُرس کے انتظامی معاملات پہ بات چیت شروع ہ
عرس کے تینوں دن' خصوصی ناچ گانے کے مقابلوں کے لئے ملک بھر سے ہیجڑوں کو مدعو
تھا۔ دہلی' آگرہ' جے پور' حیدر آباد بھی دعوت نامے اور خطوط ارسال کر دیئے گئے تھے۔
کھلے میدان میں تمبو' قناتیں' شامیانے اور مہمانوں کے خیمے نصیب کر دیئے گئے تھے۔
دنوں نچڑتے دیسی گھی کے تنجن' حاجی صاحب کا طلائی مکٹ' مزار شریف کی سجاوٹ' ر
ساؤنڈ سسٹم' عارضی غسل خانے' رضا کار' سب انتظامات مکمل تھے۔ مقامی کونسلر اور م
حیثیت' صاحب ذوق حضرات نے بھی انتظامات اور اخراجات میں خاطر خواہ تعاون کیا تھا اور
قدر دانوں نے اپنی کاریاں' ویگنیں اور ٹانگے ریڑھے بھی پیش کر دیئے تھے۔ مقامی کونسلر
مہربانی سے مقامی پولیس تھانے نے عرس کے تینوں دنوں امن وامان کے لئے خاصی نفری متع
کرنے کی ذمہ داری لی۔ پھر آنے والے دو تین روز بڑے مصروف گزرے۔ نئی قلعی سفید
نئے جھنڈے جھنڈیاں' آرائشی روشنیاں۔ میدان کا کاٹھ کباڑ' کوڑا کرکٹ سمیٹ کر صفا
اور چونا بکھیر دیا گیا' نمدار اور تعفن والی جگہوں پہ فینائل کا چھڑکاؤ کیا گیا۔ آرا مشین والوں
دیگیں پکانے کے لئے ایندھن اور جگہ کا انتظام اپنے احاطے میں کر دیا اور یہاں کے سکو
واپڈا کے لائن مینوں نے ڈائرکٹ تاریں جوڑ کر بجلی فراہم کر دی۔ اردگرد کوائٹروں وا
چھڑوں' لچوں اور محنت کشوں نے وی آئی پی قسم کے مہمانوں کی مہمانداری' شب بسری
لئے در دیدہ و دل وا کر دیئے تھے۔ ریڑھی' ٹھیلے' عارضی دوکانوں' مٹھائی قلفی والوں
چائے' پان سگریٹ والوں نے اپنی اپنی جگہیں سنبھال لیں۔ منگل کے روز شام تک
انتظام مکمل ہو گئے تھے۔

ابتداء سندھ کے قافلے سے ہوئی۔ کراچی' حیدر آباد' سکھر' سانگھڑ' نواب شاہ' لاڑ
سے کل اکتیس ہیجڑے آئے۔ جن کے گرو الحاج تتلی جان کے علاوہ کئی چھوٹے چھوٹے ڈیر
دار بھی شامل تھے۔ میرپور' مظفر آباد' کوٹلی' بھمبر سے اکتالیس مع گرو غازی نواب
آئے۔ گرو صاحب کی سیاسی حیثیت بھی تھی۔ کشمیر کی جنگ آزادی میں ایک رات
انڈین گورکھوں کے ہتھے چڑھ گئے تھے' بچ بچا کر زخمی حالت میں دوسرے روز واپس آ



اور تب سے غازی کہلانے لگے تھے۔ گجرات' جہلم' پنڈی' پشاور' مردان' کوئٹہ کے ہیجڑے
اکٹھے ہو چکے تھے۔ بدھ کی شام انڈیا سے قافلے کی آمد آمد تھی۔ حاجی رجی بیگم سینکڑوں زرق
برق بنے سنورے ہیجڑوں سمیت جلوس کی شکل میں اسٹیشن استقبال کے لئے پہنچے تو زندہ
دلان لاہور کے لئے ایک نئی تفریح کا سامان پیدا ہو گیا۔ ویگنوں' بسوں' رکشے والوں' قلیوں'
مسافروں اسٹیشن کے عملے نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ٹریفک رک گئی اور اندیشہ نقضِ امن کے
تحت پولیس بھی آ گئی۔ چھیڑ چھاڑ' ہنسی ٹھٹھول' فقرے بازی' فحش حرکتوں اور دو ہتھڑ تالیوں'
ٹھمکوں نے وہ سماں باندھا کہ تماشبینوں کو لطف آ گیا۔

جگت گرو مہاراج لکشمی رانی کی قیادت میں اٹھائیس ہیجڑے پدھارے تھے۔ چھوٹے
گروؤں میں کلکتہ سے شوبھا دیوی بھانبڑی' دہلی سے حاجی مہربان بانو' سورت گجرات سے حاجی
زلیخا بائی' چنڈی گڑھ سے ریشم کور' حیدر آباد دکن سے نازلی خانم' آگرہ سے نرجس جہاں'
بھوپال سے زیب خاتون بھوپالی' بمبئی سے منھی جان جام شور والی مع اپنے شاگرد چیلوں کے
جب باہر نکلے تو لاہوریئے بڑے مایوس ہوئے۔ دھان پان چرخ' دھواں دھند چہرے' منہ میں
گلوریاں' زردیلی آنکھوں میں کجلے کی دُم دھاریاں۔ بے رس ہونٹ' شور تھور بنجر جسم۔ کوئی
بوٹی' دال مفت' ڈھیلے روٹی۔ اکثریت معمولی سوتی ساڑھیوں میں ملبوس' تنگی داماں کی شکایت
کرتی ہوئی چولیاں۔ بے آب رنگے ہوئے بالوں کے جُوڑوں میں پیلے گیندے کے مُرجھائے
ہوئے پھول' نیلی نیلی ابھری رگوں والی پھانٹ پھٹی باہوں پہ بے رنگ چوڑیاں' ہاتھوں میں
قلعی کئے ہوئے تانبے کے بڑے بڑے پاندان پھکی ٹوکریاں' میلے کچیلے پیوند لگے بستر بند اور
پانوں کے ٹوکرے —— لہراتی' بل کھاتی' آنکھیں نچاتی یہ تیسری مخلوق جب اسٹیشن سے باہر نکلی
تو اتنی ہا ہو مچی کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دے۔

لاہوریوں نے ایسے مریل ہیجڑے کبھی نہ دیکھے تھے۔ میں واری' میں قربان صدقے'
میری بنو' میری چھنو' تماش گیروں کا ہجوم' دھکم پیل' چٹکیاں' آوازے' ہائے اللہ' ہائے رام'
اوئی اوئی' ہائے میا' ہائے دیّا۔ ترے ہاتھ ٹوٹیں مُردار' تیرا بیڑہ غرق نانجار! —— لاہوریوں نے
وہ لوٹ مچائی کہ توبہ بھلی۔ لوٹ پوٹ' چسکے لیتی پولیس کو ہلکا سا لاٹھی چارج کرنا پڑا۔ بڑی مشکل
سے انہیں ویگنوں بسوں میں ٹھونس ٹھانس کر منزل کی جانب روانہ کیا۔ ابھی گاڑیاں باہر چکر
کے گرد ہی تھیں کہ اک نیا غلغلہ بپا ہو گیا' معلوم ہوا کہ چار ہیجڑے جن میں تین مہمان اور ایک
مقامی تھا' اسٹیشن کے بیت الخلاء سے روتے چلاتے' ہائے وائے کرتے برآمد ہوئے۔ تین
مہمان زنانہ بیت الخلاء میں گھسے تھے اور اپنے والا مردانہ میں۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ وہاں

واقعی رفع حاجت کے لئے گئے یا یہ وہاں رفع شر کے لئے گئے تھے۔۔۔
پولیس کو اب اک نئی صورت حال کا سامنا کرنا پڑا۔ اپنے والا تو اپنا بگڑا ہوا میک اپ
درست کر رہا تھا اور مہمان کھسرے اپنی عزت اور عصمت پہ حرف آنے پر احتجاج کرتے ہوئے
دہائی دے رہے۔ ہجوم تھا کہ پھر جمنا شروع ہو گیا۔ مزید کسی بدمزگی سے بچنے کی خاطر ان
مظلوموں کو انصاف تحفظ دینے کے لئے پولیس انہیں اپنے ساتھ لے گئی۔ اب اسٹیشن کی
رونق کا کچھ حصہ تھانے پہنچ چکا تھا' وہاں بھی انہوں نے اپنی حرکتوں اور واویلا سے سارا تھانہ
اتھل پتھل کر دیا۔ عملے اور حوالاتیوں کی موج لگ گئی۔ تھانے دار صاحب موجود نہیں تھے
عملہ ان سے محظوظ ہو رہا تھا۔ پھر مجبورا" یا محظوظا" پولیس نے سادے کاغذ پہ ان سے بیان لینا
شروع کر دیئے۔ ہیجڑے کی زبان خاموش ہو تو جسم بولتا ہے' دونوں خاموش تو ناز و ادائیں بولتی
ہیں۔ یہاں چار تھے' خاموش کیسے رہتے۔ آخر تنگ آ کر چھوٹے تھانیدار نے ایک ایک کو
علیحدہ' کمروں میں بھجوا دیا اور عملے کے چار آدمیوں کو کہا کہ ان سے علیحدہ علیحدہ بیان لیں۔
باقی دیگنیں جب منزل پہ پہنچیں تو وہاں بھی اک افراتفری تھی۔ دوسرے شہروں سے گروپ آ
رہے تھے' تماشائیوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوئے تھے۔ کسی کو اپنی خبر نہیں تھی تو کسی
کیا خبر لیتے؟۔۔۔

کسی نے حاجی رجی بیگم تک یہ خبر پہنچائی کہ چار ہیجڑوں کو پولیس تھانے لے گئی ہے۔
چار معززین کو لے کر وہاں پہنچا تو پولیس بیان لے چکی تھی۔ بیان دینے والوں کی حالت
دگرگوں تھی' حاجی صاحب کو دیکھتے ہی دہائیاں دینے لگے کہ بہت ہی سخت بیان لئے گئے
خدا کے لئے ہمیں یہاں سے لے چلو۔ عملے نے کہا کہ ابھی یہ کچے بیان ہیں' پکے بیان
تھانیدار صاحب بنفس نفیس خود لیں گے۔ یہ سن کر ان کچے بیان دینے والوں نے دو ہتڑ
سے خود کو پیٹنا شروع کر دیا کہ ہائے ہائے' اب ہم اور کیا بیان دیں گے؟۔۔۔ وہ کانوں کو
ہاتھ لگانے لگے۔ پولیس والے انہیں جانے کی اجازت نہیں دے رہے تھے۔ بڑی مشکل
منت سماجت سے کہیں ان کی جان چھوٹی۔ حاجی رجی بیگم نے ان چاروں کا ماتھا چوما' بدھائی
کہ شگن شگون بڑا سعد ہے۔ بابا ہنگا ثانی سرکار نے تمہاری قربانی قبول کر لی ہے۔۔۔ حکیم
اور دوسرے معززین اس کا منہ دیکھنے لگے۔

جمعرات کی صبح نماز کے بعد تقریبات کا آغاز ہو گیا۔ تقریبا" ایک ہزار چیدہ چیدہ ہیجڑے
دلہنوں کی مانند سج دھج' سولہ سنگار کئے سروں پہ دودھ بھری رنگین مٹکیاں رکھے جن کی گ
کے گرد' زرد رنگ کی چمکیلی مقیش بھرے دوپٹے لپٹے ہوئے تھے' بابا میاں ہنگا ثانی کی



بھری۔ دودھ سبیلوں کے ذریعے زائرین میں تقسیم کر دیا گیا۔ اس کے فورا" بعد بزرگ گرد
ہیجڑوں نے جنہوں نے پیرانہ سالی کے باوجود ڈھیروں میک اپ' زیور' بھڑکیلا لباس پہن رکھا
تھا' مزار کے احاطے میں رقص کیا۔ بوڑھے منہ مہاسے' دانتوں سے خالی تھوبڑے' آنتوں سے
خالی پیٹ' بالوں سے بے نیاز سر۔۔۔ عجیب مضحکہ خیز منظر تھا۔ اس پہ مستزاد' ان کے ناز
نخرے' غمزے عشوے' جیسے سولہ سولہ برس کی چھوکریاں ہوں۔ ہندوستان کے ہیجڑوں نے
چولی لہنگے اور ساڑھیاں' دھوتیوں کی طرح اڑسی ہوئی تھیں۔ یکے بعد دیگرے فیصل آباد'
ساہیوال اور سرگودھا کے ہیجڑوں نے اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ ایک سے ایک حسین
پھلجھڑی سمیں بدن۔ ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی تگ و دو میں پسینہ پسینہ ہو رہے
تھے۔ داد' آفرین' سیٹیاں' نوٹوں کی ویلیں' تماشین ان فنکاروں کی حوصلہ افزائی کر رہے
تھے۔

آج کی تقریب کے میر مجلس' انڈیا کے جگت گرو' مہاراج رانی لکشمی بائی جبکہ مہمان
خصوصی حکیم جمالی تھے اور نظامت کے فرائض میڈم عاشی کے آفس مینجر آفتاب تھے۔
آفتاب صاحب باقاعدہ ہیجڑے تو نہ تھے لیکن ہیجڑوں کے تمام خصائلِ خبیثہ ان میں بدرجہ اُتم
موجود تھے۔ بیسیوں تنجن کی دیگیں پک رہی تھیں۔ مدعو کئے جانے والے اپنے ساتھ حسب
توفیق' گھی' چاول' چینی بطور نذرانہ لے کر آئے تھے۔ کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ لذیذ ترین
تنجن کی خوشبو' دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ مقامی' قریبی بستیوں اور باہر سے خوش فکر' خوش
نظرے' تماشبین' جیب کترے' پیداگیر' تیل مالشیئے جوق در جوق آ رہے تھے۔ لمحہ بہ لمحہ لوگو
کے ہجوم میں اضافہ ہو رہا تھا۔ انتظام اور دیکھ بھال کے لئے پولیس کی نفری موجود تھی۔۔۔
دوپہر سے ذرا پہلے لنگر کھُلا تو خدا کی خدائی اُمڈ آئی۔ لقمہ اٹھاؤ تو گھی نچڑے' ہاتھ' منہ' کپڑے
دیسی گھی سے لتھڑے۔ ایسا خوش ذائقہ تنجن کہاں کبھی نے کھایا چکھا ہو گا۔ ہیڈ باورچی' حاجی
پری پیکر' داد و تحسین کے ڈونگرے سمیٹ رہے تھے۔

تقریب کے دوسرے حصے میں پشاور' مردان' ہری پور اور پنڈی کے طائفوں نے اپنا اپنا
کمال فن دکھایا۔ صوبہ سرحد کے ایک نوعمر ہیجڑے مسرت شاہین نے ایسا زلزلہ خیز رقص پیش
کیا کہ بڑے بڑے ہیجڑے باز تماشبینوں کے دلوں کے ساتھ ساتھ ان کی نیتیں بھی ڈول
گئیں۔ کئی الائچیاں مٹھیوں میں دبائے' حسرت بھری نظروں سے اشارے کر رہے تھے۔ اس
کم بخت میں ایک عجیب عادت یا ضرورت یہ تھی کہ وہ ہر منٹ بعد پشاوری چلم کا طویل سا کش
کھینچتا' پھر ٹھمکے لگاتے ہوئے آہستہ آہستہ ناک منہ سے دھواں خارج کرنے میں بھی وہ کمال

مظاہرہ کرتا۔ شایان بھی حکیم جمالی کے پاس بیٹھا محظوظ ہو رہا تھا۔ اس خور شمائل نوخیز ہیجڑ
رقص بڑی دلچسپی اور محویت سے ملاحظہ کر رہا تھا۔

بڑے کہتے ہیں کہ خوبصورت عورت پہ ایک شیطان اور خوب رُو نوخیز لڑکے پہ د
شیطان مسلط ہوتے ہیں۔ اس تیسری جنس پہ شاید شیاطین کے پورے جیش کے جیش قا
ہوں گے۔ عورتوں میں بڑی بڑی خوبصورت' کافر ادا اور عشوہ پیشہ ہوئی ہوں گی' جن کی
آفرینیوں اور غمزہ طرازیوں کے آگے' بڑے بڑوں عشق پیشہ جغادریوں کے پِتّے پانی ہو
ہوں گے مگر تاریخ اور کتابیں بتاتی ہیں کہ اس جنس میں بھی ایسے ایسے نادرِ روزگار' یکتا
زمانہ' لولوٗ مرجان ہو گزرے ہیں' جن کے روبرو نسائیت کی نزاکتیں' حسن و جمال کی طراو
اور طرب و انبساط کی ساری حلاوتیں پانی بھرتی دکھائی دیتی ہیں۔

شایان محسوس کرنے لگا جیسے وہ اس پری پیکر میں خود موجود ہو۔ بعد میں سیالکو
نارووال' شکر گڑھ اور ڈسکہ' گوجرانوالہ کی ٹولیوں نے رنگ جمانا چاہا مگر وہ مولوی مدن سی با
کہاں؟--- شایان سردرد کا کہہ کر اٹھ آیا۔ حکیم جمالی کے ڈیرے پہ کلکتے والے گرو مہ
شوبھا دیوی اپنے دو تین چیلوں سے جسم دبوا رہے تھے۔ بے حد لاغر کمزور' سفر کی صعوبت
نڈھال کیا ہوا تھا۔ حاجی رجی بیگم نے بتایا تھا کہ انہوں نے دوسرا جنم لیا ہوا ہے۔ پہلے جنم میں
کاشی کے گندھر مندر میں ایک نرتکی کے روپ میں تھے۔ مندر کے مہان پروہت رستوارا
نے اپنی واسنا کامنا پوری نہ ہونے کارن اسے شراپ دیتے ہوئے' دیوی کے چرنوں میں بلید
چڑھا دیا تھا۔ دو سو برس بعد اس کا دوسرا جنم کلکتہ میں کالی مائی کے ایک بھگت جوتشی رام د
کے ہاں ہوا' چونکہ یہ پیدائشی ہیجڑا تھا۔ بھگت نے اسے کالی ماتا کا بھگت بنا کر مندر سیوا پہ لگا
ذرا سیانا ہوا تو جنتر منتر' جنم کنڈلی' ریکھا جوت جوتش سیکھنے لگا۔ قد کاٹھ' انگ رنگ کے
ہیجڑوں والی جبلت بھی جاگ پڑی۔ سیانوں نے کہا ہے کہ ہیجڑا ہیجڑوں میں اور ہاتھی ہاتھیوں
ہی خوش رہ سکتے ہیں۔ یہ مندر اور گرو سے ناتا توڑ کر اپنے ہم جنسوں سے آملا۔ نوعمری کا
نوچندری کی چاندنی مانند کھلا رہا۔ کھوں کھوں کا وقت آیا تو اپنے گیان' عمر اور جوتش ودیا کے
گرو بن گیا۔--- اندر پہنچ کر شایان نے بڑی سعادت مندی سے سلام کیا۔

"جگ جگ جیئو' بچہ!" گرو نے اک نظر دیکھتے ہوئے' دُعا دی۔

شایان بڑے ادب سے سر جھکائے ایک طرف بیٹھ گیا۔

"ہمارے پاس آؤ' چندا!---"

شایان اپنی جگہ سے اٹھا اور گرو کے چرنوں میں جا بیٹھا اور لاشعوری طور پر اس کے



پکڑ لیئے۔ پولے پولے پنڈلیا دابنے لگا۔

"ناہیں' بچہ---!" وہ اس کے ہاتھ روکتے ہوئے پیار سے بولے۔ "سیوا کے لئے بالک موجود ہیں' تم دھیرج سے شانت ہو کو ہمارے پاس بیٹھو---"

تعارف تو پہلے ہی حاجی رجی بیگم نے کروایا ہوا تھا' سر جھکا کر خاموش بیٹھ گیا--- چند لمحے وہ اس پیار بھری نظروں سے دیکھتے رہے' پھر بڑی رسانی سے پوچھنے لگے۔

"بٹوا! دکھائی پڑت ہے' من میں کوئی کامنا کانٹا بنی ہوئی ہے--- بولو' چھپاؤ ناہیں---"

شایان' من ہی من میں وہ چونکا ضرور مگر کسی حیرت کا اظہار کیئے بغیر عرض کرنے لگا۔

"مہاراج! سنا ہے' آپ جوتشی بھی ہیں--- کچھ میرے بارے میں بتائیں؟"

وہ بغور اسے دیکھتے ہوئے دھیرے دھیرے کہنے لگا۔ "بالک! پرنتو مٹ کی ماٹی' جوتش وِدیا' مہا دھیان گیان اور تپسیا کا استھان ہے۔ کالی ماتا کی جے کے کار کے کارن' جیوتش درپن سے ایک آدھ چھایا اکھر دِکھے تو کہت دیتے ہیں۔ ماتھے' منہ پہ گہری نظریں گاڑتے ہوئے پھر بولے۔ تمرے جیون درپن سے ناری روپ چھایا دکھائی پڑت ہے۔ جیون شوبھا اوش' مایا مریادہ کا ملن--- تمرا نروان ناچ نرت میں ہے جگ میں جگ مگ ہو گی۔ چنتا چھوڑو' من شانت رکھو اور روپ دھار کر روپا بنو--- جیوتش یہی کرم بتاتا ہے۔"

زبان لہجہ سمجھ میں آنے والا نہیں تھا' اس کے باوجود ایک ایک شبد مکمل معنی و مطالب کے ساتھ سمجھ میں آ گیا تھا۔ اسے یوں لگا جیسے اس کی من کامنا پوری ہو چکی ہو۔ اس کا اندر بول اٹھا کہ یہی اس کا انت ہے' یہی اس کا مقدر ہے۔ وہ جیسے واقعی شانت ہو گیا' دریافت کرنے لگا "مہاراج! مجھے اب کیا کرنا ہو گا---؟"

"گرو دکھشا لینی ہو گی' سہاگن بننا ہو گا--- کایا چھایا پلٹ ہو گی۔" گرو نے آگیا دی۔

☆☆☆

عرس کے آخری روز حاجی رجی بیگم کی تاج پوشی کے بعد انتہائی رازداری سے شایان کی کلائی پہ گرو رکھشا کی ڈوری باندھی گئی۔ کلکتے والے گرو مہانتو شوبھا دیوی نے اپنے دست مبارک سے گرو رتنا کی رتن جوت بندیا اس کے ماتھے پہ سجائی' اپنے ہاتھوں موتی چور منہ میں رکھا۔ تمام سرکردہ گروؤں نے منہ ماتھا چوم کر بدھائی دی' مبارک سلامت ہوئی۔ باقاعدہ شاگردی اور پابندی بندھن کی رسم' عرس کے ایک ہفتہ بعد ٹھہرائی گئی تھی۔ اس کے لئے انتہائی رازداری اور خصوصی انتظامات کا اہتمام کیا گیا تھا۔ مدعوئین میں حکیم جمالی' عامل ظہوری شاہ' چیدہ چیدہ چند معزز بوڑھے ہیجڑے اور رفیق ڈوگر شامل تھے۔ اس روز حاجی رجی

بیگم کے ڈیرے پہ بڑے کمرے کو بڑی شان و شوکت سے سجایا گیا تھا۔ تازہ گیندے کے پھولوں، بسنت بہار اتری ہوئی تھی۔ اگربتی کی سحر آگئیں خوشبو نے ماحول کو خوابناک بنا دیا ہوا تھا۔ کھانے پینے کا خصوصی انتظام تھا۔ شایان مٹھائی کی بڑی ٹوکری' کمخواب کا جوڑا' کشمیری شالہ' سچے تِلّے کی سلیم شاہی پیزار' پانچ تولہ وزنی طلائی کلائی بند نذر گزارنے کے لئے لایا تھا۔

★★★

نو بجے شب حاجی صاحب نے شایان کو اپنے روبرو دو زانو بٹھالیا۔ کافی دیر مراقبے میں ڈوبے' زیرلب کچھ بڑبڑاتے رہے۔ وقفہ وقفہ اس پہ جھاڑ پھونک بھی کرتے رہے۔ واسکٹ سے ست رنگی سوت کی بٹی ہوئی ڈوری نکال کر اس کی دائیں کلائی پہ باندھی۔ ما... سیندور کا ٹیکا لگا کر بالوں میں الٹی کنگھی پھیری مانگ میں افشاں بھری' آنکھوں میں ڈمبل... لگایا۔ عرق گلاب میں ہلدی' مشک کافور پھل پھٹکری اور دودھ ملا کر چہرے پہ مساج کی' پھر... بڈھے ہیجڑے کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ اس نے اس کے گلے کے گرد دنیا تولیا ڈال کر... پرانے زنگ آلودہ کھلے استرے سے اس کی برائے نام داڑھی مونچھ کے بال مونڈھے۔ چ... پہ ابٹن ملا' لپ اسٹک اور غازہ لگایا۔ اس دوران چار بوڑھے ہیجڑے زرد رنگ کے دوپٹے چاروں کونے تھامے اس کے اوپر سایہ فگن رہے۔

حاجی صاحب پھر مراقبے میں ڈوب گئے۔ ایک نوعمر خوبصورت ہیجڑا' زرق برق پہنے' ایک طشتری میں گھٹی ہوئی حنا اور چمکتے ہوئے گھنگرو لئے نمودار ہوا۔ ہاتھ پیروں... بندی کے بعد پگ میں گھنگرو ڈال دیئے گئے۔ سر پہ کھڑے ہیجڑے اوڑھنی اس کے سر... کر غسل خانے کی جانب لے گئے۔ اس عرصے میں حاجی رجی بیگم نے لگن منڈپ تیار کر... درمیان لوہے کے تسلے میں چندن کا برادہ کچا عود' دیسی گھی ڈالا۔ چار رنگین مٹی کی... دودھ پانی' شہد اور گھی ڈال رکھی گئیں۔ چار چراغ روغن زردے سے بھرے گئے۔ سازندے ساز سر کرنے بیٹھ گئے۔

پچھلے کمرے سے کچھ بنے سنورے مسکراتے ہیجڑے برآمد ہوئے۔ طبلچی نے انگلیاں لہرائیں' شہنائی نے تان اڑائی اور پھر دیکھنے والی آنکھیں خیرہ ہوگئیں۔ اک ماہتا... جس کی ضوفشانی سے کمرہ رنگ و نور سے منور ہوگیا۔ کون کافر تھا جو کہتا کہ اس مہ لقا' ادا' ملاحت و جمال کے حسین پیکر میں شایان نامی لڑکا ہے۔ آبِ رواں کی پشواز' سہارن... سلک کی چولی انگی' شنواری موی ساٹن کا چوڑا سی مہرو چوڑی تنگ پائجامہ' قوس... جھلوٹوں کا لہریا دوپٹہ' پگ میں جے پوری منقش چپل۔ سولہ سنگھار' وگ کی لمبی چٹیا...



جان لوا' عالم بالا سے اس دھرتی پہ آگئی ہو۔

شایان حاجی صاحب کے چرنوں میں ریشم کی لچھی کی مانند سمٹ گیا۔ بوڑھے کپکپاتے ہاتھوں نے آشیرباد دی' نوٹوں کی موٹی گڈی نچھاور کی پاؤں میں پازیب باندھی گئی۔ شایان کی خوبصورت آنکھوں سے دو آبدار موتی گرے' نئے جنم پہ یا اپنے مقدر پہ ـــــ اشارہ ہوا' طبلے پہ چوٹ لگی تو سارنگی کے تار بھی لرز کر جھنجھنا اٹھے۔ رفیع عرف ریشماں نے ناچنا شروع کر دیا۔ ناچ گانے کے بعد حاجی صاحب کے حکم پہ دو مضبوط ہیجڑوں نے شایان کو چت لٹا دیا۔ اس کی پشواز سرکائی' حاجی صاحب نے ایک کھلے منہ ہاتھی دانت کی ڈبیا سے کسی محلول سے بھیگی ہوئی کالے بالوں کی ایک ڈوری نکالی۔ دو تین منٹ کے اس عمل کے بعد اسے اٹھا کر بٹھا دیا گیا۔ بدھایاں' مبارکیں شروع ہوگئیں۔ ہیجڑوں نے شگن کے گیت شروع کر دیئے۔ دیسی گھی کا چھڑکاؤ ہوتے ہی ارد گرد متجسس چہروں کے آئینوں پہ شعلوں کے عکس کا رقص شروع ہوگیا۔ بیر' بجری کی کڑاہی' شایان کو کھلائی گئی۔ پاس ہی رفیق ڈوگر ماتھے پہ گیندے کے پھول باندھے' آنکھوں میں حرص و ہوا کی خباثتیں لئے ہوئے شایان کو للچائی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ظہوری شاہ کے ڈیرے' اس رات کا تصور کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں ایک شیطانی چمک عود آئی ــــ حاجی صاحب نے' شایان کی ٹھوڑی کے درمیان ننھے سے ڈمپل کے نیچے شہادت کی انگلی رکھی' اس پورن ماشی کے چاند ایسے چہرے کو اوپر اٹھایا۔

"میں صدقے' میں قربان ــــ میری بچی! سر اٹھا' سن' غور سے سن! یہ سر اپنے خدا کے علاوہ کبھی کسی کے آگے مت جھکانا۔ آج سے تیرا نیا جنم ہو رہا ہے۔ جو جیون تو بتا چکی' اسے بھول جا۔ تو پوتر اور نردوش ہے ــــ کرموں کا لکھا ہو کر رہتا ہے اور جو کچھ ہو جاتا ہے' وہی مالک کی مرضی ہوتی ہے۔ انسان کو ہر حال میں اپنے جیون کے دن پورے کرنے پڑتے ہیں۔ مالک نے جہاں نر اور ناری اتارے ہیں۔ وہیں ایک اور روپ بھی پیدا کیا ہے۔ جو نر ہے نہ ناری ــــ جنم لینے والا اپنی اچھیا اور سمتھا لے کر نہیں آتا' وہ تو صرف جیون کا بوجھ اور لوبھ لے کر آتا ہے۔ تو بھی جیون کا بوجھ اٹھا' لوبھ چھوڑ۔ جیسا جیون ملا' قبول کر ــــ" تھوڑی دیر رُکے' پھر کہنے لگے۔ "مہاراج کی رائے اور میری بدھی کے مطابق تو پُرش منش کا جنم ہے' ناری نائیں پر ناریوں سے بڑھ کر سندر' سکھی سدھار تھ ــــ تو کسی کو جنم دے سکتی ہے' نہ دلا سکتی ہے۔ تیرے جیون کی ابھاونا' تیرے انت پہ ختم ہو جائے گی۔ آج سے تو میری بیٹی اور ہم سب تیرا پریوار ہیں' ہم سب تیری سہایتا کریں گے۔"

کچھ ہیجڑے ڈھولک لے کر بیٹھ گئے جیسے رخصتی کے الوداعی گیت گانے والے ہوں' حاجی

صاحب نے انہیں رکنے کا اشارہ کرتے ہوئے پھر کہنے لگے۔ "ہماری رسم ریت اور پرکھو
کے طریقے کے مطابق تمہیں رفیق ڈوگر صاحب سے دُوا کرنا ہوگا' اس رسم کے بعد تم ک
طور پر ہماری برادری والی ہو جاؤ گی۔۔۔ تمہیں ہر قسم کا تحفظ دیں گے' تمہاری ضروریا
خیال رکھیں گے۔۔۔"

چند لمحے کے لئے خاموشی طاری ہوگئی۔ پھر حاجی صاحب نے حکیم جمالی اور ظہوری
سے حلف لینے کے لئے کہا۔ پھر شایان کی خواہش پہ ہی اس کا نیا نام شانی تجویز ہوا۔ یہ نام
کو پسند آیا۔ کچھ رسومات کے بعد اس کا آنچل' رفیق ڈوگر کی قمیض کے پلو سے باندھا گیا'
دو جے کو انگوٹھیاں پہنائی گئیں۔ شانی کو بہت سی دُعاؤں کے ساتھ حجلۂ عروسی میں داخل کر
جہاں شیطان صفت رفیق ڈوگر بڑی بے تابی سے اس کا منتظر تھا۔

★★★



نین تارا تو پہلے ہی بیمار تھی۔ سالگرہ کے رونق میلے میں قدرے سنبھلی لیکن اب پہلے
سے زیادہ آزردہ ہوگئی۔ شایان کے مایوس کن برتاؤ' رویئے' خط اور اس کے فیصلے نے اسے پھر
پلنگ پہ ڈال دیا تھا۔ کھانا پینا چھوٹا تو بے سکتی اور نقاہت سے ہڈیوں کا پنجر بن کر رہ گئی۔ ہونٹوں
پہ جیسے چپ کی مہر سی لگی تھی۔ دن رات کے کسی حصے میں جب بھی ذرا سنبھلتی تو بھیگی آنکھوں
سے خط پڑھنے بیٹھ جاتی۔ دل بری طرح ٹوٹ چکا تھا' مستقبل کے سہانے سپنے دھواں دھواں ہو
چکے تھے' کچھ بھی سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ مایوسی اور پریشانی کی یلغار نے خیالات کو بھی بری
طرح پراگندہ کر دیا تھا۔ وہ خودکشی کا سوچتی تو کبھی یوں ہی پڑے پڑے گھٹ مرنے کا ارادہ کرتی۔
کبھی شایان کی مجبوریوں' رویئوں مستقبل کی سوچوں سے سر پھوڑتی۔ خط کے ایک ایک لفظ'
ایک ایک فقرے کو بار بار پڑھ کر بین السطور مطالب کو سمجھنے کی کوشش کرتی اور ایسے میں
کہیں وہ اسے بڑا عظیم نظر آتا تو کہیں بزدل' بے وفا' ہرجائی اور ذہنی مریض۔۔۔ گھر والے
اس کی خاموشی اور رویئے سے بوکھلا اٹھے تھے۔ اکلوتی لاڈلی بیٹی' ناز و نعم سے پلی ہوئی جوان'
خوبصورت اور تعلیم یافتہ۔۔۔ دوا دارو' علاج معالجے سب بیکار ثابت ہو رہے تھے۔ وہ کسی
سے بھی تعاون نہیں کر رہی تھی۔ دوائیں پڑی رہتیں۔ خوراک' پھل کی جانب آنکھ اٹھا کر بھی
نہیں دیکھتی تھی۔ مردم بیزار' ہمسائے میں زلفی کے گھر والے بھی بہت پریشان تھے' پل پل کی
خبر رکھتے' دلداری اور دلجوئی کرتے مگر کسی کو بھی وہ خاطر میں نہیں لا رہی تھی۔ شیخوپورہ میں
پھوپھی' پھوپھا' بہنوں کو خبر ہوئی تو وہ بھی دوڑے آئے مگر اصل وجہ کسی کی سمجھ میں نہیں نہ
آئی' نہ ہی اس نے شایان کے خط کی کسی کو ہوا لگنے دی تھی۔ شایان خود کئی روز سے غائب تھا'
منشی کرم الٰہی بھی اپنے حال میں مست تھا۔ نین تارا کی پریشانی کی وجہ سے شایان کے والدین
بھی ابھی تک شایان کو نہ مل سکے تھے۔

شام کے وقت نین تارا کا بڑا بھائی قاسم علی کسی کام سے اس کے کمرے میں گیا تو وہ چت

لیٹی' سینے پہ ہاتھ رکھے بے سدھ سوئی ہوئی تھی' ہاتھ کے نیچے نیلے رنگ کا کاغذ تھا اور چہرے پہ عجیب سی مردنی چھائی ہوئی تھی۔ پیلی پھٹک رنگت ——— اسے اس حال میں دیکھا تو بھائی کا کلیجہ دہل کر رہ گیا' انجانا سا خوف اس کے رگ وپے میں بجلی کی طرح جھٹکے مارنے لگا اور بُرے بُرے وسوسے سر اٹھانے لگے۔ چیخ نکلتے نکلتے حلق میں پھنس گئی' سُرعت سے آگے بڑھ کر کاغذ اٹھا کر جلدی جلدی پڑھنے لگا۔ الٹی سیدھی چند سطریں پڑھنے کے بعد وہ نین تارا کی جانب متوجہ ہوا مگر وہ گہری نیند سوئی ہوئی تھی' سانس آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ جسم ٹھنڈا تھا' ماتھے پہ پسینے کی بوندیں چمک رہی تھیں۔ اس کی جانب سے قدرے مطمئن ہو کر' پیچھے صوفے پہ بیٹھ کر خط پڑھنے لگا۔ اسی دوران اس کی امی بھی کسی کام سے بے آہٹ سی اندر داخل ہوئیں۔

"قاسم! کیا پڑھ رہے ہو ——؟" وہ پاس بیٹھ کر پوچھنے لگیں۔

وہ ماں کے سوال کا جواب دیئے بغیر' خط پڑھنے میں منہمک رہا۔ کوئی جواب نہ پا کر پریشان سی اٹھی اور نین تارا کے پاس بیٹھ کر تشویش بھری نظروں سے اسے دیکھنے لگی' دوپٹے کے پلو سے اسکے ماتھے پہ آیا پسینہ صاف کیا اور وہ دوبارہ قاسم کے پاس آ بیٹھی۔

"خیر تو ہے' بیٹا! —— یہ کیا پڑھ رہے ہو' کچھ مجھے بھی تو بتاؤ ——؟"

قاسم' بوڑھی پریشان ماں کو کیا جواب دیتا' وہ تو شاید سن ہی نہیں پا رہا تھا کہ ماں کیا کہہ رہی ہے۔ کان بہرے' زبان گنگ اور صرف آنکھیں زندہ تھیں جو کاتب تقدیر کا نوشتہ پڑھ رہی تھیں یا پھر دل زندہ تھا جو بے طرح دھڑک دھڑک کر پھٹنے کو آ رہا تھا —— ماں نے پھر اپنے سوال کا جواب نہ پا کر غصے سے اس کے ہاتھ سے خط چھیننا چاہا تو شکستہ چرمر خط کا آدھا حصہ ماں کے ہاتھ میں آ گیا' وہی حصہ جو وہ پڑھ چکا تھا۔ اس کی محویت اب بھی نہ ٹوٹی ——' آدھا حصہ وہ پڑھ رہا تھا۔ ان پڑھ بوڑھی ماں' آگ لگی بے قرار آنکھوں سے باری باری خط کے دونوں ٹکڑوں کو دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ آخر ان پہ کون سا خدائی پیغام لکھا ہوا ہے کہ بیٹا' ماں کی بات پہ بھی توجہ نہیں دے رہا؟ —— قاسم خط پڑھ کر خالی خالی نظروں سے نین تارا کو دیکھنے لگا' ماں کی موجودگی کا احساس ہوا تو کھڑے ہو کر کہنے لگا۔

"آپ نے کچھ کہا تھا ——؟"

وہ پھٹا ہوا کاغذ کا ٹکڑا دکھاتے ہوئے پوچھنے لگیں۔ "یہ سب کیا ہے' کس کا خط ہے؟ اس میں کیا لکھا ہے؟؟"

وہ ماں کے ہاتھ میں پھٹے ہوئے ٹکڑے کو دیکھتے ہوئے بڑبڑایا۔ "یہ دو ٹکڑے ہیں ایک خط کے دو ٹکڑے' دو زندگیوں کے ٹکڑے' عزت و آبرو کے ٹکڑے ——"



وہ ماں کا ہاتھ تھامے انہیں دوسرے کمرے میں لے آیا اور ٹوٹے ہوئے لہجے میں خط پڑھ کر سنایا ——

اس رات گھر میں چولہا نہیں جلا۔ قاسم نے ماں باپ سے مشورے کے بعد اپنے پھوپھا' پھوپھی کو بھی خط دکھایا۔ سب سر پکڑ کر بیٹھ گئے' رونا دھونا شروع ہو گیا۔ نین تارا بھی اس صورت حال سے باخبر ہو چکی تھی مگر اس کے باوجود وہ خاموش تھی یا پھر اس کے پاس کہنے سننے کے لئے کچھ تھا ہی نہیں' جب کشتی ہی ساتھ نہ دے تو ناخدا سے کیسا شکوہ؟ —— فوراً" منشی کرم الٰہی کو طلب کیا گیا۔ اس نے بساط الٹی ہوئی دیکھی تو سارے حالات و واقعات من و عن بیان کر دیئے۔ شایان کی ماں بے ہوش ہو گئی اور باپ سر ڈال کر بیٹھ گیا۔ جن کا بھٹہ بیٹھ جائے' درجہ اول کا مال بے کار کھنگر روڑے میں تبدیل ہو جائے تو وہ ایسے ہی سر جھکائے ٹھوڑیاں سینے سے لگائے بیٹھ جاتے ہیں اور سر اللہ کے خوف سے جھکے یا ندامت سے' وہ ہر دو حالت میں اس ریگ گھڑی کی مانند ہوتا ہے جو ریزہ ریزہ نیچے سے بھر کر اوپر سے خالی ہو جاتی ہے۔ دلیلیں بیکار' دکھ بھاری' درماں ناپید اور درگھٹنائیں در آتی ہیں۔ ایسی ہی کسی کیفیت سے شایان کا باپ دوچار تھا۔ وہ کسی دوسرے کو کیا دوش دے' کیا کسی سے جا کر کہے یا پوچھے اور جب اپنی مرغی ہی دوسرے کے گھر جا کر انڈے دے تو کسی کا کیا قصور؟ —— واویلا یا کسی کو دشنام دینے سے اپنی ہی عزت مزید خراب ہوتی۔ یہ لوگ کسی کو منہ دکھانے کے قابل ہی نہ رہے تھے' نہ ہی وہ اپنے لاڈلے کو بے دخل کر سکتا تھا' نہ ہی اور کوئی معقول باعزت حل اس کی سمجھ میں آ رہا تھا۔ وہ اپنے آپ کو بڑا کمزور' بے بس محسوس کرنے لگا۔ شرمندگی کے بوجھ نے اسے زمین میں گاڑ دیا تھا لیکن حالات کیسے ہی دگرگوں کیوں نہ ہوں' قدرت کسی نہ کسی طرح اور کہیں نہ کہیں سے کوئی مداوا بھی پیدا کر ہی دیتی ہے' پتھریلی دیواروں میں سے بھی کوئی روزن نکل آتا ہے۔ حوصلہ' کوشش' صبر اور استقامت سے بڑے سے بڑے لاینحل مسائل حل ہو جاتے ہیں —— کچھ سوچتے ہوئے اس نے قاسم کے کندھے پہ ہاتھ رکھا اور حوصلہ دینے لگا۔

"جو ہوا' سو ہوا۔ حوصلے اور صبر سے کام لو —— مایوس ہونے سے کچھ نہ ہو گا۔"

قاسم بڑے تحمل سے کہنے لگا۔ "پھوپھا جی! میں شایان بھائی کو صرف اس حد تک قصوروار سمجھتا ہوں کہ اس نے اچھے لوگوں کی صحبت اختیار نہیں کی اور جہاں تک اس کی بیماری اور بزدلی سے انکار کا تعلق ہے' اس معاملے میں وہ بے قصور اور بے بس ہے —— ذرا سوچیں! ان حالات میں وہ اور کر' اور کہہ بھی کیا سکتا ہے؟ —— ٹھیک ہے' وقتی طور پر ہم سب کو دکھ ضرور پہنچا ہے لیکن ہم سب کے وسیع تر مفاد کی خاطر اس کا یہ فیصلہ درست سمجھا جا سکتا

ہے۔۔۔"۔

اس کے پھوپھا نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے پوچھا۔ "اب ہمیں کیا کرنا چاہئے؟"

"اب ہمیں اپنی اور اپنے خاندان کی عزت بچانی چاہئے۔۔۔" قاسم نے فوراً جواب دیا۔

"۔۔۔شایان جن راستوں پہ چل نکلا ہے اس سے تو بچتا ہوا دکھائی نہیں دیتا۔" ٹوٹے ہوئے بوڑھے باپ نے جواب دیا۔

اب قاسم کے صابر اور شاکر باپ نے پہلی مرتبہ زبان ہلائی۔ "بھائی جی! کوشش کر لینے میں کیا حرج ہے۔ ممکن ہے' اللہ تعالیٰ کوئی بہتری کی صورت پیدا فرما دے۔۔۔ مایوسی سے کام نہیں چلے گا۔" وہ اس کے کاندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے دلاسہ دینے لگا۔ "شایان تمہارا ہی نہیں' ہمارا بیٹا بھی ہے۔۔۔"

ایک بار پھر منشی کرم الٰہی سے تفتیش کا سلسلہ چل نکلا۔ وہ ایک ایک بات تفصیل سے بتا رہا تھا اور یہ شریف لوگ سر جھکائے' زمین میں گڑے ہوئے' دل پہ پتھر رکھے سب کچھ سن رہے تھے۔ سردست کوئی مناسب لائحہ عمل ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ بالآخر منشی کو تاکید کی گئی کہ شایان کو تلاش کر کے لے آئے۔

***

شرمندگی کے احساس کے بوجھ تلے دبا بوڑھا شایان کا باپ' قاسم اور اس کے والدین جب نین تارا کے کمرے میں داخل ہوئے تو وہ دروازے کی جانب پشت کئے اپنے بیڈ پہ لیٹی ہوئی تھی' اسکی ماں سرہانے بیٹھی نرم نرم ہاتھوں سے اس کا سر داب رہی تھی۔ بوڑھے پھوپھا نے حسب عادت ہلکے سے کھنکارتے ہوئے اپنی موجودگی کا احساس دلایا تو اس کی ماں نے سر پہ دوپٹہ درست کرتے ہوئے اسے بیٹھنے کے لئے کہا۔ اس کے لہجے کی سرد مہری سے صاف واضح تھا کہ حالات کے کروٹ لیتے ہی ان کی گرم جوشی میں وہ اب پہلے والی بات نہیں رہی۔ صوفے پہ بیٹھتے ہی اس نے نین تارا کی طبیعت کے متعلق پوچھا۔

"دیکھ لیں' بھائی جی! آپ کے سامنے ہی ہے۔۔۔" بہن نے سرد مہری سے جواب دیا۔

شایان کا باپ اٹھ کر اس کے پاس پلنگ پہ آ بیٹھا۔

"ہوش کرو' بیٹی! تمہارے پھوپھا آئے ہیں۔۔۔" ماں نے اسے ہلاتے ہوئے کہا۔ نین تارا کے نین کٹورے چھلکے ہوئے تھے' آہستہ سے کروٹ لیتے ہوئے اس نے پھوپھا کی جانب دیکھا اور پھیکی سی مسکراہٹ چہرے پہ لئے سلام کیا۔ ماں نے کمر کے نیچے تکیہ درست کر



ہوئے اسے سہارا دے کر بٹھا دیا۔

"بیٹا! اللہ تمہیں صحت دے۔۔۔ یہ موقع لمبی بات کرنے کا نہیں۔ تم بیمار ہو اور میرا سینہ بھی غم سے پھٹا ہوا ہے۔ یہ بتانے کی بھی ضرورت نہیں کہ تم ہمیں کتنی عزیز ہو مگر بدقسمتی سے جو حالات سامنے آئے ہیں ان کی وجہ سے بدمزگی کا پیدا ہونا قدرتی امر ہے۔ لیکن ہماری رشتہ داری کی نوعیت ہی ایسی ہے کہ ہم اپنے درمیان کوئی بدمزگی یا غلط فہمی زیادہ دیر نہیں رکھ سکتے اس لئے ہمیں بدلی ہوئی صورت حال کے تناظر میں کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پیشتر نہایت سمجھداری' دوراندیشی اور تحمل سے کام لینا پڑے گا۔۔۔"

نین تارا کے والد نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے گویا اس کی تائید کی۔ وہ پھر کہنے لگا۔

"بیٹا! جو کچھ بھی ہوا' اس میں قسمت کا زیادہ دخل دکھائی دیتا ہے۔ ہم تمہارے دکھ کو اچھی طرح سمجھتے ہیں اور مجھے یقین ہے' ہماری طرح تم بھی بدنصیب شایان کی مجبوری اور مرض کو اچھی طرح جانتی اور سمجھتی ہو۔ ہم تمہاری زندگی برباد کرنا نہیں چاہتے بلکہ تمہیں ہنستا بستا' خوشحال اور خوش و خرم دیکھنا چاہتے ہیں۔ شایان بھی تمہارے بارے میں ایسے ہی جذبات رکھتا ہے جس کا ثبوت اس کا یہ فیصلہ ہے۔۔۔" پھر نین تارا کا کمزور ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے پیار اور عاجزی سے کہنے لگا۔ "بیٹا! تم ہماری مجبوری کے اس فیصلے کو قبول کر کے اپنے بدنصیب پھوپھا پہ احسان کرو گی۔"

پھر وہ چھلکتی ہوئی آنکھوں کو چھپاتے ہوئے باہر نکل آیا۔

***

شایان عرف شانی کو حاجی رجی بیگم کے ڈیرے پر والد صاحب کے آنے اور نین تارا کی علالت کی اطلاع مل چکی تھی اور یہ تاکید بھی کہ فوراً" آ کر ملے مگر یہاں تو کیفیت ہی دگر تھی۔۔۔

ابھی ان کے پاؤں میں مہندی لگی ہے
کہیں - آنے جانے کے قابل نہیں ہیں

نئی نویلی دلہن کی طرح نخرے دکھانے اور ناز اٹھوانے کے دن تھے۔ سارا ڈیرہ خدمت اطاعت پہ مامور اور "بسم اللہ' جی صدقے' قربان" کے آوازے۔ نت نئے لباس' طرح طرح کے پکوان۔ مشاطے بال بال موتی پرونے' انگ انگ اٹبن ملنے میں مصروف۔ حاجی رجی بیگم بات بات پہ "جی جان' دلہن' بنوا' بنو' چندا" سے رطب اللسان۔۔۔ چند روز میں ہی کایا پلٹ گئی تھی' ایسا رنگ روپ آیا کہ دیکھا کرے کوئی۔ چہرے سے رہے سہے روئیں بھی موم

تھرڈنگ سے صاف کر دیئے گئے تھے۔ مسکارے سے آنکھیں تیر تھیں تو ابرو چن کر کمان
دیئے گئے تھے۔۔۔ عامل ظہوری شاہ کا ملازم جو یہ پیغام لایا تھا' ابھی تک جواب کے انتظار
بیٹھا ہوا تھا اور شانی تذبذب کے عالم میں حاجی صاحب کے حکم کی منتظر تھی۔

"میری جان! میں صدقے' میں واری۔ نصیب دشمناں' پریشان کیوں ہو گئی ہو؟۔۔۔
جم جاؤ۔ اری چلی جا' ناں! ۔۔۔ ابا آئے ہیں' بلا بھیجا ہے۔ تمہاری بہن بھی بیمار ہے۔۔۔
بیماروں اور بزرگوں کی خبر گیری کرنا بڑے ثواب کا کام ہے۔۔۔"

★★★

جمعہ کی شام کھلی گلی میں لڑکے' لونڈے کرکٹ کھیل رہے تھے۔ نین تارا کے چھو
بھائی بھی کھلاڑیوں میں شامل تھے' زلفی بیٹنگ کر رہا تھا۔ وکٹیں نین تارا کے گھر کے دروا
کے عین سامنے گڑی تھیں۔ اچانک موڑ مڑتے ہوئے ایک ٹیکسی گلی میں داخل ہوئی' او
سے بال بھی تھرو ہو چکا تھا۔ زلفی نے چھکا لگانے کی کوشش کی تو بال ٹیکسی کی سکرین
ٹکرایا۔ لڑکے ادھر ادھر ہو لئے مگر زلفی کے کہیں کھسکنے کی گنجائش نہیں تھی۔۔۔ ٹی
ڈرائیور بوکھلایا ہوا باہر نکلا مگر زلفی کو دیکھتے ہی نرم پڑ گیا۔ وہ اسے جانتا تھا بلکہ یہ گاڑی ا
کے شوروم سے نکلی تھی۔ علیک سلیک ہوئی تو زلفی نے کہا کہ یار' صبح آکر سکرین بدلوا لی
بات ختم ہو گئی۔ اس عرصہ میں گاڑی کی سواری بھی اتر چکی تھی۔ خوبصورت نفیس لباس
ملبوس' دھان پان سی ایک حسین لڑکی نین تارا کے گھر میں گھس گئی۔ زلفی اسے دیکھتا ر
گیا۔۔۔ صحن میں نین تارا کی امی اور بڑی بھابی کپڑے دھو رہی تھیں۔ انہیں آنے والی کا
خاصا شناسا لگا لیکن پہچان نہ پائیں۔ نین کی کلاس فیلو اور کئی دیگر سہیلیاں آتی جاتی رہتی تھ
یہی سوچا کہ ان میں سے کوئی ہو گی۔

"آؤ' بیٹی! نین سے ملنا ہے کیا۔۔۔؟" نین کی امی نے پوچھا۔

آنے والی نے مسکرا کر سلام کیا' پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔

"جاؤ' بیٹی! وہ سامنے کمرے میں لیٹی ہے۔۔۔"

کمرے میں نین تارا بستر پہ نیم دراز' آنکھیں بند کئے شاید کچھ سوچ رہی تھی۔ اسے آ
والی کی مطلق خبر نہ ہوئی۔ لڑکی کئی ساعتیں کھڑی اسے پیار بھری نظروں سے دیکھتی رہی۔
سرہانے بیٹھ کر ہولے ہولے اس کا سر سہلانے لگی۔۔۔ وہی گھر' وہی کمرا' وہی نقشہ' وہی لو
لیکن آج ہر چیز بدلی بدلی سی لگ رہی تھی۔ اجنبی' اجنبی۔۔۔ اجنبیت اور اپنائیت بھی
جذبوں اور آدرشوں کی راست استواری کی مرہون منت ہوتی ہے ٹھہرے پانی کی سطح کو ا



اور جب شک وشبہ کی کنکری اس میں گرتی ہے تو صورت شکل بگڑ جاتی ہے۔۔۔ کئی صدیاں وہ
نین تارا کو دیکھتی رہی۔ آنسوؤں کی دو موتی جیسی کنکریاں' نین تارا کے ساکت سمندر چہرے
کی سطح پر گریں' کہیں نیچے ہلکا سا ارتعاش ہوا۔ دائرے پھیلنا شروع ہوئے' نین سیپ وا ہوئے
اور پھر بند ہو گئے۔ لڑکی نے آنکھیں پونچھتے ہوئے' راج ہنس کے پر جیسا ہاتھ اس کی آنکھوں
پر رکھ دیا۔

"نین! طبیعت کیسی ہے؟۔۔۔" لڑکی نے سرگوشی کے انداز میں پوچھا۔

نین نے اس کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے جواب دیا۔ "جینے کی کوشش کر رہی ہوں۔
تم بھی خوش رہو اور جینے کی کوشش کرو' شایان!"

لڑکی نے قدرے توقف سے جواب دیا۔ "ہاں' نین! تم بھی جگ جگ جیو' انشاء اللہ! میں
بھی جی لوں گی' تمہاری زلفوں کے سائے میں نہ سہی' دعاؤں کے سہارے ہی سہی۔۔۔"

نین کی امی چائے اور کچھ کھانے پینے کے سامان کے ساتھ اندر داخل ہوئیں۔

"لو' بیٹی! خود بھی چائے پیو اور اسے بھی پلاؤ' اپنی سہیلی سے باتیں بھی کرو۔"

ماں باہر نکلیں تو نین تارا' ماں کے الفاظ پہ چونکی اور کچھ نہ سمجھتے ہوئے آنکھوں پہ سے
اس کے ہاتھ ہٹاتے ہوئے لڑکی کی جانب دیکھنے لگی۔ پھر بھی کچھ نہ سمجھی تو اٹھ کر بیٹھ گئی۔ چند
ثانئے غور سے دیکھنے کے بعد' حیرت سے قریب قریب چیختے ہوئے بولی۔

"شایان تم۔۔۔!" چہرے پہ کئی رنگ آئے گئے۔ "یہ کیا ڈرامہ ہے۔۔۔؟" وہ اٹھ کر
بیٹھ گئی۔

شایان' پلنگ سے اٹھ کر سامنے صوفے پہ اطمینان سے بیٹھ گیا' مسکراتے ہوئے بولا۔
"ہاں' میں۔۔۔ پہلے میرا نام درست کر لو۔ میرا نام اب شایان نہیں' شانی ہے۔ میں نے ناکارہ
شایان کو دفن کر دیا ہے اور اب شانی کے روپ میں نیا جنم لیا ہے۔۔۔"

"کیا کہہ رہے ہو تم' شایان۔۔۔!" وہ حیرت اور خوف سے اس کے سراپے پہ نظریں
ڈالتی ہوئے پوچھنے لگی۔ "خدا کے لئے اب ڈرامے مت کرو' بہت ہو گیا ہے۔ میں پہلے ہی
بہت پریشان ہوں۔۔۔" وہ روہانسو سی ہو گئی۔

شایان پر سکون ٹھہرے لہجے میں بولا۔ "نین! میں نے جب سے حقیقت پہچانی ہے'
ڈرامے کرنے چھوڑ دیئے ہیں۔ جھوٹی امیدوں اور شرمندہ تعبیر نہ ہونے والے سہانے سپنوں
کی جنت میں رہنے کی بجائے حقیقت کے جہنم میں جلنا سیکھ لیا ہے۔۔۔ تم پڑھی لکھی' صاف
ستھرے کھلے ذہن کی مالک ہو۔ تمہیں تو مجھ سے کہیں زیادہ حقیقت پسند ہونا چاہئے۔۔۔"

"اف، میرے اللہ۔۔۔!" وہ دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔۔۔ دونوں جانب خاموشی کی برف سی جم گئی۔ چند لمحوں بعد یہ برف نین کے اندر کی حدت سے پگھلی۔

"شایان! تم۔۔۔ تم جانتے ہو کہ تمہارے اس احمقانہ فیصلے اور شرمناک رویئے سے قیامت ٹوٹی ہے' کیا کچھ ہو گیا ہے اور کیا کچھ ہونے والا ہے۔۔۔" وہ کسی وکیل کی طرح بولی "سوال صرف میری یا تمہاری زندگی کا نہیں ہے' خاندان کی عزت اور وقار کا بھی ہے۔۔۔" اس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگی۔ "ذرا اپنے اس گٹ اپ اور میک اپ کو دیکھو۔ تم کو کیا پہچانتیں' میں خود اب تمہیں نہیں پہچان سکتی۔ تم نے اپنا تو سب بدل لیا حتیٰ کہ باپ کا دیا ہوا نام تک ان کے منہ پہ دے مارا' لیکن کیا تم اپنی خاندانی شناخت' باپ دادا کا خو تبدیل کر سکتے ہو؟۔۔۔ اگر نہیں' تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے پورے خاندان کو ہجڑ دیا۔۔۔"

وہ قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا' اس لمحے شاید وہ بھول گیا کہ کمرے کے باہر کوئی ہے۔ دوسرے نین کے پھوپھا اور پھوپھو اندر داخل ہوئے۔ دونوں لڑکیوں کو بیٹھے دیکھ کر وہ کچھ تذبذب پڑ گئے اور پھر نین سے پوچھنے لگے۔

"بیٹی! تمہارے کمرے سے مردانہ قہقہوں کی۔۔۔"

"یہ قہقہے میرے تھے۔۔۔" شانی اٹھتے ہوئے بولی۔

"یہ تم قہقہے لگا رہی تھی بیٹی۔۔۔؟"

نین تارا نے بات اچک لی۔ "پھوپھا جی! یہ بیٹی نہیں' آپ کے صاحبزادے شایان صا ہیں۔۔۔"

پھوپھا اور پھوپھی دونوں حیرت سے ان دونوں کو تک رہے تھے۔ ان کی بوڑھی آ اور مختل دماغ ابھی تک اس اسرار کو سمجھ نہیں پائے تھے۔ نین نے انہیں بیٹھنے کو کہا اور بو

"آپ حیران نہ ہوں' پھوپھا جی! یہ شایان صاحب ہی ہیں۔ آپ کی طرح میں بھی ا پہچان نہیں پائی تھی۔۔۔ آپ سکون اور آرام سے ان کی بات سنیں اور ان کو سمجھا میری تو کوئی بات ان کی سمجھ میں نہیں اترتی۔"

دونوں کو جیسے سکتہ ہو گیا تھا۔ باپ کی نظریں زمین میں گڑی ہوئی تھیں اور ماں اپنے جگر کو عجیب سی نظروں سے دیکھ رہی تھی' بے چاری کی آنکھوں میں آنسو بھی تو نہیں تھے

"بہتر ہے کہ آپ ماموں' ممانی اور قاسم بھائی کو بلا لیں تاکہ بات صاف ہو جائے۔" شانی نے اسی موڈ میں مشورہ دیا اور ساتھ ہی پرس کھولا' سگریٹ نکال کر ہونٹوں سے لگایا



سگریٹ سلگانے لگا تو ماں نے ایک زور سے دھاڑ لگائی اور سر' منہ' سینہ پیٹنے لگی۔ بھاگے بھاگے نین کی امی اور ابا کے ساتھ قاسم اور کاظم بھی اندر آ گئے۔ وہ اندر کی صورت حال سے بے خبر تھے۔۔۔ شانی سگریٹ کے مرغولے اڑا رہی تھی' سب ہی اسے دیکھ رہے تھے۔ بڑی مشکل سے شانی کی ماں کو چپ کرایا گیا۔ شانی نے ماموں' ممانی' قاسم اور کاظم سے اپنا تعارف خود ہی کرا دیا کوئی جھجک' شرم نہ لحاظ پاسداری' عجیب طوطا چشمی انداز۔ آنکھوں پہ کوئی ایسا پردہ پڑا ہوا تھا کہ چھوٹا بڑا' ادب لحاظ' کسی بات کی پرواہ ہی نہ تھی۔ جیسے اس روپ سروپ نے اس سے ماضی کا اثاثہ چھین لیا ہو۔

"شایان! مجھے تم سے ایسی امید نہیں تھی۔ یہ بیہودہ لباس' یہ مکروہ حلیہ۔۔۔ کیا تم ایسے بے حیا' بے حس اور گفتگو میں اتنے بے لگام ہو گئے کہ تمہاری نظر میں کسی چھوٹے بڑے کا کوئی احساس نہیں۔۔۔؟" باپ جیسے پھٹ پڑا۔

شانی ہلکی سی مسکراہٹ بکھیرے اک شان دلربائی سے سگریٹ کے دھوئیں کے چھلے بنا بنا کر چھوڑ رہا تھا۔ ماں نیم بے ہوش سی پڑی اشک بار آنکھوں سے اسے حسرت بھری نگاہوں سے تک رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ اسے جنم نہ دیتی تو آج یہ ذلت دیکھنی نہ پڑتی یا شاید اپنے کلیجے کے ٹکڑے کی بے بسی اور مجبوری پہ اندر ہی اندر مرمٹی جا رہی تھی۔۔۔ جس طرح ہر ترکش میں ایک آخری تیر ہوتا ہے اسی طرح ہر الجھے ہوئے مسئلے کے آگے کہیں ایک پتھر بھی ہوتا ہے جو سر پھوڑنے کے کام آتا ہے۔ جب ہر کوئی اپنی اپنی بساط کے مطابق سر پھوڑ چکا تو یہ پتھر غنچے کی سی چٹک سے کہنے لگا۔

"آپ کو کچھ اور کہنا ہے۔۔۔؟" شانی نے بڑی بے نیازی سے پوچھا۔

سب ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ آخر باپ اپنا حق استعمال کرتے ہوئے بولا۔

"تم ایسے بے حس' بے شرم سے کچھ کہنا شاید فضول ہی ہے۔۔۔ کب سے سر کھپا رہے ہیں مگر تمہارے منہ سے ایک لفظ تک نہیں نکلا بلکہ الٹا بے شرمی سے مسکرا مسکرا کر سگریٹ پیتے ہوئے ہمارے زخموں پر نمک پاشی کر رہے ہو۔ میں اب اپنے رب سے یہی کہوں گا کہ یا تو میں مر جاؤں یا۔۔۔؟ اس بے عزتی کی زندگی سے تو موت بہتر ہے۔"

وہ کمال بے نیازی سے انگڑائی توڑتا ہوا اٹھا اور بولا۔ "اچھا' میں بھی سوچتی ہوں اور آپ بھی غور کر لیں۔۔۔ اس وقت میرے سر میں شدید درد شروع ہو گیا ہے۔ میں ذرا آرام کرنا چاہتی ہوں' شام کو بات ہو گی۔۔۔" وہ سب کو حیران و ششدر چھوڑ کر مسکراتا ہوا' کمرے سے نکل گیا اور اپنے پیچھے سکوتِ مرگ چھوڑ گیا۔

طوفان آنے سے پیشتر اور گزر جانے کے بعد اک پراسرار قسم کا سکوت طاری ہو جاتا ہے، کچھ ایسا ہی سکوت اس وقت بھی تھا۔ وہاں موجود ہر فرد اندر سے دہلا ہوا کسی انجانے خوف سے لرزاں تھا صحرا گشت اونٹوں کی طرح، جو کوسوں دور بادِ سموم کی آمد کو محسوس کر لیتے ہیں۔ اِک دُوجے سے شرمندہ 'مہر بہ لب' اندیشوں کی کھچڑی پکاتے ہوئے ایک دوسرے کو تکتے رہ گئے۔

قاسم کے کمرے میں پہنچ کر شایان نے اپنے آپ کو پلنگ پہ گرا دیا۔ پھر کچھ دیر اپنے آپ سے الجھنے کے بعد جیسے وہ ایک فیصلہ کر کے اٹھا' رائٹنگ پیڈ لیا اور لکھنا شروع کر دیا۔ پھر جیب سے ایک چھوٹی سی شیشی نکالی' پوری حلق میں انڈیلی اور پانی کا گلاس غٹاغٹ خالی کر دیا۔

مغرب کی نماز کے بعد اس کے ماموں اور والد نماز پڑھ کر فارغ ہوئے تو کھانا دسترخوان پہ لگ چکا تھا۔ قاسم 'شانی کو بلانے آیا تو وہ گہری نیند سویا ہوا تھا' چہرے پہ کھچاؤ اور ایک ہاتھ سے تکیہ بھینچا ہوا تھا۔ پاس تپائی پہ گلاس کے نیچے کاغذ نظر آیا۔ "اللہ خیر" کہتے ہوئے کاغذ نکالا' پہلی سطر پڑھتے ہی بدحواس سا چلاتا ہوا باہر بھاگا۔۔۔ لکھا تھا۔

"اباجی! اللہ آپ کو لمبی زندگی دے۔۔۔ میں موت کو اپنی مرضی سے گلے لگا رہی ہوں۔ پوسٹ مارٹم کے بعد میری لاش حاجی رجی بیگم کے سپرد کر دی جائے' تجہیز و تکفین ان کی صوابدید پہ چھوڑ دی جائے۔ اس سلسلے میں کوئی مداخلت نہ کی جائے۔۔۔ نین تارا اگر مجھے معاف کر سکے تو یہ اس کا آخری احسان ہو گا۔ شادی کے بارے میں' میں نے جو مشورہ دیا تھا اگر وہ اس پر عمل کر سکے تو میری بے چین روح کو سکون ملے گا۔ امی کو میرا چہرہ نہ دکھایا جائے اور میری بہنوں کو رخصتی کے وقت تلقین کیجئے گا کہ وہ اپنے بچوں کو ننگا نہ نہلایا کریں' پہلی بھڑ بھڑ کاٹ لیتی ہیں۔۔۔ بدنصیب' آپ کی گنہگار۔ شانی!"

☆☆☆

معدہ صاف کرنے کے پیچیدہ عمل نے دیکھنے والوں کی روح کھینچ لی تھی۔ ڈاکٹروں کے لئے صورت حال بڑی خطرناک تھی' چند منٹ کی دیر اسے موت سے ہمکنار کر سکتی تھی۔ باہمی مشاورت کے بعد فوری طور پہ معدہ صاف کر دیا گیا مگر حالت ابھی تک خطرے سے باہر نہیں تھی۔ ڈاکٹر اسے بچانے کی سرتوڑ کوشش کر رہے تھے لیکن حتمی طور پہ کچھ بتانے سے گریز کر رہے تھے۔ علاقہ پولیس تھانے کے دو ذمہ دار اہلکار بھی موجود تھے۔ آپریشن تھیٹر کے باہر اس کے والد' ماں' ماموں' قاسم' نین تارا اور زلفی پریشان' بدحال سے بیٹھے ہوئے تھے۔ بلکہ سب کو چپ لگی ہوئی تھی۔ ماں فرش پہ مصلیٰ بچھائے' ہاتھ پھیلائے اس کی زندگی کی بھیک مانگ رہی تھی۔ نین تارا گھٹنوں میں سر دیئے چپکے چپکے آنسو بہا رہی تھی۔ باہر لان میں اور بھی عز



رشتہ دار' محلے والے موجود تھے' منشی کرم الٰہی کسی رشتہ دار کو شیخوپورہ ٹیلی فون کر رہا تھا۔ حاجی رجی بیگم' حکیم جمالی' ظہوری شاہ' رفیق ڈوگر' استاد شفو' استاد قربان' پندرہ بیس ہیجڑے زنانے روایتی زرق برق لباس اور مخصوص حرکتوں کے باعث لوگوں کی دلچسپی اور شانی کے گھر والوں کے لئے پریشانی اور شرمندگی کا باعث بنے ہوئے تھے۔ جانے انہیں کیسے خبر ہو گئی تھی جبکہ شانی کے گھر والوں نے اس معاملے میں بڑی رازداری برتی تھی۔۔۔ واقعہ کی سنگینی کے پیش نظر اسے فوری طور پر ہسپتال منتقل کیا گیا تھا۔ اس کے لباس اور حلیئے کو کسی نے اہمیت نہ دی تھی اور ڈاکٹروں کے نزدیک مریض صرف انسان ہی ہوتا ہے۔ مرد' عورت یا ہیجڑا نہیں لیکن اس کے باوجود حقیقت اپنی جگہ پہ حقیقت ہوتی ہے' کسی نہ کسی رنگ اور کسی نہ کسی سطح پر اپنا تعارف کرا دیتی ہے۔ آپریشن ٹیبل پہ آپریشن سے پہلے ہی نچلے اسٹاف کی آنکھوں میں استہزائیہ چمک پیدا ہو گئی تھی' آنکھوں آنکھوں سے بات کانوں کان پہنچی تو بڑی مضحکہ خیز صورت پیدا ہو گئی۔ پیشاب کی نالی میں' بوتل پینے والے پلاسٹک کے پائپ جیسی نلکی لگی ہوئی تھی جو شاید پیشاب کے اخراج کے لئے تھی۔ بندھی ڈوری والا آدھے سے زیادہ حصہ بے حس مرجھا کر سیاہ رنگت اختیار کر چکا تھا جیسے جھڑنے کے قریب ہو۔ میڈیکل سائنس کی رُو سے یہ انتہائی غلط اور خطرناک کام تھا' قانون اور اخلاق کی نظر میں سنگین جرم تھا۔ عطائی' جراح' ہیجڑوں کے اکثر بڑے استاد' مجرمانہ ذہنیت کے گرو انتہائی خفیہ طور پہ ایسے آپریشن کرتے ہیں۔ اچھے بھلے مردانہ صفات کے مالک نوجوان' ناچ گانے کے شوقین خوبرو لڑکے' زنانہ ذہنیت والے بہکانے' ترغیب دلانے' زبردستی یا کئی خود اپنے ذوق و شوق سے ان قصائیوں کی مشق ستم کا نشانہ بنتے ہیں۔ کئی بدنصیب اس دوران جان سے بھی گزر جاتے ہیں جن کی کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔ لاہور کا ایک "ڈاکٹر" تو اس قسم کی وارداتوں کے لئے بین الاقوامی شہرت رکھتا تھا۔ کبھی کبھی اخبارات میں ان لوگوں کی کارروائیاں پڑھنے کو مل جاتی ہیں۔ آپریشن کروانے والوں سے رازداری کا حلف لیا جاتا ہے' شرمناک تصویریں کھینچ کر ان کا منہ بند کیا جاتا ہے۔ فیس کے طور پہ کثیر رقم بھی بٹوری جاتی ہے۔۔۔ اور تو اور' صوفیوں میں بھی ایک طبقہ ایسا ہے جو نفس کشی کے بعض مجاہدوں میں روحانیت کی ارفع منازل طے کرنے سے پیشتر ان جھنجھٹوں سے فارغ ہونا ضروری خیال کرتا ہے۔ بُدھسٹ' ہندو میتھالوجی' مجوسیوں میں بھی اس تصور کو تقویت ملتی ہے۔ مہنت پانڈے' پروہت اور بھکشوں راہبوں' سنتوں' جوگیوں' سنیاسیوں میں اکثر برہمچاری اور چھکے ہوتے ہیں۔ ملنگ مجاور' سائیں سادھو' عامل' تخیرات کرنے والے جتی ستی لوگ بھی دھیان گیان میں خلل کے اندیشے کے پیش نظر اوائل

میں ہی اپنی مردانہ صفات کا جھٹکا کروا دیتے ہیں یا کر دیتے ہیں۔ نفس مارنے کا مطلب وہ شاید اسی عمل کو گردانتے ہیں جبکہ دینِ فطرت اس مذموم فعل کی سختی سے ممانعت کرتا ہے۔

★★★

ہمالیہ کی ترائیوں اور تبت' نیپال' کھٹمنڈو' کاشی' متھرا' بنارس کے تیرتھوں' معبدوں' گپھاؤں میں بڑے بڑے مہان رِشی مُنی' لاَمے' گیانی فقیر بابے اسی طرح کی مجردانہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان میں اکثریت قدرتی مخنثوں کی بھی ہوتی ہے۔ بعض مذہبی جنونی اپنے آپ ہی اس عذاب سے چھوٹ جاتے ہیں۔ دن رات کی کثرتِ ریاضت' خشک بے رنگ ماحول کا اثر انہیں ہمیشہ کے لئے بے "رغبت" کر دیتا ہے۔ خلیج کی ریاستیں' سعودیہ اور دیگر مسلم ممالک کے لئے بطور خاص ہیجڑے تیار کئے جاتے ہیں۔ ہندوستان' پاکستان' بنگلہ دیش' افغانستان' انڈونیشیا اور فلپائن میں یہ کاروبار باقاعدہ ایک صنعت اختیار کر چکا ہے۔ ہیجڑا مافیا کے گماشتے' کارندے بے روزگار نوعمر خوبرو لڑکوں کو بیرون ملک روزگار کا لالچ دے کر اپنے دام میں پھنساتے ہیں۔ یہاں انہیں ایڈوانس رقم بھی دے دیتے ہیں' پاسپورٹ ویزہ اور ہوائی ٹکٹ کا انتظام خود کرتے ہیں۔ جب مرغا کوڑی نگل لیتا ہے تو اسے بڑے انتظام کے ساتھ اپنے کسی جھٹکا مرکز میں داخل کرا دیتے ہیں۔ اس بچارے کو علم تک نہیں ہوتا کہ وہ ہیجڑا بن چکا ہے' علم ہو بھی جائے تو وہ بدنصیب بدنامی' رسوائی اور بلیک میلنگ کے خوف سے زبان بندی پہ مجبور ہوتا ہے یا وہ ان کے قرضے کے بوجھ تلے اتنا دب جاتا ہے کہ اس کے پاس اور کوئی چارہ نہیں رہتا۔ آئے دن اخبارات میں نوعمر لڑکوں کی گمشدگی' تصویریں' اعلانات' انعامات کے پیچھے اکثر اسی مافیا کے کارندوں کا ہاتھ ہوتا ہے۔ عہدِ جہالت کے غلاموں کی مانند یہ زر خرید غلام عرب شیوخ کے حرموں میں زندگی کی آخری سانس تک قید ہو جاتے ہیں۔ تاریخ عالم پہ نظر دوڑائی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مخنث ہر دور میں امراء کی ضرورت رہے ہیں' وہ اپنے حرموں میں اپنے سوا کسی اور مرد کا وجود برداشت ہی نہیں کر سکتے یا کسی مرد پہ اعتبار ہی نہیں کرتے۔

★★★

ڈاکٹروں کے بروقت فیصلے اور پانچ گھنٹے کی سرتوڑ کوشش سے شانی کی جان تو بچ گئی مگر پولیس والوں سے جان چھڑانی مشکل ہو گئی۔ شانی کی تحریر سے خودکشی کا کیس صاف اور ثابت تھا' صرف ملزم مریض کے بیان لینا باقی تھے مگر مریض ابھی اس قابل نہ تھا۔ اب ستم' بالائے ستم یہ کہ پولیس نے شانی کے ہیجڑا بننے والی حالت کو بھی قابلِ دست اندازی پولیس بنا کر مزید مُردے پہ سو درے والا معاملہ بنا دیا۔ پولیس تو بال کی کھال اتارتی ہے' مریض کے والی وارث



بھی کھاتے پیتے دکھائی دے رہے تھے۔۔۔ باہر ہیجڑے اُدھم مچا رہے تھے۔ ہسپتال کے سنجیدہ ماحول میں بڑی گڑبڑ ہو رہی تھی۔ پولیس تو خطرناک سے خطرناک پارٹی پہ ہاتھ ڈال دیتی ہے' کسی طرح حاجی رجی بیگم کو محسوس ہو گیا کہ پولیس اس کیس میں اسے بھی گھسیٹ رہی ہے' وہ اپنے تام جھام سمیت وہاں سے کھسک لیا۔ شانی کے وارثوں پہ بڑی مشکل آ پڑی تھی۔ عام حالات میں انسان بڑی سے بڑی مصیبت سے مقابلہ کرنے کا حوصلہ پیدا کر لیتا ہے۔ یہ شریف کاروباری لوگ تھے' ہیجڑوں اور پولیس سے واسطہ پڑ گیا تھا۔ ہیجڑوں کا کیا' ان کے اپنے پلے تو ہوتی نہیں پھر دوسروں کا کیسا لحاظ؟ جھگڑنے پہ آئیں تو دو کوڑی کا کر دیں' ان کے منہ کون لگے اور بددعائیں لے۔ مقطع میں بات گسترانہ آن پڑی تھی' اپنا بچہ بیچ میں تھا۔ ہر ممکنہ طور پر اپنی عزت بچانے کی فکر میں تھے' اخبار والے مختلف سوالات سے الگ پریشان کر رہے تھے۔ ایسے میں عامل ظہوری شاہ اور حکیم جمالی بھی قریب آ گئے اور تسلی دینے لگے کہ سب ٹھیک ہو جائے گا' آپ گھبرائیں نہیں۔ وہ ان کی کسی معاملے میں مدد لینا نہیں چاہتے تھے لیکن یہ موقع ہی ایسا تھا کہ وہ کچھ کہہ نہیں سکتے تھے' آپریشن سے پہلے مطلوبہ خون ان لوگوں نے ہی فراہم کیا تھا۔ عجیب اتفاق تھا کہ اسے خون بھی انہی لوگوں کا راس آیا اور خون کی فراہمی کا سارا انتظام اور بھاگ دوڑ انہی لوگوں نے کی تھی۔۔۔ حکیم جمالی اور ظہوری شاہ نے انہیں تسلی دی کہ آپ بالکل مطمئن رہیں' پولیس سے ہم نمٹیں گے اور واقعی ایسا ہی ہوا۔ ان لوگوں نے خدا جانے کون سا جادو کا ڈنڈا گھمایا کہ معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ شانی کے گھر والے' ان کی اس معاونت اور ہمدردی سے متاثر ہوئے اور احسان مند بھی ہو گئے۔

شانی' قریب قریب دو ہفتے ہسپتال میں رہا۔ اس دوران گھر والوں کے علاوہ حکم جمالی' ظہوری شاہ' حاجی رجی اینڈ کمپنی' رفیق ڈوگر' سب نے جی جان سے حق تیمارداری نبھایا اور ہر طرح سے خیال رکھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے یہی اس کے سب کچھ ہیں۔ گھر والے بھی خجل خجل جو بن پڑتا' کر رہے تھے مگر صاف ظاہر ہوتا تھا کہ جیسے یہ سب اندر سے بجھے بجھے سے ہیں۔ شایان بھی گھر والوں سے زیادہ ان ہی لوگوں کو اہمیت دیتا محسوس ہوتا تھا۔۔۔ ہسپتال سے ڈسچارج ہونے کے بعد جب گھر لے جانا چاہا تو شایان نے حاجی رجی بیگم کی جانب اجازت طلب نگاہوں سے دیکھا۔

"ہاں' ہاں بیٹی!۔۔۔ ضرور جاؤ اور خوش رہو۔۔۔ یاد رکھو' زندگی اللہ کی امانت ہے۔ اس میں خیانت نہیں کرنی چاہئے۔ یہ بہت بڑی نعمت ہے اور اس نعمت کی قدر کرنی چاہئے۔ آئندہ کبھی ایسی حماقت نہ کرنا' مالک ناراض ہوتا ہے۔۔۔ اور ہاں' گھبرانا نہیں۔ ہم اپنی بیٹی سے ملنے

آیا کریں، دل بہلایا کریں گے۔۔۔" حاجی رجی بیگم نے بڑی خوش دلی سے دعاؤں کے ساتھ اسے رخصت کیا۔

وہ گھر پہنچا تو سب کی جان میں جان آ گئی۔ نین تارا اپنی بیماری وماری سب کچھ بھول گئی، ہر وقت اس کو خوش رکھنے کی کوشش کرتی رہتی مگر ہیجڑا پارٹی نے ان کا ناطقہ بند کر رکھا تھا، چوبیس گھنٹے ایک دو مورتیں یہاں سجی رہتیں۔ "ہائے اللہ، اوئی اللہ" کی آوازوں سے گھر کا ماحول بڑا عجیب سا ہو گیا تھا۔ رشتہ داروں کا بھی آنا جانا لگا رہتا تھا۔ یہ لوگ بڑی سبکی محسوس کر رہے تھے۔ یوں دکھائی دیتا تھا جیسے آہستہ آہستہ اس گھر پہ ان ہی لوگوں کا قبضہ ہو جائے گا اور اگر یہ نہ ہوا تو گھر کے لڑکوں بالوں میں ایک آدھ ضرور ان کی جانب راغب ہو جائے گا۔ حاجی رجی بیگم ہر دوسرے تیسرے روز پھل فروٹ، پھول پھلاری سے لدے ہوئے چلے آتے۔ ان کے شاگرد مصاحب بھی ساتھ ہوتے۔ گلی محلے میں تماشا لگ جاتا۔ بچے اودھم مچاتے، آوازیں اور پھبتیاں کستے۔ یہ صورت حال بڑی تکلیف دہ تھی۔ لوگ طرح طرح کی باتیں بنانے لگے تھے۔ نین تارا کے والد اور بھائی منہ چھپاتے پھر رہے تھے۔ نہ نگلتے بنتی تھی، نہ اگلتے چین تھا۔ کریں تو کیا کریں؟ شایان کے والدین بھی دین دنیا سے فارغ یہاں پڑے خون کے گھونٹ پی رہے تھے۔ شایان کو اس حال تک پہنچانے میں بھی کچھ ان ہیجڑوں کا ہاتھ تھا اور اب شانی کی زندگی بچانے میں بھی انہی لوگوں کا بہت دخل تھا۔ انہیں اخلاقاً" اور شایان کی وجہ سے یہاں آنے سے روکا بھی نہیں جا سکتا تھا، عجیب سی صورت حال، جس میں یہ لوگ پھنسے ہوئے تھے۔ پھر ستم یہ کہ شایان بھی گھر والوں سے زیادہ ان ہیجڑوں میں خوش رہتا تھا۔ آہستہ آہستہ اس کے زخم بھر رہے تھے مگر گھر والوں کے زخم گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ شاید وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ شایان بھی راہ راست پر آ جائے گا، وہ اس کا دل جیتنے کے جتن میں لگے ہوئے تھے مگر مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی، کے مصداق "ہنوز دلی دور است" والی بات تھی۔ آخر والدین کئی ہفتوں سے یہاں پڑے پڑے بیزار ہو گئے اور ایک دن شایان کے والد نے کوئی حتمی فیصلہ کرنے کی ٹھان کر اسے کریدا۔

"بیٹا! جو ہوا، سو ہوا۔ ہمیں تمہاری پریشانی اور حالت کا پورا پورا احساس ہے۔ تم ہمارے جگر کا ٹکڑا ہو، اکلوتے بیٹے ہو۔ میری حالت اور بڑھاپے پہ ترس کھاؤ۔ اپنی ماں، ممانی، بہن بھائیوں، سب کو دیکھو۔ تمہاری وجہ سے یہ سب زندہ درگور دکھائی دیتے ہیں۔ اپنے خاندان کی حیثیت، شرافت، عزت کی طرف دیکھو۔ تمہارے ان "مہربانوں" لوگوں کی وجہ سے گلی گلی گھر گھر ہماری ہنسی اڑائی جا رہی ہے۔ لوگ ہمیں بھی ڈوم مراثی سمجھنے لگے ہیں، کئی جا



والوں نے ہم سے ملنا تک چھوڑ دیا ہے اور یہ سب کچھ ہم صرف تمہاری وجہ سے برداشت کر رہے ہیں مگر یہ سب کچھ شاید ہم زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکیں گے۔۔۔ بیٹا! چلو خیر، منگنی ٹوٹی سو ٹوٹی، گھر کی بات تھی مگر تمہاری یہ روش اور رویہ منگنی ٹوٹنے سے کہیں زیادہ تکلیف دہ اور پریشان کن ہے۔۔۔" وہ اس کے سر پہ پیار سے ہاتھ رکھتے ہوئے التجا بھرے لہجے میں کہنے لگے۔ "شایان! مجھے امید ہے کہ اب تم اپنے بوڑھے باپ اور غم زدہ ماں کو اس بڑھاپے میں مزید رسوائی اور شرمندگی سے بچا لو گے۔۔۔"

باپ پھس پھس رو رہا تھا کہ ماں اٹھی اور اپنا دوپٹہ اس کے پاؤں میں رکھتی ہوئی فریاد کرنے لگی۔

"پتر! میں نے تجھے بڑی منتوں اور دعاؤں سے حاصل کیا تھا۔ تجھے اپنا دودھ نہیں، خون جگر پلا کر پالا پوسا۔ اس بڑھاپے میں میرے سفید جھاٹے پہ کالک مت لگا۔ ان خدائی مارے کھسروں کا ساتھ چھوڑ، اتار یہ زنانہ کپڑے اور زیور۔۔۔"

وہ اس کے کپڑے نوچنے لگی۔۔۔ پھر اپنا چہرہ نوچ کر لہولہان کر لیا اور سینہ کوبی کرتے ہوئے بے ہوش ہو گئی۔ ارد گرد بیٹھے ہوئے ماموں، ممانی اور نین بھی رونے لگے، بڑی مشکل سے اس کی نیم بے ہوش والدہ کو سنبھالا، پانی پلایا۔ ماحول بڑا غمناک اور سنجیدہ سا ہو گیا تھا۔ ماں کی فریاد اور آنسو تو پتھر کو بھی موم کر دیتے ہیں مگر اس "سنگ خارا" کو نم تک نہ لگی، وہ ویسے ہی بے حس پتھر سا رہا۔

"ماں۔۔۔!" یخ بستہ لہجے میں، مایوسی کے برف خانہ سے آواز سی نکلی۔ "تو میری جنت ہے۔ میں نے تجھے بڑا دکھ دیا ہے۔ مجھے معذور اور مجبور سمجھتے ہوئے معاف کر دے۔۔۔" ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے اٹک اٹک کر کہنے لگا۔ "آپ مجھے شاید ایک پتھر سمجھتے ہیں۔۔۔ نہیں، میں پتھر نہیں ہوں۔ آپ ہی کی طرح گوشت پوست کا انسان ہوں۔ سینے میں دھڑکتا ہوا دل بھی ہے۔ اس میں درد اور احساس بھی مگر فرق صرف اتنا ہے کہ میں اپنے آپ کو، آپ سے زیادہ جانتا ہوں۔ آپ اپنے پیار دلار میں میری حالت اور حقیقت کو تسلیم کرنے میں چشم پوشی اور نرمی سے کام لیتے رہے ہیں جبکہ میں نے اسے روز روشن کی طرح تسلیم کر لیا ہوا ہے۔۔۔ بتائیے، کیا یہ حقیقت نہیں کہ میں شادی کا اہل نہیں۔ اگر یہ سچ ہے تو منگنی برقرار رکھنے اور کسی معصوم بے قصور کی زندگی برباد کرنے کا کیا جواز ہے؟ نین، بچپن سے مجھ سے منسوب کر دی گئی۔ اس میں نین اور میری مرضی یا خواہش کا دخل نہیں تھا۔ میں بعد میں بیمار اور ناکارہ ہو گیا تو اب بھی، میری مرضی کا دخل نہیں تھا۔۔۔ علاج معالجے میں آپ نے کوئی کسر نہ

چھوڑی۔ میں نے بھی اپنے تئیں کئی ڈاکٹر حکیم آزمائے مگر کامیاب نہ ہوا۔ یہاں بھی آپ کا اور میرا کوئی قصور یا کوتاہی نہیں۔ پھر یہ تسلیم کرنے میں کیا حرج ہے کہ میرے نصیبوں ہی میں یہی لکھا ہے کہ میں ایک نامراد کی حیثیت سے زندہ رہوں یا پھر موت ——— سنا ہے' خود کشی حرام موت ہے۔ اس طرح کی موت اختیار کرنے والا ہمیشہ عذاب میں مبتلا رہتا ہے۔ اس سے پہلے بھی کئی بار خیال آیا تھا کہ ایسے جینے سے موت بہتر ہے لیکن پھر یہ سوچ کر ارادہ بدل دیتا کہ زندہ رہنے سے اور کچھ نہیں تو آپ کو ہی دیکھ لیا کروں گا۔ حج کراؤں گا' خدمت کروں گا۔ جیسا بھی ہوں گا' کم از کم آپ کے سامنے تو ہوں گا۔ اسی جذبے کو سامنے رکھتے ہوئے میں نے جیسے تیسے جینے کا فیصلہ کر لیا مگر فیصلہ پتھر کی طرح ہو تو فیصلہ ہوتا ہے' بھربھری مٹی کی طرح ہو تو رسوائی اور حماقت یا جو بھی اور نام دے لیں ——— جینے کے لئے کسی تشخص' حیثیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس موجود حالت اور صورت میں' مجھے میری اس حیثیت اور تشخص سے بہتر اور کوئی صورت نظر نہیں آئی۔ میں نے منافقت سے صرفِ نظر کر کے اسے تسلیم کر لیا ہے اور آپ حقیقت سے نظریں چرا کر اسے ماننے سے انکار کر رہے ہیں۔ پھر آپ نے جب خود اپنی زبانی میری یا اپنی موت مانگی تو میں نے اپنا فیصلہ آپ کی زندگی کے حق میں کر دیا۔ میری ماں اور بہنوں اور باقی خاندان کو مجھ سے کہیں زیادہ آپ کی ضرورت ہے ——— میں نے موت کے کنویں میں چھلانگ لگا دی مگر آپ نے مجھے مرنے بھی نہیں دیا۔ اب آپ ہی بتائیے کہ میں کیا کروں' نہ آپ مجھے مرنے دیتے ہیں اور نہ جینے ———"

"تم جگ جگ جیو پتر! خدا تمہیں ہماری زندگی بھی دے ———" ماں اپنے لہجے میں ممتا کی حلاوتیں گھولتے ہوئے دعائیں دینے لگی۔ "میں تو تیری باتیں سن سن کر حیران ہو رہی ہوں ——— جیون جوگیا! ماں صدقے' ہم تو تیری خیریں مانگتے رہتے ہیں۔ میرے منہ خاک مرنے کی باتیں کرتا ہے۔ اسی دن کے لئے تجھے بڑا کیا تھا ———" اسے پھر رونے کا دورہ پڑ گیا۔

"رومت' نیک بخت! صبر کر' نصیبوں کی کھیتی کاٹنی پڑتی ہے چاہئے گیہوں ہو یا جھکڑ ——— دعا کر کہ اللہ اس کے لئے بہتر کرے اور ہمیں صبر اور برداشت دے۔" باپ اس کی جانب متوجہ ہوا۔ "پتر" "شایان! تم جیتے' ہم ہارے ——— اولاد کیسی بھی ہو' ماں باپ کے لئے اولاد ہی ہوتی ہے' ماں باپ کے پیش نظر ہمیشہ اولاد کی بھلائی ہی رہتی ہے۔ میں ایک بار کہوں گا کہ ہماری خاطر تم اپنے لباس اور حلیئے پہ نظر ثانی کرو اور ان زنانوں سے میل جول کر دو ——— کاش ! تمہیں اندازہ ہوتا کہ ان لوگوں کی آمد و رفت سے ہمیں کن کن لوگوں کی کیسی کیسی باتیں سننی پڑتی ہیں ——— شرم اور صدمے سے تمہارے ماموں کئی روز سے



نہیں نکلے۔ لوگ منہ پہ ہمدردی اور پیچھے باتیں بناتے ہیں' مذاق اڑاتے ہیں ———"

"اباجی ! جب قدرت نے مجھے مذاق بنا دیا تو لوگوں کے مذاق سے کیا گھبرانا؟ ——— اسی لئے میں آپ لوگوں سے دور رہنے کی کوشش کرتا ہوں کہ میری وجہ سے آپ کو کسی قسم کی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ ویسے کوئی بھی اپنا مذاق اڑوانا نہیں چاہتا اور نہ کوئی اپنی پسند کی جنس لے کر پیدا ہونے پہ قادر ہے' یہ سب اس بے نیاز کی بے نیازیاں ہیں۔ وہ خود کہتا ہے کہ عزت' ذلت' رزق دینے والا میں ہوں۔ اگر ذلت میرا نصیب ہے تو اس میں میرا کیا قصور؟ ——— آپ لوگ میرے لئے سے پریشان نہ ہوں اور نہ میری وجہ سے لوگوں کی تضحیک کا نشانہ بنیں مجھے میرے حال پہ چھوڑ دیں ——— برسبیلِ تذکرہ' ایک اور حقیقت کی نشاندہی کرتا چلوں۔ آپ سے بھی شاید کوتاہیاں سرزد ہوئی ہیں اور اس میں ماں جی اور میری پیاری بہنوں کا بھی قصور ہے۔ اکلوتا بچہ ہونے کے ناطے آپ نے جس طریقے سے میری پرورش کی' اس کا اثر بھی میری شخصیت پہ پڑا۔ کچھ میری جسمانی ساخت اور کچھ بے جا لاڈ پیار' تن آسانی اور ناز و نعم نے بھی مجھے نرم و نازک بنا دیا۔ ہر وقت بہنوں اور لڑکیوں کی صحبت' ویسے ہی کھیل کود' مشاغل ——— پھر گلی محلوں کے لڑکوں سے دور رکھا۔ باہر کسی سے کھیلنے دیا۔ کرکٹ' نہ فٹ بال' نہ بھاگ دوڑ۔ ہر وقت یہی کہ اندر بیٹھو' پڑھو۔ ہر جائز ناجائز خواہش پوری کی۔ کوئی بہن مجھے سرمہ لگا رہی ہے' کوئی بال سنگار کر رہی ہے۔ کہیں شادی بیاہ ہوا تو مجھے لڑکیوں جیسے کپڑے پہنا دیئے۔ ایسی تربیت اور ماحول میں جو بچہ پروان چڑھے گا' آپ کا کیا خیال ہے کہ وہ پہلوان بنے گا؟ ——— نہیں' وہ زنانہ ہی بنے گا۔ مانا کہ اکلوتا اور لاڈلا ہونے کی وجہ سے احتیاط اور غیر ضروری نگہداشت کرتے تھے لیکن کبھی کبھی حد سے زیادہ احتیاط اور اعتماد الٹا اثر دکھاتے ہیں ———"

"بس کرو' شایان! تم بہت کچھ کہہ چکے ——— واقعی' جو والدین اپنی اولاد کو بے جا لاڈ پیار کا نشانہ بناتے ہیں اور ان کی تربیت پرورش میں کوتاہیاں برتتے ہیں' انہیں پھر بدترین نتائج کا سامنا کرنا چاہئے۔ زنانے' چور' نشے باز اور ہڈ حرام بننے میں اتنا ہاتھ اولاد کا نہیں ہوتا جتنا ماں باپ اور گھر کے ماحول اور حد سے زیادہ لاڈ پیار اور اندھا دھند اعتماد کا ہوتا ہے ——— میرے بچے! میں یہ سب کچھ مانتا ہوں۔ اب اگر کچھ مداوا کرنا چاہوں بھی تو کچھ حاصل نہیں پانی تمہارے اور میرے سر سے اونچا ہو چکا ہے۔ امید کی صرف ایک کھڑکی ذرا سی کھلی دکھائی دیتی ہے جس سے رہی سہی کچھ عزت بچ سکتی ہے۔ بوڑھا باپ' اپنے اکلوتے بیٹے کی ملتجیانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ کیا تم ہماری خاطر اتنا کر سکتے ہو کہ یہ زنانہ لباس

اور حلیہ تبدیل کرلو اور اپنے گھر میں رہو۔ ہم تمہاری ہر ضرورت پوری کریں گے، تمہیں
قسم کی کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔۔۔"

وہ پھیکی سی ہنسی ہنسا اور بولا۔ "یہ ممکن نہیں۔۔۔ چوہا چاہے لاکھ بل میں گھسا بیٹھا
دسترس سے محفوظ نہیں ہوتا۔ وہ کبھی نہ کبھی باہر نکلنے پہ مجبور ہوتا ہے اور پھر وہ بلی کے
گرمیں پڑا ہوتا ہے۔۔۔"

"شایان! مجھے یہ مثالیں نہ دو، تم چاہو تو ایسا کرسکتے ہو۔۔۔" باپ نے اسے مزید ٹو
خاطر کہا اور پوچھنے لگا۔ "کہیں تم ان لوگوں کے دباؤ میں تو نہیں ہو؟۔۔۔ شایان! خدا کے
اگر کوئی ایسی بات ہے تو اپنے باپ سے بلاخوف کہہ دو۔ ہم تمہاری پوری پوری مدد
گے۔۔۔ تم نہیں جانتے کہ یہ خبیث، بھولے بھالے بچوں کا برین واش کردیتے ہیں،
لالچ اور حربوں سے اپنے چنگل میں پھنسا لیتے ہیں، کسی کمزوری اور مجبوری کو پکڑ کر بلیک
کرتے ہیں۔۔۔"

"نہیں، اباجی! ایسی کوئی بات نہیں۔۔۔ بات اگر کوئی ہے تو یہ ہے کہ لولا لنگڑا،
مریض، چور ڈاکو یا دہشت گرد تو گھر میں رہ سکتا ہے، زنانہ یا ہیجڑا نہیں رہ سکتا۔ یہ کسی
پردے میں چھپایا نہیں جاسکتا، زنانہ لباس کے سوا کوئی اور لباس اس کے جسم پر فٹ نہیں
زبان چپ رہے تو اس کا جسم بولتا ہے، جسم چپ ہو تو اسکی بُو بولنے لگتی ہے۔ یہ منافق
ہوتا، اندر باہر سے ایک جیسا ہوتا ہے اور اسی لئے یہ اپنی حقیقت تسلیم کرتے ہوئے اپنے
میں رہتا ہے۔۔۔ باقی رہی گھر میں رہنے کی بات تو زنانہ اپنے ماں باپ کے گھر میں جنم
سکتا ہے وہاں رہ اور مر نہیں سکتا ہے، یہ دونوں کام اس کی برادری میں ہوتے ہیں۔۔
یہاں رہ کر آپ سب کے لئے پریشانیاں پیدا کرنا نہیں چاہتا۔ ظاہر ہے، جہاں میں ہوں
ان لوگوں کی آمدورفت بھی رہے گی جسے آپ پسند نہیں کرتے۔ میں آپ سے ملنے آیا
گا۔۔۔ بس، میرے لئے دعا کریں۔۔۔"

بوڑھا بے بس باپ زچ ہو کر پوچھنے لگا۔ "کیا تم اپنی مارکیٹ میں بھی نہیں
گے۔۔۔؟"

"اس کا فیصلہ میں ابھی نہیں کرسکتا لیکن زیادہ ممکن ہے کہ میں وہیں رہوں اور
بھی جاری رکھوں۔۔۔"

اب کوئی بات پردے میں نہیں رہی تھی۔ اپنے بیگانے، سب ہی واقف ہوگئے تھے
والے بھی سر پہ پڑی نبھانے کے لئے ذہنی طور پر تیار ہوچکے تھے۔ جب انسان کے سا



راستہ نہ رہے تو وہ حالات سے سمجھوتا کرنے پہ مجبور ہوجاتا ہے اور حالات چاہے کیسے
ساعد کیوں نہ ہوں، وہ حالات کے مطابق ان کا مقابلہ کرنے کی اپنے اندر ہمت پیدا کرلیتا
پھر وقت کا مسیحا دھیرے دھیرے اس میں جینے کا حوصلہ، لگن اور اعتماد بحال کردیتا ہے۔
اس کڑے وقت میں اگر کسی نے سچی ہمدردی اور ہمسائیگی کا حق نبھایا تھا تو وہ زلفی کا گھرانا
قدم قدم، سانس سانس انہوں نے اپنائیت کا اظہار کیا تھا۔ ادھر چولہا ٹھنڈا رہا تو پکا پکایا کھانا
ے آیا، ہسپتال آنا جانا رہا تو گاڑیاں ان کی تیار ملیں۔ ہسپتال میں انتظامات، پولیس، پریس،
زلفی اور قاسم پیش پیش رہے۔ اب بھی وہ دن رات شایان کے پاس آتا جاتا، اس کا دل
لطیفے چٹکلے، اچھی اچھی دلچسپ باتیں، آج تک اس نے شایان سے نہ تو اس کے ذاتی
ت کے متعلق کبھی کوئی بات کی اور نہ ہی بے جا پندونصیحت سے اس کا موڈ خراب کیا اور
ت تو یہ تھی کہ شایان بھی دل کی گہرائیوں سے اس کی عزت اور قدر کرتا تھا، اسے میٹھی
نظروں سے دیکھتا رہتا تھا۔۔۔ مزید دو ہفتے اسی طرح آرام سکون اور قاسم، زلفی کی صحبت
میں گزر گئے۔ نین نے بھی جیسے حالات سے سمجھوتا کرلیا تھا۔ شایان کے امی، ابا واپس
رہ چلے گئے تھے۔

اگلی شام شایان اکیلا لیٹا ہوا یہاں سے رخصت ہونے کی سوچ رہا تھا کہ زلفی آم اٹھائے
اندر داخل ہوا۔ اچانک اس کے آجانے سے شایان کو بے حد خوشی ہوئی، وہ جیسے کھل

"اچھا ہوا زلفی صاحب، آپ آگئے۔ آج آپ سے بہت سی باتیں کرنے کو جی چاہ رہا
"

"ضرور۔۔۔ دل کھول کر باتیں کریں۔ میں یہاں حاضر ہی اس لئے ہوتا ہوں کہ آپ
کریں، دل ودماغ کا بوجھ ہلکا ہو اور میں آپ کے کسی کام آسکوں۔۔۔"

"بس بس! بہت بہت شکریہ۔۔۔ اس مشکل وقت میں آپ نے اپنوں سے بڑھ کر ساتھ
سوچتا ہوں، آپ کے احسانوں کا بدلہ کس طرح چکا سکوں گا۔۔۔" وہ اداس سے لہجے
نے لگا۔ "آپ جانتے ہیں، میرا کوئی بھائی نہیں۔۔۔ کاش! میرا کوئی آپ جیسا بھائی
۔" یہ کہتے کہتے وہ روہانسو ہوگیا۔

"شایان بھائی۔۔۔!" وہ اس کے کاندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ "یقین کریں، میں نے
قت میں ہی آپ کو اپنا بھائی بنا لیا تھا۔ آپ کہہ رہے ہیں کہ کاش! میں آپ کا بھائی کا
۔ بھائی! میں آپ کا بھائی ہی ہوں۔ سچ بتائیے، آپ نے میرے خلوص یا پیار میں کہیں

کوئی کمی دیکھی؟--- سچی بات یہ ہے کہ آپ جیسا پیارا اور حوصلہ مند بھائی پا کر میں اپنے آپ کو دنیا کا خوش نصیب انسان محسوس کرتا ہوں۔"

شایان کی آنکھوں میں جیسے ساون بھادوں اتر آیا' وہ بچوں کی مانند بلک بلک کر رونے لگا۔ زلفی نے بڑھ کر اسے سینے سے چمٹا لیا اور اس کے آنسو پونچھتے ہوئے دلاسا دینے لگا۔

"شایان! کبھی اپنے آپ کو اکیلا محسوس نہ کرنا' میں ہر دکھ سکھ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ تمہارے اس المیے کو جس شدت سے میں نے محسوس کیا ہے' اس کا اندازہ شاید تم نہ کر سکو--- میرے بھائی! شروع سے اب تک میں تمام حالات سے واقف ہوں۔ گو اس پر میں نے تم سے کھل کر کبھی بات نہیں کی مگر اس کے باوجود میں تمہارے احساسات، مجبوریوں اور مشکلات سے بے خبر نہیں ہوں--- ہونی ہو کر رہتی ہے مگر ایمانداری کی بات یہ ہے کہ ان حالات میں تم نے جس جرات کا مظاہرہ کیا ہے' اس سے میں بڑا متاثر ہوا ہوں۔ کوئی کچھ بھی کہے' تم اپنے موقف کے حوالے سے صحیح ہو---"

شایان آج پہلی بار اس کی اس قسم کی باتیں بڑے غور سے سن رہا تھا۔ پہلے تو وہ اسے محض ایک خوش باش انسان سمجھتا تھا مگر آج جب اس نے اپنا اندر کھولا تو احساس ہوا کہ وہ ایک کھلنڈرا انسان ہی نہیں بلکہ ایک دردمند' حساس اور محبت سے بھرا دل رکھنے والا بھی ہے--- اس کا ہاتھ تھام کر کہنے لگا۔

"زلفی! تم نے مجھے جینے کا حوصلہ دیا ہے' میں اس کے لئے تمہارا بے حد ممنون ہوں---" پھر ذرا ٹھہر کر کہنے لگا۔ "زلفی بھائی! اگر تم اجازت دو تو کچھ ذاتی نوعیت کے سوال پوچھنا چاہتا ہوں---"

"اجازت کی ضرورت نہیں--- بھائی ہو تو بھائی کے ناطے سے جو چاہے' پوچھو۔"

"تم--- تم نین تارا سے شادی کرنا چاہتے ہو؟"

زلفی بلا تامل بولا۔ "اس سے پیشتر کہ میں تمہارے سوال کا جواب دوں' ایک بات واضح کر دوں۔ میری تم سے دوستی' ہمدردی یا اس گھر سے لگاؤ نین تارا کے حوالے سے نہیں بلکہ آپ سب لوگوں کی شرافت کی وجہ سے ہے۔ یہ سچ ہے کہ نین تارا جیسی باحیا اور سلجھی ہوئی لڑکی مجھے اچھی لگی تھی' میرے ہی ایما پہ پیغام بھی بھیجا گیا تھا لیکن یہ قصہ اس وقت کا ہے جب ہمیں معلوم نہیں تھا کہ اس کی منگنی بچپن سے تم سے طے ہو چکی ہے---" وہ کہتے کہتے رکا، پھر نظریں جھکا کر بولا۔ مجھے اس حماقت کا ہمیشہ افسوس رہے گا۔ "اس گھر سے ہمارے تعلقات کافی پرانے اور گہرے ہیں' یہاں تک کہ لوگ ہمیں آپس میں رشتہ دار سمجھتے ہیں۔



ناطے آسمان پہ طے ہوتے ہیں' محض چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا اور جہاں لڑکیاں ہوتی ہیں وہاں پیغام بھی آتے ہی رہتے ہیں مگر ہوتا وہی ہے جو اللہ کو منظور ہوتا ہے۔ اب تو میں نے کبھی اس بارے میں سوچا تک نہیں بلکہ میری خواہش ہے کہ نین کی شادی تم جیسے اچھے انسان سے ہو جو بہت سی خوبیوں کا مالک ہے---"

"تم میرے بارے میں سب کچھ جانتے ہو' اس کے باوجود ایسی بات کہہ رہے ہو---؟"

"میری جان! مایوس ہونا گناہ ہے۔ میڈیکل سائنس نے بڑی ترقی کر لی ہے اور ممکن ہے کہ مستقبل میں تمہارے اندر کوئی خوشگوار تبدیلی آجائے---"

"مجھے طفل تسلیوں سے مت بہلاؤ' میں اپنی حالت خوب اچھی جانتا ہوں--- ہاں' تم ابھی کہہ رہے تھے کہ نین بڑی اچھی لڑکی ہے اور میری اپنی ذاتی رائے میں تم بھی بہت اچھے لڑکے ہو۔ تمہارے اندر وہ تمام اوصاف موجود ہیں جو اس کے جیون ساتھی میں ہونے چاہئیں--- میری خواہش ہے' زلفی! کہ نین جیسی ہمہ اوصاف لڑکی تمہاری شریک حیات بنے---"

زلفی ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے بولا۔ "تم نے بہت بڑی بات کہہ دی ہے' دوست! مگر ایسا ممکن نہیں' میں سارے کئے کرائے پہ پانی پھیرنا نہیں چاہتا۔ لوگ اور نین بھی یہی سمجھیں گے کہ میں یہ سب کچھ صرف اسی خاطر کرتا رہا ہوں اور پھر حقیقت یہ ہے کہ میرا اس کا کوئی جوڑ نہیں۔ وہ مجھ سے زیادہ پڑھی لکھی اور بے شمار خوبیوں کی مالک ہے' میں کسی طور اس کے معیار پہ پورا نہیں اترتا---"

"یہ تو خیر' تم کسر نفسی سے کام لے رہے ہو--- کوئی اور معقول وجہ ہو تو بتاؤ؟"

"سچ پوچھو تو شادی کرنے کو میرا دل نہیں چاہتا جب تک---" زلفی سوچ میں پڑ گیا۔

"جب تک' کیا--- کھل کر بات کرو' مجھ سے کیا پردہ ہے؟"

"کچھ نہیں' یار! بس یونہی---" زلفی نے ٹالتے ہوئے جواب دیا۔

"اس کا مطلب ہے کہ تم نے ابھی ابھی جو بھائی بندی کا دعویٰ کیا ہے' وہ بس یونہی تھا---؟"

"نہیں نہیں' تم تو کم از کم ایسی نہ بات سوچو--- تم خود پہلے ہی پریشان ہو۔ میں تمہیں مزید پریشان نہیں کرنا چاہتا---"

"بھائی ہو تو صاف صاف ساری بات کرو' مجھ سے نہیں کہو گے تو دیواروں سے کہو گے؟--- میری فکر نہ کرو' میں بالکل ٹھیک ہوں۔ کسی اپنے کے سامنے دل کا غبار نکالنے سے

آدھی پریشانی دور ہو جاتی ہے اور پھر جب دو دماغ مل جائیں تو کوئی بہتری کا راستہ بھی نکل آتا ہے۔۔۔ بے دھڑک بات کرو، میرے سینے میں تمہارا راز محفوظ رکھنے کے لئے بڑی کشادگی ہے۔۔۔"

"شایان! میرے والد صاحب کی پہلی شادی اپنے خاندان میں ہوئی تھی۔ میری پہلی والدہ سیدھی سادی گھریلو سی خاتون تھیں۔ والد صاحب پڑھے لکھے، کاروباری اور وسیع حلقہ احباب رکھنے والے انسان تھے۔ آپس کے طبعی تضاد کے باعث گھر میں اکثر بدمزگی اور ناچاقی کی فض قائم رہتی تھی۔ جیسے تیسے تین چار برس گزر گئے۔ اس دوران تین بیٹیاں اوپر تلے پیدا ہوئیں۔ اولاد نرینہ کا بہانہ بنا کر والد صاحب نے دوسری شادی، یعنی میری ماں سے شادی کر لی جس پر خاندان میں کافی لے دے ہوئی لیکن جو ہونا تھا، ہو چکا تھا۔ والد صاحب روزمرہ کی چخ چخ سے بچنے کی خاطر لاہور آ گئے، پہلی بیوی معصوم بچیوں کو لے کر دل برداشتہ سی میکے بیٹھیں۔ والد صاحب نے بچیوں کی کفالت کے لئے پیش کش کی مگر انہوں نے کوئی مالی اعانت قبول کرنے کی بجائے طلاق کا مطالبہ کر دیا۔ والد صاحب نے مجبوراً" مکان اور کچھ رقم بچیوں کی کفالت اور شادی کے لئے ان کے نام کرتے ہوئے طلاق دے دی۔

وقت گزرا، بچیاں بڑی ہو گئیں۔ جوانی کی حد سے گزر کر والد صاحب بھی بڑھاپے کی دہلیز پہ آ پہنچے۔ وقت بدلا، خیالات بدلے تو اولاد کی محبت جاگی۔ کئی بار ان سے رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر اس وقت تک پلوں کے نیچے سے بہت پانی گزر چکا تھا۔ انہوں نے ہمارے والد صاحب کے لئے سارے در، دروازے بند کر دیئے ہوئے تھے۔۔۔ ادھر ہم بھی جوان ہو گئے والد صاحب سے چوری چھپے اپنی پہلی ماں اور بہنوں کی خبر گیری کرتے رہے، کبھی کبھی ان سے مل ملا بھی لیتے تھے۔ ایک وقت آیا کہ ہماری سوتیلی امی کے والد فوت ہو گئے، بھائیوں نے آنکھیں پھیر لیں۔ بڑی بچی جوان ہو چکی تھی، سکول سے نکل کر کالج میں پڑھنا چاہتی تھی والدہ اپنے ایک نابینا بھائی کو جنہیں بچیاں ماموں نہیں بلکہ اپنا والد سمجھتی تھیں، ساتھ لے لاہور اٹھ آئیں۔ کچھ عرصہ تو بڑے سکون سے گزرا، جو پاس پلے تھا نئے شہر کی نئی ضرورت کالج فیس، داخلے پر خرچ ہو گیا۔ مہنگائی نے رہی سہی کسر بھی نکال دی۔ مجھ سے جو ہو سکا والد اور والدہ سے چوری چوری کرتا رہا۔ ہر ممکن کوشش کی کہ کسی طرح وہ والد صاحب کی مالی مدد قبول کر کے اپنے حالات درست کر لیں مگر ان کے دل میں جو گرہ پڑ چکی تھی وہ نہ تھی، نہ کھلی بلکہ وہ میری بھی کسی ہمدردی سے نہ خوش ہوتیں، نہ ہی میری کوئی مالی امداد دلی سے قبول کرتیں۔ ان کے حالات دن بہ دن دگرگوں ہوتے گئے۔ والدہ نے چولہا گرم رکھنے کی غرض سے گھر پہ رضائیاں سینی شروع کر دیں لیکن اخراجات کا بھوت ننگا ناچ رہا تھا، کسی طور پوری نہیں پڑتی تھی۔ بڑی لڑکی نے جب ماں کو اتنی محنت کرتے دیکھا تو بغیر بتائے پڑھائی کے ساتھ ساتھ ایک بچوں کے گارمنٹ بنانے والی فیکٹری میں پارٹ ٹائم ملازمت کر لی۔ پھر چل سو چل، زیادہ پیسے کے لئے کبھی یہاں اور کبھی وہاں سر پھوڑنے لگی۔۔۔ مرے کو مارے شاہ مدار، نابینا ماموں اپنی بہن، بھانجیوں کے غم کو دل پہ لگا بیٹھا۔ مادر زاد نابینا، ایک بازو سے بھی کمزور۔۔۔ کچھ کرنے کرانے کا اہل نہ تھا۔ ایک دن بیٹھے بیٹھے خون تھوکا، ہسپتال پہنچا تو کینسر کا مریض نکلا۔ اس پہ بھی کافی خرچ اٹھا۔ چند دنوں بعد جب اس کا جنازہ اٹھا تو ان کے گھر تیسرا فاقہ چل رہا تھا۔ "پھر۔۔۔" چند لمحے جیسے پھر کے پر پھڑپھڑاتے رہے۔



"آپ، پھر سے آگے بڑھیں۔۔۔" شایان نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ہاں، پھر۔۔۔" جیسے وہ چونک پڑا ہو۔ "پھر میری بہن بھوک کو برداشت نہ کر سکی، وہ بھٹک گئی۔ جانے کن حالات اور کن مجبوریوں میں اس نے منشیات میں اپنے دکھوں کا مداوا تلاش کر لیا۔ بھوک اور مجبوریوں کے بھوت نے اسے نگل لیا، پڑھائی ختم ہو گئی۔ وہ اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے کام کرتی، بے خوابی کی مریض ہو گئی۔ ساری ساری رات سگریٹ پھونکتی رہتی۔ ہیروئن میں اسے سکون ملنے لگا۔ عزت ناموس، شرم حیا، بے معنی چیزیں ہو کر رہ گئیں۔ وہ پٹڑی سے اتر گئی، ضرورتوں کے لئے اپنا آپ بھی داؤ پہ لگا دیا۔

وہ سر جھکا کر خاموش ہو گیا۔ شایان نے اس کا سر اٹھایا تو چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔

"اب وہ کس حال میں ہے۔۔۔؟"

"خدا جانے کس حال میں ہے، زندہ بھی ہے یا۔۔۔ ایک دن وہ ماں کی ناگفتہ بہ حالت اور بہنوں کے سکول کی فیس کی وجہ سے سخت پریشان تھی، اسی پریشانی کے عالم میں گھر سے نکلی اور اس کے بعد کسی نے اس کی شکل نہیں دیکھی۔۔۔ نہ جانے اسے زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا۔ اس کی تلاش کی ہر کوشش رائیگاں گئی۔ ہسپتال، تھانے، دارالامان، غرض کوئی ممکنہ جگہ نہیں جہاں اسے تلاش نہ کیا ہو۔۔۔ غم زدہ ماں نے شک کی بنیاد پہ والد صاحب کے خلاف پرچہ درج کروا دیا، سخت پریشانی اٹھانا پڑی۔ والد صاحب اپنی بدنامی اور بیٹی کے غم میں نڈھال ہو گئے۔ اپنی پہلی بیوی بچیوں سے جو تھوڑی بہت ہمدردی تھی بھی، وہ بھی جاتی رہی کہ اس بڑھاپے میں یہ بدنامی ملی۔ ان کے خیال میں یہ بھی انہیں بدنام کرنے کی سازش کی گئی تھی اور اس کے لئے وہ اپنی پہلی بیوی کو قصوروار ٹھہراتے ہیں۔ انہوں نے ہمیں ان سے نہ ملنے کا سختی سے حکم دے دیا لیکن اس کے باوجود میں نے فیصلہ کیا کہ میں کسی صورت انہیں اکیلا نہیں چھوڑوں گا کیونکہ

جو کچھ میں ان کے حالات کے بارے میں جانتا ہوں‘ وہ والد صاحب نہیں جانتے۔ وہ تو میری والدہ سے شادی کر کے ان سے منہ موڑ بیٹھے مگر میں اپنی بہنوں سے کیسے منہ موڑ سکتا ہوں۔ وہ میرا خون ہیں‘ میرے باپ کی اولاد ہیں اور بڑی امی ایک رشتے سے میری پھوپھو بھی لگتی ہیں‘ پھر میں کیسے لاتعلق رہ سکتا ہوں۔۔۔؟“

”تم ٹھیک کہتے ہو‘ زلفی ! تمہارے والد کو بیوی اور اولاد بھی مل گئی مگر تمہاری سوتیلی امی سے تو سب کچھ چھن گیا بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ ان کی بربادی اور ان کو اس حال تک پہنچانے کے ذمہ دار صرف اور صرف تمہارے والد ہیں۔۔۔ بہرحال‘ بڑی امی اور بہنوں کے متعلق تمہارا جذبہ قابل قدر ہے۔ خدا کرے کہ تمہاری بہن جہاں بھی ہو‘ سلامت ہو۔۔۔ ویسے تمہارا خیال ہے کہ وہ کہاں ہو سکتی ہے؟“

”بھائی ! اخباروں میں اشتہار دینے کے علاوہ ہر ممکنہ کوشش کر کے دیکھ لی‘ اشتہار دینے سے اس لئے بھی اجتناب کیا کہ اس طرح والد صاحب کا نام لامحالہ آئے گا‘ رسوائی ہو گی‘ ناراضگی کا بھی ڈر ہے۔ وہ پہلے ہی مجھے ان کا طرف دار سمجھتے ہیں۔۔۔“ پھر وہ اداس سا ہو کر بولا۔ ”میرے منہ میں خاک‘ کہیں اس نے خودکشی نہ کر لی ہو لیکن ایسی صورت میں بھی کسی اخبار کسی خبر کے ذریعے اسے سامنے آنا چاہئے۔ اس طرف بھی دھیان جاتا ہے کہ کہیں اپنے جیسی کسی سہیلی یا دوست کے ہاں نشے میں ڈوبی پڑی ہو گی اور یہ بھی ممکن ہے کہ کہیں بدقماشوں کے ہتھے چڑھ گئی ہو۔۔۔“

”ہاں‘ بہت ممکن ہے۔۔۔“ شایان نے اپنے خدشے کا اظہار کرتے ہوئے مزید کہا۔

”اچھا‘ دوست! خدا کرے کہ ہماری بہن جہاں بھی ہو‘ سلامت ہو۔ تم تلاش جاری رکھو‘ میں قدم قدم تمہارے ساتھ ہوں۔۔۔“

”شایان! ایک بات اور کرنا چاہتا ہوں۔۔۔ میں نے سنا ہے‘ بلکہ خود بھی محسوس کیا ہے‘ تم بھی منشیات استعمال کرتے ہو۔ اگر یہ سچ ہے تو ایک بھائی کی التجا ہے کہ اس لعنت سے دور رہو۔ یہ نشہ انسان کے پلے رسوائیوں‘ بیماریوں اور انجام کار بھیانک موت کے علاوہ اور کچھ نہیں ڈالتا۔۔۔“

شایان نے جواب دیا۔ ”تم نے بالکل سچ کہا لیکن یہ بھی سچ ہے کہ میں منشیات کا عادی نہیں ہوں البتہ کبھی کبھی موج میلے میں انکار بھی نہیں کرتا۔۔۔ ویسے بھی میرے پلے نہیں ہے جس کے بگڑنے یا برباد ہونے کا خدشہ ہو۔ اب رہی بھیانک موت! تو ہم ہیجڑوں کی موت صرف موت ہوتی ہے‘ بھیانک یا خوبصورت نہیں۔ ہیجڑے اندھیرے منہ‘ منہ اند



خاموشی سے مر جاتے ہیں۔ نماز‘ جنازے سے بے نیاز کسی اندھے گڑھے میں گڑ جاتے ہیں۔ ان کی قبریں ہموار اور بے نام و نشان ہوتی ہیں۔ دیا نہ بتی‘ پھول نہ پتی‘ کتبہ نہ لوح‘ موتیا نہ نیاز بو۔ منافقت‘ تکلف‘ تصنع سے منوں مٹی دور‘ موت سی موت۔۔۔“

”توبہ ہے‘ یار! تمہاری باتوں سے خوف آنے لگتا ہے‘ جیسے کوئی پراسرار مخلوق تمہارے اندر حلول کر گئی ہو۔ اپنی عمر‘ علم‘ تجربے سے بہت آگے سوچتے اور بولتے ہو۔۔۔“

”نہیں‘ بھائی! ایسی کوئی بات نہیں۔۔۔ اصل میں جب مجبوری اور محرومی کے دو پاٹوں کے درمیان آرزوؤں کا گھیئوں بے بسی سے پس کر ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے تو پھر اس کا ہر سالمہ‘ اپنی سالمیت کے لئے تحفظ اور تشخص چاہتا ہے اور جب ایسا نہیں ہوتا تو پھر وہ ایٹم بم کی مانند پھٹ جانا چاہتا ہے۔۔۔ بس‘ ایسی ہی کوئی کیفیت ادھر بھی سمجھ لو۔۔۔“

”ارے سائنس دان‘ بھائی! بدقسمتی سے میں اتنا پڑھا لکھا نہیں ہوں‘ ایسی باتیں میرے سر کے اوپر سے گزر جاتی ہیں۔۔۔“ زلفی بولا۔

یہ دن ایسی ہی باتوں میں گزر گیا۔ اگلے روز وہ دوپہر سے پہلے حاجی رجی بیگم کے ہاں پہنچ گیا تھا۔

☆☆☆

شمسہ تھی تو انسان! مگر ظہوری شاہ کے لئے نوٹ چھاپنے کی مشین بن گئی تھی۔ وہ جتنے اور جس رنگ کے نوٹ چاہتا' چھاپ لیتا۔ رنگ و رامش کی محفلیں اسی کے دم سے آباد تھیں۔ وہ محض ایک کٹھ پتلی تھی جو نئی گڑیا' نقلی زیورات' نئے نئے کپڑوں کے لالچ میں ہر سانچے میں ڈھل جاتی۔ گدگدی کے نام پہ ہر اچھے برے مراحل سے گزر جاتی۔ دوا کے طور پر وہی خاص مشروب اسے ہر روز پلایا جاتا' دنیا ومافیہا سے بے خبر وہ اپنی بے خبری کی دنیا میں جی رہی تھی یا جینے پہ مجبور تھی۔

ان ہی دنوں مس عاشی کا ایک پرانا آشنا جو چار پانچ سال پہلے امریکہ گیا تھا' واپس آیا۔ بھاٹی کا شکیل شہزاد' کسی زمانے میں شاہی محلے میں ویڈیو فلموں کا سنٹر چلاتا تھا۔ کمرشل فلموں کی آڑ میں دراصل وہ بیہودہ فلموں کا دھندا کرتا تھا۔ پورے لاہور میں وہ سویڈن' ہالینڈ' بلجیم' ڈنمارک سے سمگل شدہ خاص خاص پرنٹ سپلائی کرتا...... اس کے کارندے گھروں کوٹھیوں کوٹھوں میں فلمیں ہوم ڈیلیوری کرتے تھے مگر دوکان پہ وہ صرف کمرشل فلمیں ہی دیتا تھا۔ مس عاشی سے اس کا تعلق انہی فلموں اور لڑکیوں کے حوالے سے تھا۔ اس گھناؤنے کاروبار میں اس نے لاکھوں کمائے۔ پھر حرام مال' حرام بود والی بات ہوئی۔ دوکان کے سامنے چوبارے پہ اک نوعمر طوائف زادی موتیاں سے آنکھ مٹکا ہو گیا اب گندی کمائی' گندے تعلقات کی پائپ لائن کے ذریعے چوبارے پہ منتقل ہونے لگی۔ اسی عشق چوبارے میں اسے منشیات کی چیٹک بھی لگ گئی' ہوتے ہوتے منشیات کا کاروبار بھی کرنے لگا۔ نیا ایس ایچ او آیا تو اس سے بن نہ پائی دوکان پہ چھاپہ پڑا۔ چوبارے والی کی اور پولیس والے کی "چار چوٹ" سہ نہ سکا تو امریکہ بھاگ گیا۔ آسمان سے گر کر کھجور میں اٹک گیا' چھپڑ سے نکل کر سمندر میں اتر گیا۔ پاکستان میں اک چوبارے والی چھوٹی تھی تو وہاں کئی چٹی چمڑی والیاں مل گئیں۔ دیسی اور ٹھوٹھے کی جگہ ولا اور کرسٹل کے گلاس مل گئے' دو نمبر کی جگہ ایک نمبر ملنے لگی اور وہ بھی وافر —— چار بر



ایسے خرابے میں اڑائے کہ ہڈیاں دھواں چھوڑنے لگیں۔ بازوؤں کا کوئی ایسا مسام نہ بچا جہاں سرنجیں نہ ٹھکی ہوں۔ ایک وقت آیا کہ خون زہر ہو گیا۔ عام منشیات' تیز سے تیز شرابیں بے اثر پڑ گئیں۔ پاکستان ہوتا تو زبان پہ سانپ ڈسواتا' وہاں نت نئے سریع الاثر نشے آزماتا رہتا۔ اسی تلاش میں ایک آبرو باختہ جمیکن عورت سے مڈبھیڑ ہو گئی' یہ بھی کسی ناگن کی نسل سے تھی' اس نے اسے ایک انتہائی خوفناک نشے بلیک ٹائیگر سے متعارف کرایا جو انجکشن کے ذریعے پاؤں کے ناخن کی جڑ میں لیا جاتا تھا۔ کالے ناگ کے زہر سے کئی گنا زیادہ زود اثر کہ نشے کی آخری حد تصور کیا جاتا اس کا عادی بھوک' پیاس' آرام سے بے نیاز ہو کر ہر وقت بدکاری کی جانب راغب رہتا۔ عیاش لوگ اسے بطور خاص استعمال کرتے۔ خون آہستہ آہستہ تارکول کی طرح سیاہی مائل ہو جاتا تھا۔ سر کے بال اڑ جاتے۔ زبان کالی' آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے ابھر آتے۔ اگر عورت اور مرد دونوں عادی ہوتے تو وہ کئی کئی دن دنیا ومافیہا سے بے خبر پڑے رہتے۔ اس کا عادی شاید ہی کوئی اکیلا مرا ہو ورنہ سانپوں کے جوڑے کی مانند' آپس میں لپٹے ہوئے واصل جہنم ہوتے تھے۔

شہزاد کو اس نشے نے کچھ ہی عرصہ میں انسان سے خون آشام درندہ بنا دیا۔ شکل و صورت جو بگڑی سو بگڑی' پاؤں کے ناخن سیاہ پڑ کر طوطے کی چونچ کی مانند مڑ گئے تھے۔ یہاں آیا تو یار دوست اسے دیکھ کر حیران ہو گئے۔ شہزادوں جیسا خوبصورت نوجوان' اب امریکن ابوالہول بنا ہوا تھا۔ اس کے دوست احباب بھی کون سے انسان تھے جو اس کی حالت وہیت کو کوئی اہمیت دیتے' اہمیت تو اس بلیک ٹائیگر پوڈر کی تھی جو وہ دوستوں کے لئے تحفہ لایا تھا۔ ڈالر جیبوں میں ٹھسے ہوئے تھے چنانچہ آتے ہی یار باشوں کی راتیں زندہ اور جوان ہو گئیں۔

چوبارے والی قتالہ موتیاں اب شعلہ جوالہ بنی ہوئی تھی۔ زینت بلاک میں دس مرلے کی کوٹھی کے علاوہ نئے ماڈل کی کار بھی نیچے تھی۔ دو فلاپ فلموں کی ہیروئن اور دو تین فلمیں مزید بھی سائن کر چکی تھی مگر اپنے چوبارے میں ٹائم وہ اب بھی لگاتی۔ شہزاد تو کب کا قصہ پارینہ بن چکا تھا لیکن شہزاد کے دل میں وہ ہرجائی اب بھی روز اول کی مانند تیر کی طرح ترازو تھی۔

شہزاد کو یاد تھا کہ اس نے اپنا سب کچھ اس پہ نچھاور کر دیا تھا مگر جب اس پہ برے دن آئے تو اس نے نہ صرف طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لیں بلکہ در پردہ اسے پھنسانے کی کوشش بھی کی تھی۔ اس بے وفا موتیاں کو شہزاد نے دل کی گہرائیوں اور پوری سنجیدگی سے چاہا تھا مگر طوائف تو ایسی دوکاندار ہوتی ہے جو گاہک سے زیادہ اس کی جیب سے دلچسپی رکھتی ہے۔ اسے یہی دکھ تھا کہ قسمیں وعدے اور ٹوٹ کر چاہنے کے باوجود وقت بدلتے ہی اس نے بھی منہ موڑ لیا۔

لاہور آتے ہی اس نے موتیاں کے بارے میں ساری معلومات اکٹھی کر لی تھیں اور شاید
موتیاں کو بھی اس کے آنے اور اس کی جیب میں بھرے ہوئے ڈالروں کی اطلاع مل چکی تھی۔
ایک رات وہ اس کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ خوبصورت گھڑی' قیمتی پرفیوم دیتے ہوئے
تین ہزار ڈالرز کا ہار اس کے گلے میں ڈال کر بیتے دنوں کی یاد تازہ کرنے کے لئے اس کو پہلو میں
بیٹھا لیا۔ موتیاں نے بھی اسے مایوس نہ کیا' بڑی گرم جوشی سے اس کی پذیرائی کی۔ گلے
شکوے' آپس کی غلط فہمیاں دور کر کے پھر باہم شیر و شکر ہو گئے۔ شہزاد نے امریکہ میں اپنے
کاروبار' تعلقات اور ڈالروں کی ریل پیل کا نقشہ بڑی خوبصورتی سے کھینچتے ہوئے اسے ہیروئن
لے کر ایک انٹرنیشنل نوعیت کی فلم شروع کرنے کا منصوبہ اس کے سامنے رکھا۔ اس کی تو
باچھیں کھل گئیں۔ اسے خوب یاد تھا کہ کئی برس پہلے اسی شہزاد نے اسے کس طرح نہال کیا'
اس کی کونسی ایسی خواہش اور فرمائش تھی جو اس نے پوری نہیں کی تھی۔ وہ اچھی طرح جانتی
تھی کہ یہ اس سے بہت پیار کرتا ہے اور اب تو اس کے پاس ڈالروں کی بوریاں تھیں۔ فلم کا
منصوبہ' وہ انٹرنیشنل فلم کی ہیروئن بن رہی تھی' گویہ شہزاد پہلے والا شہزاد نہیں تھا۔ چٹا گورا'
وجیہہ' صحت مند اور کہاں یہ کہ سر بالوں سے خالی' چہرے پہ نحوست اور وحشت۔۔۔ بھدا
اور بے ڈول جسم' سیاہ ناخن' ریچھ کی مانند ہاتھ پاؤں لیکن وہ تو طوائف تھی اور پھر فلموں کی
ہیروئن! جو شکلیں' عمریں' بیماریاں اور جسمانی خوبصورتیاں نہیں دیکھتیں۔ وہ تو نوٹوں پہ چھپی
ہوئی تصویر' سیریل نمبر' گورنر کے دستخط اور تھوک لگا کر اس کا کچا پکا رنگ دیکھتی ہیں جو اس نے
دیکھ لیا تھا۔۔۔ اب شہزاد کی راتیں' اس کی زینت بلاک والی کوٹھی میں روشن ہونے لگیں۔
اس نے ایسا منتر پھونکا کہ موتیاں نے اپنی جوانی کی ساری کلیاں' پھول اس کے آگے ڈھیر کر
دیئے۔ بلیک ٹائیگر جو درمیان میں کودا تو نقشہ ہی بدل گیا۔ گھر بار' دفتر' چوبارہ' اسٹوڈیو' سب
کچھ فراموش ہو گیا۔ چوبیس گھنٹے دروازہ اندر سے بند رہنے لگا۔ بلیک ٹائیگر کے کالے ناگ نے
اس ناگ منی کو ایسا بدمست کیا کہ اب بین بجانے کی ضرورت ہی نہیں رہی تھی' یاد تھا تو
صرف شہزاد! جس کے پاس بلیک ٹائیگر تھا۔۔۔ گھر والوں نے جب یہ حالت اور کیفیت دیکھی تو
بری طرح بوکھلا اٹھے' اسے شہزاد کے چنگل سے نکالنے کے جتن کرنے لگے مگر اب شائد دیر ہو
چکی تھی۔ شہزاد نے اپنا انتقام لے لیا تھا۔ پھر مناسب موقع دیکھ کر وہ خود ہی منظر سے اوجھل ہو
گیا۔ موتیاں کے گھر والوں نے سمجھا کہ چلو' بات ختم ہو گئی مگر اصل بات تو اب شروع ہوئی
تھی۔ ایک آدھ دن جیسے تیسے گزر گیا۔ بلیک ٹائیگر کی ٹوٹ اور "بلیک کوبرے" شہزاد کی کمی
نے اسے شاید بے چینی اور بے تابی کے کانٹوں پہ لوٹا دیا۔ جسم کے اندر جیسے انگارے دہک



اٹھے تھے' اعصاب پہ تشنج طاری تھا۔
طوائفوں کے اپنے پرائیویٹ ڈاکٹر اور سیانے ہوتے ہیں جو ان کے امراض خبیثہ سے
خوب واقف ہوتے ہیں۔ کچھ صدری ٹونے ٹوٹکے طریقے بھی' جو کھوچل بوڑھی نائکاؤں اور
دمہ مارے کھوسٹ استادوں میں سینہ بہ سینہ چلتے ہیں۔ علاج معالجہ شروع ہوا تو تحقیق معائنہ
کے بعد عقدہ کھلا کہ مار سیاہ' کار سیاہ کر گیا ہے۔ علاج شروع ہوا۔ افاقہ تو کیا' لمحہ بہ لمحہ حالت
بگڑتی گئی۔ پاؤں کے سیاہ رنگت انگوٹھے سوج کر اخروٹ بن گئے۔ آخر منہ سے پھوٹی کہ شہزاد
انگوٹھوں میں انجکشن ٹھوکتا تھا۔ زہر پھیلا تو امراض نسواں کے ایک پرائیویٹ کلینک کے
پرائیویٹ روم میں لٹا دی گئی۔ کئی مختلف ٹیسٹ لیے گئے۔ رپورٹ ملی کہ وہ ایک لاعلاج
مرض میں مبتلا ہو چکی ہے۔ دو تین فلمیں سیٹ پر تھیں' برادری اور ہزار دشمن سجن تھے۔
بڑی مشکل میں پھنس گئے۔ ہر لحاظ سے رازداری برتی جا رہی تھی کہ بات باہر نہ نکلے۔ یہ
ہولناک انکشاف بھی ہوا کہ جس مرد سے یہ مرض ملا وہ انتہائی خطرناک مریض ہے اور پاؤں
کے انگوٹھے میں انجکشن لینے کا طریقہ بڑا جارحانہ ہے۔ پاؤں' ٹانگوں اور ریڑھ کی ہڈیوں کو
کھوکھلا کر دیتا ہے۔ پرائیویٹ کلینک تھا' دے دلا کر ان کا منہ بند کر دیا اور شہزاد کی تلاش شروع
کی جس نے بڑی ہوشیاری سے اگلا پچھلا حساب بیباق کر دیا تھا۔ موت کے منہ میں پڑی موتیاں
نے یہ بتانا مناسب نہ سمجھا کہ شہزاد اس سے زیور اور اچھی موٹی رقم بھی لے چکا ہے۔
وہاں سے اڑ کر یہ اڑن سانپ' دو مونہی سپنی مس عاشی کی بانبی میں گھسا بیٹھا تھا۔ اس روز
مس عاشی نے اس کے اعزاز میں ایک شبینہ دعوت کا انتظام کر رکھا تھا۔ ولایتی شرابوں اور
دیسی کبابوں کے ساتھ حکیم جمالی' ظہوری شاہ اور اس کے تمام ساتھیوں کے علاوہ شایان اور
نسہ بھی مدعو تھے۔ استاد شنو کی سنگیت منڈلی بھی پوری تیاری میں تھی۔ امریکہ اور وہاں کی
بیموں کے قصے' نائٹ کلبوں اور جوئے خانوں کی دلچسپیاں اور رنگینیاں' دولت ڈالر کی ریل
پیل۔۔۔ باتوں کے ساتھ کھانا پینا' گانا بجانا بھی ہوتا رہا۔ رات ذرا بھیگی تو طبیعتیں بھی بھیگنا
شروع ہوئیں۔ محفل عام کو برخواست کر دیا گیا۔ شایان اور رفیق ڈوگرا اپنے ڈیرے چلے گئے'
باقی ٹولہ سوائے مس عاشی' ظہوری شاہ کے فلیٹ میں پہنچ گیا جہاں "محفلِ خاص" کا خاص
اہتمام تھا۔ یہاں پہنچتے ہی بوتلوں کے کاگ اڑنے شروع ہو گئے۔ سوڈا' منرل واٹر' برف' کاجو'
تلی مچھلی' ہر چیز موجود تھی۔ بات چیت' انکشافات' خوش گپیوں کا سلسلہ بھی جاری ہو گیا۔
آہستہ آہستہ بوتلیں ہلکی اور پینے والوں کی سر اور آنکھوں کے پپوٹے بھاری ہو رہے تھے۔
شہزاد بڑا بے چین اور بیکل تھا' ظہوری شاہ سے کہنے لگا۔

"شاہ جی! آپ دوستوں کے لئے امریکہ سے جو خاص تحفہ لے کر آیا ہوں' اجازت ہو تو اس کے درشن کرادوں ——؟"

سب سے پہلے اس نے سرنج بھر کر اپنے پاؤں کے انگوٹھے میں ٹھونکی' پھر باری باری سب کے ساتھ شمسہ کو بھی آشنائے راز کر دیا —— رات اچھی خاصی بھیگ چکی تھی اور ایسے میں ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ جب پورا ماحول بھیگ جاتا ہے۔ پھر اپنے اپنے ظرف اور بساط کے مطابق انسان سرشار ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ یہاں بھی پرانے پرانے پاپی تھے ایسا سماں بھیگا کہ ہر طرف پھسلن ہی پھسلن ہو گئی۔

ٹیلی ویژن یا سینما میں برف پہ پھسلنے کے منظر آپ نے دیکھے ہوں گے۔ برف پہ پھسلنے اور اس پھسلن میں بس تھوڑا سا ہی فرق ہے۔ ایک پھسلن میں توازن اور توجہ پہ کنٹرول ضروری ہے اور اس پھسلن میں کنٹرول ہی تو ہوتا ہے جسے ختم کرنا ہوتا ہے۔ آج خرابات کا انداز اور لطف ہی جداگانہ تھا۔ ہوش و خرد اور معقولیت کی کوئی ایسی حد بندی قائم و حائل نہ تھی جو وجہ تاسف یا شرمندگی کا باعث ہوتی۔ وہ ہڑبونگ مچی کہ شیطان بھی اپنی شیطنت پہ شرمندہ ہو گیا۔

صبح کاذب سے صبح صادق کی جانب سرکتی ہوئی ظلمت کے چہرے کو ملگجے گھونگھٹ میں ڈھانپی ہوئی رات اپنے انجام کے قریب پہنچ چکی تھی۔ شغلِ شب بیداری سے بیزار ہو کر' کتے اور چوکیدار بھی اپنی دُمیں اور چہرے لپیٹ کر اونگھنے لگے تھے۔ شب زندہ دار' تسبیح و تہلیل سے فارغ ہو کر حمد و ثنا میں مصروف تھے۔ موذن' مرغِ صبح نوا کی بانگ پہ کان دھرے' نیند کے ٹوٹے خمار سے لبریز آنکھیں نیم وا کئے رات کے کسی ادھورے خواب کی کڑیاں ملا رہا تھا مگر شمسہ خواب کیا دیکھتی کہ اس بیچاری کو تو کسی نے سونے ہی نہیں دیا تھا۔

ایک نیم جان فاختہ اور کئی شکرے اور پھر بلیک ٹائیگر کی خرمستیاں۔ اس کا انگ انگ کی مانند دہک رہا تھا لیکن جب کسی میں درد اور کرب کا احساس ہی مردہ ہو جائے تو وہ جیتا جاگتا مردہ ہوتا ہے۔

اصولِ فطرت کے تحت —— رات کی کوکھ سے دن' روشنی کے اندر سے اندھیرے' ظلمتوں سے نور' بھوتوں کے گھر ولی' اچھے میں برے اور بدوں میں نیک پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ بلیک ٹائیگر کے نشے نے ان چھوٹے شیطانوں کو تو بہکا دیا تھا مگر شمسہ کے لئے یہ زہر ہلاہل کی بجائے تریاق ثابت ہوا۔ آذان کے آہنگ کا ارتعاش فضا میں نور بن کر پھیل گیا۔ نور پیر ویلا' رحمتوں کے نزول کا وقت۔ کونپلیں' کلیاں بن رہی تھیں اور کلیاں غنچوں کا روپ دھار رہی تھیں' غنچے پھول بن شبنمی غسل کر رہے تھے جب ایسے میں ایک ساعت رحمت بھری



بھی آئی کہ شمسہ کی ناک سے نکسیر پھوٹ نکلی۔ منہ' گردن' سینہ لتھڑ پتھڑ ہو گئے۔ آخر میں ناک سے ایک سیاہ چھوٹا سا خون کا لوتھڑا سا برآمد ہوا اور دماغ کی وہ نس کھل کر صاف ہو گئی جو دماغ کے اس حصے کو صاف خون سپلائی کرتی تھی جو بھول کی اندھی کوٹھڑی بن چکا تھا۔ سوچ کی پہلی کرن کسی بچھڑے ہوئے ساتھی کی طرح چپکے سے یادداشت کے روزن سے اندر داخل ہوئی' تاریکی آہستہ آہستہ دھند میں تبدیل ہونے لگی تو آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے وہ ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ وہ سب کچلا کھائے ہوئے کتوں کی طرح مردار پڑے تھے۔ منہ سے بہتی ہوئی لیس دار غلیظ رطوبتیں' چڑھی ہوئی سرخ آنکھیں' خالی بوتلیں' اوندھے پڑے ہوئے گلاس' تعفن' گھٹن —— کراہت اور خوف سے اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ کمرے سے باہر کی طرح اس کے اندر بھی روشنی بڑھتی جا رہی تھی' ذہن کی بند کھڑکیوں سے ایک ایک کر کے پردے ہٹتے جا رہے تھے۔

پہلا چہرہ جو اسے دکھائی دیا' ماں کا تھا۔ جھریوں بھرا چہرہ' گڑھوں میں اُتری ہوئی آنکھیں' سفید بال' لاغر' بیمار —— پھر بہنیں سامنے آ گئیں۔ معصوم' ڈری ڈری' سہمی سی۔ جنہیں نہ گڑیاں ملیں نہ کھلونے' پینگ جھولیں نہ جھولا' کسی بھائی کا پیار ملا نہ باپ کی شفقت نصیب ہوئی۔ پھر گھر' کالج —— اسے زور سے ابکائی آئی تو کسی عمر رسیدہ گدھ کی بیٹ جیسی بڑی سی قے اگل دی۔ اس کی آنکھیں نمک بھرے آنسوؤں سے جل تھل ہو گئیں' منہ جیسے کڑواہٹ سے بھر گیا ہو۔ خون اور الٹی کا غلیظہ اس کی گردن سینے کے علاوہ بستر پہ بھی پھیلا ہوا تھا۔ ظہوری شاہ کی اس پہ نظر پڑی تو بوکھلا کر اٹھ بیٹھا' حکیم جمالی اور شہزاد بھی ہڑبڑا کر آنکھیں ملتے ہوئے بیدار سے ہو گئے اور بستر کی چادر سمیت ڈنڈا ڈولی کرتے ہوئے اسے غسل خانے کے اندر رکھ آئے۔ پھر شہزاد خباثت بھرے لہجے میں کہنے لگا۔

"گھبرانے کی کوئی بات نہیں' جن جاتے ہوئے کوئی نہ کوئی نشانی دے کر ہی جاتا ہے —— بلیک ٹائیگر پہلی مرتبہ لینے سے یہی حالت ہوتی ہے' تھوڑی دیر بعد میں دوسری خوراک دوں گا یہ ٹھیک ہو جائے گی ——"

ظہوری شاہ ملازم کھسرے کو شمسہ کو نہلانے اور کپڑے تبدیل کرانے کا کہہ کر دوبارہ دوستوں میں آ بیٹھا —— شہزاد سرنج کو صاف کر کے بلیک ٹائیگر سے بھر رہا تھا اور حکیم جمالی شہزاد سے کہہ رہا تھا۔

"شہزاد صاحب! کیا کمال کا نشہ ہے' آج تک میں نے ایسا زور آور نشہ نہیں دیکھا' یہ تو انسان کی نسوں اور رگوں میں چار سو چالیس وولٹ کا کرنٹ دوڑا دیتا ہے ——" وہ شہزاد کی

چاپلوسی کرتے ہوئے کہنے لگا۔ "شہزاد صاحب! اس کا کوئی نسخہ ہمیں بھی عطا کر دیں۔ آ
جانتے ہیں کہ میں حکیم ہوں' میرے پاس بھی بڑے بڑے بم نسخے ہیں مگر یہ تو ایٹم بم
ہائیڈروجن بم کی تاثیر رکھتا ہے۔ بڑا لمبا مال پیدا کیا جا سکتا ہے' بڑے نوٹ چھاپے جا
ہیں۔۔۔"

"حکیم صاحب ! یہ نشہ ابھی نیا نیا ہے' امریکہ میں بھی ابھی عام نہیں۔ میرا پاکستان
کا مقصد بھی یہی ہے کہ اس کو مارکیٹ کرنے کے لئے یہاں کے ماحول کا جائزہ لیا جائے۔
تو صرف آپ کو نمونہ چکھایا ہے' کبھی ماحول بنا تو آپ کو اس کی اور بھی جادوگری دکھ
گا۔۔۔" وہ عیاشوں کی طرح آنکھ دبا کر بتانے لگا۔ "اگر تھوتھے مرد اور فریزر میں لگی
عورت کو اس کا انجکشن دیا جائے تو دونوں پارے کی مانند تھرکنا شروع کر دیں گے۔۔۔"

صبح کا دودھیا اجالا پھیل چکا تھا۔ شہزاد نے سرنج بھر کر اس پہ کیپ چڑھاتے ہوئے کہا
"فرینڈز ! بریک فاسٹ' یعنی ناشتے کا ٹائم۔ نہاری کلچے' سری پائے اور لسی کا انتظ
جائے۔ آفٹر ڈیٹ' یعنی اس کے بعد دوسرا راؤنڈ شروع ہو گا۔۔۔"

ناشتے کا انتظام باہر کھلی چھت پر کیا گیا تھا۔ کھا پی کر' فریش ہو کر یہ سارے واپس
آئے۔ شمسہ نہا دھو' نئے کپڑے پہنے پلنگ پہ نیم دراز تھی' چہرے پر وہی کھلتی
معصومیت۔۔۔ پاؤں کی حرکت سے ردھم دیتی ہوئی' میوزک سن رہی تھی۔۔۔ میوزک
طرح کا سن رہی تھی۔ ایک ریکارڈ پلیئر سے' دوجے اپنے ذہن کی لاسلکی سسٹم سے۔ ا
ذہن کی' کھوئی یادداشت سے فری کونسی مل گئی تھی۔ ماں بہنیں' شوکت' ریس کورس
تھپڑ۔ وہ غنڈے' ٹیکسی۔ حکیم جمالی کے ہاں وہ رات' ایک ایک چہرہ' مس عاشی' اس
قیام اور شایان !۔۔۔ ہر منظر' ہر حرکت' ہر سسکی' ہر زخم کچھ دھندلا' کچھ صاف' رو
کی مانند واضح ہو گیا تھا۔ اس کا نوچا کھسوٹا ہوا جسم' انگ انگ سے اٹھتی ہوئی درد کی لہ
کے باوجود اس نے برے کے گھر تک پہنچنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ فیصلہ کر لیا وہ انہیں یہ محسو
ہونے دے گی کہ وہ ہوش میں آ چکی ہے' اس کی کھوئی ہوئی یادداشت واپس مل چکی ہے
ویسے ہی معصوم اور بے حس پلنگ پہ پڑی تھی جب وہ سارے شیطان اندر آ گئے۔ ش
دیکھتے ہوئے حیران ہو کر بولا۔

"ونڈر فل' بہت اچھے۔ بیوٹی فل' چارمنگ ینگ برڈ!۔۔۔ کم آن فرینڈز! ا
دور شروع ہوتا ہے۔۔۔"

باری باری سب نے انجکشن لئے' شیشی اور سرنج خالی ہو چکی تھی۔ شمسہ انجا



رہ گئی۔

"سوری' ینگ لیڈی! بلیک ٹائیگر ختم ہو گیا' کل اور آ جائے گا۔ آج تم رم سے گزارہ کر
ولڈ جمیکن رم۔۔۔"

انجکشن لگانے کے بعد وہ بلیک ٹائیگر کی افادیت اور اس کے دیگر پہلوؤں پہ شیخیاں بکھیرتا
ب حکیم جمالی بھی بولا۔

"شہزاد صاحب! یہ بڑی کام کی شہزادی ہے' چپ چاپ تعاون کرنے والی!۔۔۔ جتنی اس کے
ہ ہوتی ہے' کوئی اور ہوتی تو کبھی کی فوت ہو چکی ہوتی۔۔۔"

شہزاد نے شمسہ کو گہری نظروں سے تولتے ہوئے اپنا خیال ظاہر کیا۔ "شی از گریٹ
ی۔۔۔ واقعی یہ بڑی ہمت والی لڑکی ہے لیکن مجھے کچھ ابنارمل سی لگتی ہے۔۔۔"

ظہوری شاہ نے بتایا۔ "یار! یہ اپنی یادداشت ضائع کر چکی ہے' یعنی مینٹل کیس ہے۔ جس
یانے لگا دو' وہیں سیٹ ہو جاتی ہے۔"

شمسہ کے کان ادھر ہی تھے۔ وہ سب کچھ سن رہی تھی' دیکھ رہی تھی اسی انجانے پن' بے
ی اور معصومیت سے۔۔۔ رم کے نیچے اوپر دو تین پیگ اس کے حلق سے اتر کر سینے کو
رداوی بنا چکے تھے' جبکہ دماغ آہستہ آہستہ کافور کی ڈلی بنتا جا رہا تھا اور متورم سرخ پپوٹے
ہی آپ بند ہوتے جا رہے تھے۔

ہوش آیا تو شام کے سائے اتر چکے تھے۔ انگ انگ میں دکھن۔ بازوؤں' ہاتھ' گردن پہ
جا نیل دھبے۔ گردن کے پٹھے اکڑے ہوئے' سر جیسے چکی کا پاٹ' زبان کاٹھ کی مانند اکڑی
ل کانٹے دار جھاڑ۔۔۔ بڑی مشکل سے تھوک نگلتے ہوئے خشک حلق کو تر کرنے کی کوشش
تے ہوئے وہ اٹھی' اسے شدت سے پیاس اور بھوک محسوس ہوئی۔ کمرا خالی' اجاڑ تھا جیسے
یاں اڑ جانے سے کھیت خالی رہ جاتا ہے۔ بہت دیر اسی حالت میں وہ پلنگ پہ بیٹھی خالی خالی
کھوں سے در و دیوار کو دیکھتی رہی۔ کھلی کھڑکی کے اس پار آسمان پر سفید روئی کے گالوں کی
ند' اکھرے اکھرے بادل اور بادلوں کے پرے۔۔۔ خدا جانے وہ کیا دیکھ رہی تھی؟۔۔۔ پھر وہ
ے تیسے اٹھی اور کھڑکی کے پاس آ کر' کھڑکی کے پٹ کا سہارا لے کر کھڑی ہو گئی' دور تک کھلا
کان' اس کے نیچے اونچے نیچے مکان' کوٹھیاں' مسجدوں کے مینار' کبوتروں کی چھتریاں' ٹیلی
ین کے انٹینے' گڈیاں پتنگیں اڑاتے ہوئے بچے اور لڑکے۔۔۔ تصور میں وہ کبھی پتنگ بن
ی' کبھی کسی کبوتری کا روپ لیتی۔ دیر تک وہ کھلی فضاؤں' ہواؤں میں لہراتی اور تیرتی رہی۔
نیچے' ایک تنگ سی گلی میں وہ اپنا گھر تلاش کرتی رہی جہاں اس کی بیمار ماں اور بہنیں نہ

جانے کس حال میں ہوں۔۔۔ اس کی اڑان کو ایک اڑتی ہوئی آواز نے اڑا کر رکھ دیا۔

"ہائے۔۔۔ میں صدقے، میں واری۔۔۔ میری بنو جاگ پڑی، مجھ کلموہی کو خبر تک ہوئی۔۔۔"

اس کا نگران زنخا کھڑکی کے باہر ہاتھ نچا نچا کر اپنی بے پر کی ہانک رہا تھا، پھر آناً" فاناً" وہ گھسا اور ہاتھ پکڑ کر باتھ روم میں لے گیا۔۔۔ گھنٹہ بھر بعد کنگھی پٹی، کپڑے لتے پہنا کر کے لئے کھانے پینے کا سامان لینے نیچے اتر گیا اور یہ اپنی گڑیا اور ہار سنگار کا سامان لے کر باہر چھت پہ نکل آئی۔ بڑا خوشگوار موسم تھا۔ ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا، صاف آسماں پر نیلی، پیلی، ہری لال پتنگیں۔ اسے اپنے رگ وپے میں بڑی خوشگوار سی تازگی کا احساس ہوا شاید اس بھی کہ اب اس کا احساس بیدار ہو چکا تھا۔

اچانک جیسے گردن کے پیچھے کسی نے تیز دھار کی چھری پھیر دی ہو، بیساختہ منہ سے نکل گئی۔ کسی کٹی پتنگ کی مانجھا لگی ڈور پھر گئی تھی۔ ساتھ ہی ذرا پرے، اپنے فلیٹ کی جانب شانی بیٹھا پڑھ رہا تھا، چیخ کی آواز پہ بھاگا ادھر آیا۔ ڈور شمسہ کی گردن میں لپٹی ہوئی نظر آ گئی تھی۔ شمسہ اپنی گردن پہ ہاتھ رکھے وہیں ڈھیری ہو گئی تھی۔

"کیا ہوا۔۔۔؟"

وہ بھاگا بھاگا آیا اور جھیرا پھلانگتے ہوئے پوچھنے لگا۔ شمسہ نے گردن اٹھا کر اسے کوئی جواب دینے کی بجائے ہاتھ ہٹا کر گردن دکھانے لگی۔ سرخ سی لکیر، جیسے کسی رنگ کی مارکر ٹپ پنسل سے لائین لگا دی ہو۔

"ارے، یہ تو ڈور پھر گئی ہے۔۔۔" وہ ہاتھ سے بالوں کا جوڑا ہٹا کر گردن دیکھنے لگا یہیں ٹھہرو، میں کچھ لگانے کے لئے لاتی ہوں۔۔۔"

وہ اسے جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ نیلے ہلکے رنگ کی زنانہ شلوار قمیض، نا میک اپ، کندھوں سے جھولتے ہوئے بال۔ وہ ایک خوبصورت، اسمارٹ لڑکی دکھائی تھا اور کتنا سبک مہربان ہاتھ تھا اس کا، جیسے کسی مسیحا کا ہاتھ ہو۔ کتنے ہی لمحے وہ اپنی گرد ہوئی مرغابیوں کے زیریں نرم نرم روئیں کا جان افروز لمس محسوس کرتی رہی۔ ڈریسنگ کا سامان لے کر آیا۔ شمسہ گردن کو بھول کر اس خوبصورت پتنگ کو دیکھ رہی کی ڈور نے اس کی گردن پہ چرکہ لگایا اور وہ ابھی تک ٹیلی ویژن کے انٹینے میں تھی۔ شانی نے پھرتی سے ڈور پکڑ لی، ہاتھوں میں ڈور آتے ہی رنگ رنگیلی کٹی پتنگ سے سربلند ہو گئی۔ کئی ایک، اک تاوے، دو تاوے، بھدے سے گڈے اسے پھا



میں تھے۔ ایک اوچھا سابد مغز تو سر پہ چڑھا ہوا تھا، دائیں بائیں طرح طرح کے جھکے دے کر پھانسنا چاہتا تھا۔ اس سے دو ہاتھ کرنا ضروری ہو گیا۔ شانی نے ڈھیل دے کر بائیں جانب کھائی لی۔ وہ ادھر تیرتا ہوا، ہوا کی طرح آیا تو شانی نے اس کی ڈور پہ ڈور ڈال دی، ہلکی ہلکی بیاں دینے لگا۔ وہ بھی ڈھیلی ڈور پہ تھا، ادھر ڈور ختم ہو گئی۔ آر یا پار۔ شانی نے آہستہ سے تنکا یا تو وہ کٹ گیا۔۔۔ شمسہ بڑی دلچسپی سے دیدے پھاڑ پھاڑ مقابلہ دیکھ رہی تھی۔ کن کٹا معاش گڈا بڑی ذلت سے ڈولتا ہوا نائیوں کی دوکان پہ پانی کی ٹنکی کی اوٹ میں غرق ہو گیا۔

"وہ مارا۔۔۔" شمسہ نے تالیاں پیٹتے ہوئے نعرہ لگایا۔۔۔ "کمال کر دیا، شانی بھائی!"

بے ساختگی میں اس کے منہ نکل گیا۔ شانی کے ہاتھ سے پتنگ کی ڈور چھوٹ گئی، وہی ہ زناٹے سے اس کے گال سے ٹکرایا تو وہ وہیں پنے سے اتری ہوئی ڈور کی مانند فرش پہ ڈھیر گئی۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ نہ تو ہاتھ والے کو احساس ہوا کہ وہ کیا کر گزرا ہے اور گال والی کو اندازہ ہوا کہ اس کے ساتھ کیا ہو گزری ہے۔ شانی بھائی جا چکا تھا۔۔۔ چوٹ منہ پڑے یا من پہ، ملال تو ہوتا ہے۔ ہکا بکا پاؤں میں الجھی ہوئی ڈور کو دیکھنے لگی۔ شیشے کا مانجھا لگی لوار سی تیز دھار والی، پیچ در پیچ جس کے سرے جانے کہاں گم ہو گئے تھے۔ گم صم، کچھوے کی طرح اپنا سر اندر کئے پڑی رہی اور نگران زنخا نجانے کب سر پہ آ کھڑا ہوا۔

"اے، میں قربان۔ صدقے واری۔۔۔ تم یہاں بیٹھی کیا کر رہی ہو؟"

وہ مسکراتے ہوئے ڈور کو سیویوں کی طرح اچھالتے ہوئے بولی۔

سیویاں پکا رہی تھی، اپنے گڈے کی شادی کے لئے۔۔۔"

☆☆☆

تھپڑ نے جیسے اس کی دنیا ہی بدل ڈالی تھی، اس کے اندر جرات اور توانائی کے بند سوتے کر دیئے تھے۔ اسے وہ تھپڑ بھی یاد آ گیا تھا جو شوکت نے اسے اسی انداز میں جڑا تھا۔ فرق بس اتنا کہ وہ تھپڑ دانستہ برائی کا تعلق پیدا کرنے کی پاداش میں تھا اور یہ تھپڑ نادانستگی میں کا رشتہ جوڑنے کے صلے میں تھا۔

"اٹھو، نی میری جان! اندر چلو، آج میں تمہیں ریشم کے لچھوں جیسی سیویاں ہی پکا کر ہوں۔۔۔ کیا یاد کرو گی۔"

اندر پہنچتے ہی وہ دانستہ گڑیا لے کر بیٹھ گئی۔ نگران نے اسے ایک کیپسول اور گلاس میں کا مشروب پینے کو دیا جسے تھوڑے تامل کے بعد وہ پی گئی۔ پھر گڑیا کھیلتے کھیلتے ہی وہ ی محسوس کرنے لگی، ذہن سوچوں سے بالکل صاف ہو گیا لیکن اس کے باوجود وہ سمجھ

گئی کہ یہی وہ زہر ہے جس کی وجہ سے وہ کچھ سمجھنے، جاننے اور عمل کرنے کی صلاحیتوں سے
محروم رہی ہے۔ تھوڑی بعد وہ گہری نیند سو گئی۔

شانی نے تھپڑ تو مار دیا تھا مگر اب پچھتا رہا تھا۔ اپنے بستر پہ پچھتاوے، شرمندگی کی گٹھڑی
بنا ڈھیر تھا۔۔۔ "شانی بھائی، شانی بھائی!" ۔۔۔ کی بازگشت اس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ
تھا۔ جو اسے دیکھ دیکھ جیتی تھیں، اس کی ہر خواہش پوری کرتی تھیں مگر کئی مہینوں سے
رہی تھی۔ جان قربان کرنے والی بہنوں کا اکلوتا بھائی! جن کے بغیر وہ جینے کا تصور نہیں کر
نے ان کی شکل تک نہیں دیکھی تھی۔ انہیں دیکھنے کو دل تڑپتا تھا مگر باپ نے سختی سے م
رکھا تھا اور آج ایک ایسی لڑکی نے جسے کئی بار پوشاک سے بے نیاز دیکھا، جسے ہر روز ک
خراب کرتے ہیں اس لڑکی نے اسے بھائی کہا۔ وہی جس کے ساتھ وہ شرمناک حالت میں
فلم بنوا چکا تھا، وہ اسے بھائی کیسے کہہ سکتی ہے؟۔۔۔ اسے یہ لفظ کہاں سے ملا، یہ مقدس
کہاں سے سمجھائی دیا؟۔۔۔ ایک دم وہ اٹھ بیٹھا، آنکھیں میچ کر گہری سوچ میں ڈوب گ
یاد آیا کہ وہ ہمیشہ اسے اپنا گڈا کہتی آئی ہے۔ میرا گڈا! میں اپنی گڑیا اس سے بیاہوں گ
گڈا، بو کاٹا۔۔۔ اسے یاد آیا کہ اس کی گردن کے پیچھے سرخ لکیر تھی، ڈور پھر گئی تھی۔ د
اور روئی لے کر گیا تھا۔ ڈیٹول تو لگایا ہی نہیں، وہ پتنگ کے چکر میں پڑ گیا تھا۔۔۔ ٹائم
آٹھ بجنے والے تھے۔ منہ ہاتھ دھو کر وہ ذہنی تناؤ سے چھٹکارے کی خاطر نیچے اکیڈمی
آیا۔

استاد برکت ہارمونیم پہ سُریں ملا رہے تھے، عنایت طبلے کی طنابیں ٹھونک رہا تھا،
لڑکیاں کھڑکی کے پاس کھڑی کھسر پھسر کر رہی تھیں۔ استاد شفو شاید غسل خانے میں
تھا۔ وہی منحوس سا ماحول، دھندلا دھندلا بے کیف سا۔ عجیب سی ناگوار بساند ناک سڑا ر
دیواروں پہ گوپی کرشن، مہاراج کتھک، مہاراج برجو پرشاد اور ستارہ دیوی کی پرانی ت
اوپر باسی پرانے گیندے کے ہار، کانسی کی مورتیاں، اکیڈمی کے مختلف فنکشنوں کے موقعوں
ہوئی فلمسٹارز کے ساتھ تصویریں۔ لکڑی، گلٹ اور تانبے کے ایوارڈ، باسی ہار،
تنبورے، طبلے مردنگ، ڈھولک، گھنگھرو۔ میلا مدھم گھسا ہوا قالین، ڈھیلے ڈھیلے گاؤ
سب کچھ جو وہ روز دیکھتا چلا آ رہا تھا۔ نفاست پسند طبیعت میں ناگوار سا تکدر، مروڑ ک
وہ اٹھ کر باہر بالکونی کی ریلنگ پہ ٹیک لگا کر نیچے آتے جاتے لوگوں کا نظارہ کرنے لگا۔
مارکیٹ کی سیڑھیوں کے قریب گرے میٹلک ٹیوٹا نے بریک لگائے۔ زلفی
سے باہر نکلتے ہی اسے بالکونی میں کھڑے دیکھ لیا تھا، کئی دنوں کے بعد دکھائی دیا



اسمارٹ، نیوی بلیو میچنگ پینٹ شرٹ میں۔۔۔ وہ مسکراتا ہوا سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ دونوں
خوب گھٹ کر جپھی ڈال کر ملے اور پھر شانی ہاتھ پکڑ کر اسے فلیٹ میں لے گیا۔

"کہاں رہے اتنے دن۔۔۔؟" شانی نے قدرے خفگی سے پوچھا۔

"اگر یہی سوال میں تم سے کروں۔۔۔؟" زلفی نے جواب دیا۔

"تو۔۔۔ تو میں یہی کہوں گی کہ پڑھائی اور تعلیم میں مصروف ہوں۔۔۔ طبیعت بھی کچھ
ٹھیک نہیں رہی۔۔۔"

زلفی اسے خشمگیں نظروں سے گھورتے ہوئے بولا۔ "فلاسفر بھائی! ذرا ایزی۔۔۔ خدا
کے بندے! کبھی تو عام فہم بات کر لیا کرو یا پھر تم مجھے تنگ کرنے کے لئے ایسا کرتے ہو۔۔۔؟"

شانی نے کھل کر قہقہہ لگایا۔ "خوب، بہت خوب۔۔۔ بھائی! میں نے کون سی ایسی بات کر
دی ہے جو مشکل اور سمجھ میں نہ آنے والی ہو، ذرا بتاؤ۔۔۔؟"

زلفی جیسے یاد کرتے ہوئے بتانے لگا۔ "ایک تو تم نے کہوں گا، کی بجائے "کہوں گی" کہا
ہے۔ دوسرے پڑھائی اور تعلیم کی تکرار کی ہے جب کہ پڑھائی اور تعلیم ایک ہی بات ہے۔
رے یہ کہ طبیعت ٹھیک نہیں۔۔۔؟"

شانی جواب دینے کے لئے پر تول ہی رہا تھا کہ زلفی نے جھٹ اس کے منہ پہ ہاتھ رکھ دیا
ر بولا۔

"میں نے گناہ کیا جو یہ بات کر دی۔۔۔ بھائی! کوئی جواب نہ دینا ورنہ سوال و جواب میں
ات گزر جائے گی جبکہ میں یہاں صرف دس پندرہ منٹ کے لئے آیا ہوں صرف تمہیں
ملنے، جلدی سے یہ بتاؤ، نصیب دشمناں تمہاری طبیعت کو کیا ہوا۔۔۔؟"

"یار! آپریشن کی جگہ کھجلی بہت ہوتی ہے۔ دانے نکل آئے ہوئے ہیں، ایک آدھ پھنسی
ی نکلی ہوئی ہے۔ پیشاب والی تکلیف بھی ابھی موجود ہے۔۔۔"

وہ تشویش ظاہر کرتے ہوتے ہوئے مشورہ دینے لگا۔ "جناب! یہ سب تمہارا اپنا قصور
ہے۔ اتنا سنجیدہ کیس ہے مگر تم ذرا بھی توجہ نہیں دیتے۔ تمہیں فوراً" ڈاکٹر سے رجوع کرنا
اہیے تھا یا پھر مجھے فون کر دیتے۔"

"یار! تم ٹھہرے کاروباری بندے، کہاں تمہیں زحمت دیتا پھروں۔ پہلے ہی تم نے میرے
سلسلے میں بڑا ٹائم ضائع کیا ہے۔۔۔ ویسے حکیم جمالی صاحب میری دیکھ بھال کرتے رہتے
ہیں۔"

"جیسے تمہاری مرضی، بھائی! تم کسی کی مانتے، سنتے تو ہو ہی نہیں۔۔۔ اچھا، مجھے اجازت

دو۔۔۔“

”۔۔۔نہ ’ناں۔۔۔ تم یوں نہیں جا سکتے۔ کھانا کھائیں گے‘ باتیں کریں گے اور پھر کوئی اچھی سی فلم دیکھیں گے۔۔۔“

”کھانا تو خیر‘ میں کھاؤں گا نہیں۔ مجھے ایک شادی میں شریک ہونا ہے۔۔۔ رہیں باتیں تو وہ میں تمہارے آگے کر ہی نہیں سکتا۔ میری ہر بات کا تمہارے پاس ایسا مدلل جواب ہوتا ہے کہ میری بات بیچاری اپنا سا منہ لے کر شرمندہ ہو جاتی ہے۔۔۔ باقی رہی فلم‘ تو وہ تو بالکل ہی خارج از عمل ہے۔ ٹائم نہیں۔۔۔“ وہ گھڑی دیکھتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ ”مجھے اجازت دو یہیں سبزہ زار میں مجھے ایک کرائم رپورٹر سے بھی ملنا ہے۔۔۔“

”خیریت۔۔۔ اس سے کیا کام پڑ گیا؟“

”۔۔۔وہی۔۔۔ اپنی گم شدہ بہن کے سلسلے میں کچھ بات چیت کرنی ہے۔“

شانی عجلت سے پوچھنے لگا۔ ”کیا کوئی سراغ ملا۔۔۔؟“

”فی الحال کوئی سراغ تو نہیں ملا لیکن مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ کوئی نہ کوئی راستہ ضرور نکال دے گا۔۔۔ یہ کرائم رپورٹر کسی زمانے میں میرا کلاس فیلو رہا ہے۔ میں ادھوری پڑھائی چھوڑ کر بزنس کی طرف نکل آیا‘ وہ پڑھائی مکمل کر کے صحافت کی جانب جا نکلا۔ بڑا مخلص لڑکا ہے۔ جیل خانے‘ پاگل خانے اور دیگر رفاہی اداروں میں اس کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔ میں نے اتفاقاً ایک روز اس سے بات کی تو اس نے مجھے امید دلاتے ہوئے نگہت کی تصویر مانگی تھی آج میں اسے تصویر دینے جا رہا ہوں۔۔۔“

”اللہ کرے‘ یار! ہماری بہن کا کوئی سراغ مل جائے۔۔۔ مناسب سمجھو تو مجھے بھی دکھا دو۔“

زلفی نے پرس کھول کر اسے تصویر دکھاتے ہوئے کہا۔

”یہ ہے میری بد نصیب بہن‘ نگہت۔۔۔!“

شانی کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں‘ یہ چہرہ اس کے لئے اجنبی نہیں تھا۔۔۔ پاسپورٹ سائز کی تصویر میں شمسہ دوپٹہ اوڑھے مسکرا رہی تھی وہ گنگ منگ لہجے میں پوچھنے لگا۔

”یہی تمہاری بہن ہے۔۔۔؟“

”ہاں۔۔۔ بڑی سوبر اور اچھی لڑکی تھی‘ نہ جانے کس کی نظر اسے نگل گئی اور کس نے اسے نشے پہ لگا دیا۔۔۔ اللہ جانے کس حال میں ہے‘ زندہ بھی ہے یا۔۔۔“

بے اختیار شانی کے منہ سے نکلا۔ ”۔۔۔وہ زندہ ہے‘ زلفی!۔۔۔ وہ زندہ ہے“



جس والہانہ انداز اور یقین بھرے لہجے میں اس نے یہ الفاظ دہرائے تھے‘ زلفی اس انداز کو محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا۔

”شانی! کیا تم نے اسے کہیں دیکھا ہے۔۔۔ تم جانتے ہو کہ وہ کہاں ہے؟“

شانی ابھی تک گم صم تصویر کو دیکھ رہا تھا۔ وہ کس قدر بھولی اور معصوم سی تھی۔ چہرے پہ کنوار پنے کا تقدس‘ آنکھوں میں حیا‘ تصنع سے پاک خد و خال۔۔۔ یہ تصویر بہت پہلے کی تھی جب وہ کلیوں کی نکہت کی طرح لطیف اور پاکیزہ تھی۔ زلفی اسے جھنجھوڑتے ہوئے پوچھنے لگا۔

”شایان! میں کیا پوچھ رہا ہوں۔۔۔ یاد کرو‘ تم نے میری بہن کو کہیں دیکھا ہے۔۔؟“

شایان تصویر واپس دیتے ہوئے پر اعتماد لہجے میں بولا۔ ”میرے بھائی! جب کوئی چیز ہاتھ سے نکل کر زمین پہ گر جاتی ہے تو وہ نہیں رہتی جو وہ پہلے ہوتی ہے‘ کسی نہ کسی حد تک وہ آلودہ ہو ہی جاتی ہے۔۔۔“

”کیا مطلب؟۔۔۔ پہیلیاں نہ بجھواؤ۔ خدا کے لئے بتاؤ کہ میری بہن کہاں ہے؟“

وہ قطعیت سے بولا۔ ”ابھی کچھ مت پوچھو‘ میں سردست یہی بتا سکتا ہوں کہ وہ زندہ ہے‘ باقی تم سب کچھ مجھ پر چھوڑ دو۔۔۔ دیکھو‘ کیا ہوتا ہے؟“

زلفی دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بیٹھ گیا‘ کافی دیر کسی سوچ میں ڈوبا رہا پھر سر اٹھا کر بولا۔

”شکریہ۔۔۔ بہت بہت شکریہ‘ شایان! تم نے کم از کم نگہت کے زندہ ہونے کی خوشخبری تو سنائی۔ میں جانتا ہوں کہ اس بات کے علاوہ تم مجھے اور کچھ نہیں بتاؤ گے مگر پلیز! صرف یہ بتا دو کہ وہ کہاں ہے‘ میرا مطلب ہے کہ یہیں لاہور میں یا کہیں۔۔۔“

”کہہ جو دیا‘ یار! صبر کرو‘ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔۔۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا‘ مجھ پہ بھروسا رکھو۔۔۔“ پھر وہ اٹھتے ہوئے اسے کہنے لگا۔ ”میرا خیال ہے کہ اب تم جاؤ مگر کسی سے اس بات کا ذکر تک بھی نہ کرنا‘ اس کرائم رپورٹر سے بھی اب ملنے کی ضرورت نہیں۔۔۔ اللہ سے دعا کرنا اور میں خود ہی تم سے جلد رابطہ کروں گا‘ مجھے ٹیلی فون کرنے یا یہاں آنے کی زحمت نہ کرنا۔۔۔“

وہ کچھ مطمئن ہوتے ہوئے بولا۔ ”ٹھیک ہے۔۔۔ یاد ہوگا‘ تم نے مجھے بھائی بنایا ہوا ہے۔ اس ناطے نگہت بھی تمہاری بہن ہے۔ اس کے علاوہ میں کچھ اور نہیں کہتا۔۔۔“

شایان قدرے خفگی سے بولا۔ ”یار! تم اس وقت چلے جاؤ‘ مجھے اکیلا چھوڑ دو۔۔۔“

زلفی اس کے اچانک بدلتے ہوئے رویئے کو سمجھ نہ پایا اور حیران پریشان اللہ حافظ کہہ کر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد شایان کمرہ اندر سے بند کرتے ہوئے شکستہ سا بستر پہ گر گیا۔۔۔

واقعی اسے اس وقت تنہائی کی بے حد ضرورت تھی' تنہائی ہی ایک ایسا گوشہ ہے جہاں انسان خود سے ملاقات کرتا ہے' خود ہی سوال اور خود ہی جواب دیتا ہے۔ سوچوں اور خیالوں کے پانی میں فیصلوں کا دودھ ملاتا ہے' امیدوں کی شکر گھولتا ہے۔ پھر کہیں سے اندیشوں کی پھٹکری جاتی ہے اور سب کچھ پھٹ کر رہ جاتا ہے۔ پھر انسان چاہے بھی' نہ تو پانی الگ ہوتا اور نہ دودھ شکر--- "شایان! اس ناطے وہ تمہاری بہن ہے"--- بائیں' دائیں' کان انہی الفاظ کی بازگشت سے گونج رہے تھے--- شمسہ' زلفی' حکیم جمالی' مس عاشی' عامل ظہوری شاہ' استاد قربان' استاد شفو' رفیق ڈوگر' حاجی رجی بیگم' ایک ایک چہرہ اپنی صداقتوں' ملاحتوں اور خباثتوں کے ساتھ مختلف انداز میں اس کے سامنے گھوم رہا تھا۔ دودھ' پانی' شکر' سب کچھ آپس میں گڈ مڈ ہو رہا تھا۔ اسے نیند سی آ گئی۔ موت کی چھوٹی بہن نیند سب دردوں' دکھوں' غموں' پریشانیوں' الجھنوں کا درماں--- یہ دونوں نہ ہوں تو انسان پڑا پڑا پھٹ جائے اور دل' جگر کٹ کر پانی کی طرح بہہ جائیں' دماغ سے بھیجا ابل کر باہر آ جائے اور آنکھوں سے دھواں اٹھنے لگے۔

چند گھنٹوں کی جھپکی نے اسے پرسکون کر دیا۔ نہا دھو' کر کپڑے بدل کر وہ نیچے اکیڈمی میں چلا آیا۔ وہاں حسب معمول رونق تھی' ساز چھڑے ہوئے تھے۔ محمود بوٹی' بوٹی کے ترنگ میں بڑی دھیرج--- سے "دیکھ تو' دل کہ جاں سے اٹھتا ہے' یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے" گا رہا تھا۔ سُر کا رچاؤ' آواز کا درد اور کچھ اس کی اپنی کیفیت--- وہ دھوئیں کی طرح بل کھاتا ہوا اس کے پہلو سے جا لگا۔ غزل نے بڑا سکون دیا تھا--- حکیم جمالی' ظہوری شاہ' آج دونوں غائب تھے' رفیق ڈوگر بیٹھا چرس پی رہا تھا۔ ہیجڑوں کی اصطلاح میں وہ اس کا "پار کر تھا" جس کے ساتھ اس کی بھی رسمی طور پر شادی ہوئی تھی مگر بے ضرر' بے نیاز سا بدعلتہ۔ شانی کے آگے پیچھے وہ کتے کی مانند دُم ہلاتا رہتا۔ شانی آج ناچ گانے کی تعلیم میں نہیں بیٹھا تھا' سوچ کی سوئی شمسہ پر اٹکی ہوئی تھی مگر آنکھیں سامنے ناچتے ہوئے زنخوں اور زنخا نما لڑکوں پہ ٹکی تھیں۔ بھائی شمشاد ہاتھ میں ہاتھی دانت کی مٹھ والی بید کی چھڑی کے اشارے سے شاگردوں کو نرت بھاؤ بتا رہے تھے بلکہ کبھی کبھی خود بھی اٹھ کر ردھم پہ قدم ملا کر دکھاتے۔ پیرانہ سالی اور رعش زدگی کے باوجود بھی وہ گھنٹوں ناچتے اور کہتے تھے کہ گانا اور ناچنا' مسلسل ریاضت کے ساتھ رہتے ہیں--- یہاں سے بھی طبیعت اوبی تو شایان استاد شفو کو لے کر دفتر آ بیٹھا۔

"کیا بات ہے' شہزادے! آج ریہرسل سے بھی غائب اور موڈ بھی آف---؟" استاد نے چرس کی پھکی کو دیا سلائی سے شعلہ دکھاتے ہوئے پوچھا۔



"بس یونہی--- آج طبیعت بوجھل سی ہے' شاید بدلتے موسم کا اثر ہے۔" شانی نے جیسے اسے ٹالنے کی کوشش کی۔

اسی وقت دو اجنبی اجازت لے کر اندر داخل ہوئے۔

"جی--- فرمایئے؟"

استاد شفو نے انہیں بیٹھنے کے لئے کہا' میوزک پروگراموں کے لئے لوگ آتے جاتے رہتے تھے مگر وہ کھڑے کھڑے ہی پوچھنے لگے۔

"ہم شہزاد کے بارے میں دریافت کرنے آئے ہیں--- کیا وہ یہاں آیا تھا؟"

استاد شفو نے انہیں بغور دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ "آپ غلط جگہ پہ آئے ہیں' ایسے کسی شخص کو ہم نہیں جانتے۔ یہ میوزک اکیڈمی ہے' یہاں صرف میوزک ڈانس سیکھنے والے ہی آتے ہیں--- ویسے آپ کہاں سے آئے ہیں اور شہزاد کون ہے؟"

ان میں ایک بڑی مونچھوں والا بولا۔ "یہ شہزاد بڑا حرامی اور فراڈی ہے۔ اسے ایک خطرناک بیماری ہے۔ اس نے ہمارے ساتھ بہت بڑا ہاتھ کیا ہے' ہم اسے تلاش کر کے فائر ٹھوکنا چاہتے ہیں---" وہ موزر دکھاتے ہوئے مونچھوں پہ تاؤ دے رہا تھا۔

استاد شفو بڑے اطمینان سے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہنے لگا۔ "آپ یہاں کیسے تشریف لائے ہیں---؟"

اب دوسرا مسٹنڈا بولا۔ "بس جی' کسی نے بتایا تھا کہ اس بلڈنگ میں اس حرامی کا کوئی دوست رہتا ہے۔ وہ بھی موج میلے اور ناچ گانے کا شوقین ہے اس لئے ہم یہاں اس کا پتہ کرنے آئے ہیں---"

استاد شفو نے بھرا ہوا سگریٹ شانی کو دیتے ہوئے ان سے کہا۔ "آپ کوئی چائے پانی---؟"

ایک بولا۔ "ہم یہاں پینے پلانے نہیں' اس کتے کو تلاش کرنے آئے ہیں---"

استاد شفو اب دروازے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "یہ موزر اپنی بغل میں دبا لو اور نیویں نیویں یہاں سے شکل گم کرو ورنہ اس کھڑکی سے نیچے پھینکوا دوں گا---"

ہکا بکا دونوں اس چمرخ کو دیکھنے لگے۔ ان کی سٹی گم ہو چکی تھی' ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے وہ باہر کھسک گئے۔

"واہ' استاد جی! کمال کر دیا آپ نے--- ان ہٹے کٹے سانڈوں کو ایک منٹ میں بکری بنا دیا۔ آپ ان کے موزر سے بھی نہ ڈرے' میرے خیال میں وہ بالکل اصلی تھا---"

وہ سگریٹ کا کش کھینچتے ہوئے مسکرایا پھر کہنے لگا۔ "بھولے بادشاہ! میں نے انہیں پہلی نظر میں ہی پہچان لیا تھا' یہ اس بازار کے دلال اور دو نمبر کے بدمعاش ہیں۔ ان کے موزر فائر نہیں کرتے' یہ صرف منہ سے فائر کرتے ہیں اور اگر آگے سے بھی کوئی منہ سے فائر کر دے تو یہ بکری بن جاتے ہیں۔ یہ پہلے ریکاتے ہیں' کوئی نہ ریکے تو خود ریک جاتے ہیں---" وہ آنکھ دبا کر مزید کہنے لگا۔ "اپنی برادری کے جو ہوئے---"

"یہ شہزاد والا کیا چکر ہے--- وہ اسے بڑی گالیاں دے رہے تھے---؟"

"میری جان! ہمیں کیا لینا دینا۔ کوئی کیا کرتا ہے' وہی جانے--- آنکھیں' کان اور منہ پہ کنٹرول بڑا ضروری ہے۔ کبھی کسی کی نشاندہی نہیں کرنا چاہئے' خوامخواہ بیلنے میں بازو دینے والی بات ہو جاتی ہے---"

"مگر یہ بیماری والی بات--- مجھے تو کوئی خطرناک بات معلوم ہوتی ہے---"

"شانی صاحب! امریکہ اور یورپ میں ایسی کئی بیماریاں پھیلی ہوئی ہیں۔ آپ تو پڑھے لکھے ہیں' اخباروں میں پڑھتے ہوں گے۔ یہ بیماریاں مرد عورت کو ایک دوسرے سے لگ جاتی ہیں۔ ایک دوسرے کے خون' غلاظت' تھوک اور انجکشنوں کی سرنجوں سے ایک دوسرے تک منتقل ہو جاتی ہیں۔" پھر وہ خود ہی تشویش بھرے لہجے میں کہنے لگا۔ "میری چھٹی حس بتا رہی ہے کہ ان لوگوں کا یہاں تک آنا بے معنی نہیں ہو سکتا' ضرور کہیں کوئی گڑبڑ ہے۔ شہزاد نے ضرور کوئی کارنامہ دکھایا ہے---"

تھوڑی دیر کے لئے دونوں کو چپ سی لگ گئی پھر استاد شفو خود ہی بڑبڑانے لگا۔

"پچھلے موج میلے میں شہزاد نے ایک سرنج سے سب کو بلیک ٹائیگر کے انجکشن لگائے تھے اور وہ بتا بھی رہا تھا کہ وہ کئی روز موتیاں جان کے ہاں موج میلہ کرتا رہا ہے---" پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ "میرا خیال ہے کہ موتیاں جان کو یہی سرنج ٹھوکی ہو گی جس سے وہ بیمار پڑ گئی ہو گی۔ اسی وجہ سے یہ لوگ شہزاد کو تلاش کرتے پھر رہے ہیں---"

"اس کا مطلب ہے کہ اس رات' شمسہ کو بھی انجکشن---؟"

"اس کو تو سب سے پہلے ٹھوکا تھا۔ میں نے ہی--- وہاں سب نے انجکشن لگوائے تھے۔"

شایان کا سارا لہو کھنچ کر اس کی مٹھیوں میں آ گیا' اس نے زور سے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں' غصے اور جذبات سے اس کا چہرہ لال بھبھوکا ہو گیا۔ دانتوں تلے زبان داب کے سر جھکا کر رہ گیا۔



اسی رات گیارہ بجے کے قریب یہ سب شیطان' ظہوری شاہ کے دفتر بیٹھے اس نئی افتاد پہ قیاس آرائیاں کر رہے تھے۔ عامل ظہوری شاہ کے علاوہ سب کے چہروں پہ بارہ بجے ہوئے تھے۔ یہ شاید پہلا موقع تھا کہ چار یاری ساری جمع تھی مگر شراب نہ کباب' نہ شباب' سگریٹ تھے وہ بھی سادے جن کو وہ بے پیرا دھواں کہا کرتے تھے۔ آج وہ اپنے "امریکن" پیر شہزاد کی کارستانی اور اچانک گمشدگی پہ بڑی سنجیدگی اور تشویش کا اظہار کر رہے تھے۔ بلیک ٹائیگر کے استعمال سے اس کی اور اپنی خستہ حالت' ایک ہی سرنج' پیر کے انگوٹھے' انجکشن لینے کے بعد مسلسل بدکاری کا رجحان پیدا ہونا' اس کی پراسرار گمشدگی' موتیاں جان کا بیمار پڑنا' اس کے آدمیوں کا اسے تلاش کرنا۔ یہ سب کچھ' یہ ساری باتیں جب ان کے دماغ میں آئیں تو ان کے اندر ہول اٹھنے لگے۔ ٹیلی ویژن اور اخباروں کے اشتہارات ان کی نظروں کے سامنے پھرنے لگے۔ ایڈز کی تباہ کاریاں' ہولناکیاں اور دہشت ناک موت کے مردہ ڈھانچے رقص کرنے لگے۔ سب کے سب خوف کے خول میں سہمے ہوئے چوہوں کی مانند دبکے پڑے تھے جبکہ عالم ظہوری شاہ اسے محض واہمہ قرار دے رہا تھا۔ کسی نے حکیم جمالی سے ایڈز کی نشانیاں پوچھیں سب ہی اپنے جسم پہ سرخ دانے' دھبے اور گلٹیاں دیکھنے لگے۔ استاد قربان نے تو باقاعدہ رونا شروع کر دیا۔ حکیم جمالی قدرے سکون سے تھا' اس کا کہنا تھا کہ اول تو ایسی کوئی بات نہیں اور اگر ہے بھی تو اس کا ابتدا میں ہی قلع قمع کیا جا سکتا ہے۔ ابتدائی مرحلے میں یہ بالکل بے ضرر ہے' اس کے تدارک کے لئے اس کے پاس کئی ایک نسخے موجود ہیں۔ استاد شفو نے رائے پیش کی۔

"شہزاد کو ہر حال میں تلاش کرنا ضروری ہے' وہی ہمارے خدشات اور پریشانی دور کر سکتا ہے--- ہو سکتا ہے کہ یہ ہمارا سب کا محض وہم ہی ہو۔"

اس رات کوئی بھی سکون سے نہ سو سکا۔ دوسرے روز شہزاد کی تلاش شروع ہوئی۔ جہاں جہاں اس کی موجودگی کا امکان تھا' ہر جگہ پتہ کروایا مگر اسے ملنا تھا' نہ ملا۔

شہزاد صبح کی پہلی فلائٹ سے کراچی پہنچ چکا تھا اور اس وقت اپنے ایک پاکستانی نژاد' امریکی دوست سکندر بخت کے ساتھ سہراب گوٹھ کے ایک زیر زمین دفتر میں بیٹھا بلیک ٹائیگر کا پاکستانی برانڈ تیار کرنے پہ غور و خوض کر رہا تھا۔ سوات کا رہنے والا اعلیٰ تعلیم یافتہ سکندر بخت پیشے کے اعتبار سے ایک کیمسٹ تھا' اعلیٰ تعلیم اس نے ورجینا کی یونیورسٹی سے حاصل کی تھی۔ امریکنوں کی طرح سرخ سفید' سبز آنکھیں' تانبہ رنگت بال' امریکن لہجہ۔ وہ کسی طور بھی پاکستانی باشندہ دکھائی نہ دیتا تھا۔ عیش و عشرت کا دلدادہ' بلا کا مردم اور موقع شناس' غیر معمولی ذہانت اور علم و عقل کا مالک ۔ نیویارک کے بدنام زمانہ علاقے بروک لین میں ایک جمیکن ٹانگوں سے معذور عورت کے ساتھ رہتا تھا۔ یہ عورت بھی کیمسٹری کی استاد تھی' سکندر بخت کی طرح یہ بھی ذہانت اور پیشے کی آڑ میں منفی سوچ کی حامل تھی۔ بلیک ٹائیگر ان دونوں کی مشترکہ کاوشوں' طویل صبر آزما تجربوں کا نتیجہ تھا۔ زیر زمین منشیات کے کاروباری حلقوں میں اسے خاطر خواہ پزیرائی ملی تھی۔ اب یہ نیا زود اثر نشہ آہستہ آہستہ وہاں اپنی گوناگوں خصوصیات کی بنا پہ مقبولیت حاصل کر رہا تھا۔ تجربے سے ظاہر ہوا کہ یہ نشہ جہاں انسان کو بے پناہ سکون فراہم کرتا ہے وہیں حیوانی خواہشات کی تکمیل کے لئے بڑا مسکت اور معادن ثابت ہوتا ہے۔ انسان کی جسمانی خامیوں' کمزوریوں کو بے پناہ استحکام اور رغبت بخشتا ہے۔ سکندر بخت نے انہی خوبیوں کے پیش نظر اسے تیسری دنیا کے بے سکون' بے وقوف اور بے لذت لوگوں کو فیض یاب کرنے کا فیصلہ کیا۔ پہلے خویش' بعد درویش والی بات پہ عمل کرتے ہوئے وہ پاکستان آ گیا۔ شہزاد سے اس کا تعلق بھی اسی منشیات کے دھندے کی وجہ سے تھا اور وہ یہاں اسی کے ساتھ ایک ایجنٹ کی حیثیت سے آیا تھا۔ لاہور سے تو وہ بھاگ کر امریکہ گیا تھا' موتیاں جان کی بے وفائی کا داغ سینے پہ تھا۔ اب وہ ایک منصوبے کے تحت لاہور آیا۔ اصل مقصد تو موتیاں جان سے بدلہ لینا تھا' عاشی سے بھی ایک پرانا حساب چکانا تھا۔ یہ بیچارے حکیم جمالی' ظہوری'



اینڈ پارٹی تو اصلی مچھلیوں کو پھانسنے کے لئے بطور چارہ تھے۔ جس طرح گیہوں کے ساتھ گھن بھی پستا ہے' یہ بھی رگڑے گئے۔ وہ شاطر' ان کو موت مات دے کر بساط سے لڑھک کر ان کی بساط سے باہر کراچی بیٹھا تھا۔ سکندر بخت اور شہزاد یہاں حاجی گل کے مہمان تھے جو روزانہ کروڑوں کی خام اور پختہ منشیات کا لین دین کرتا تھا۔

اگلے دن حاجی گل کے پاس ان دونوں کے علاوہ مشہور منشیات اسمگلر سردار تمن' مطیع الرحمان اور رہبر شاہ بیٹھے بلیک ٹائیگر کے فارمولے کا تجزیہ کر رہے تھے۔ سکندر بخت ان کو بریفنگ دے رہا تھا۔ فارمولے کا بنیادی عنصر باسٹھ فیصد خالص مائع کوکین تھی' اس کے علاوہ چند اور مسکن ادویات جو سیکرٹ تھیں۔ سارا فارمولا اوپن تھا اور یہ سیکرٹ ادویات' ان کے نام' دیگر معلومات اس کے دماغ اور ایک ڈائری میں تھیں۔ پچاس فیصد خالص منافع کے عوض وہ یہ معلومات فراہم کرنے پہ آمادہ تھا اس شرط کے ساتھ کہ ان کے نام اور مقدار' پروسیسنگ وہ ظاہر نہیں کرے گا۔ مال کی ایک کھیپ تیار کرنے کے بعد وصولی کر کے دوسری کھیپ تیار کرے گا۔ شہزاد اپنی خدمات اور معاونت کے عوض محض پانچ فیصد کا پارٹنر تھا۔ بات چیت ابھی کسی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچی تھی۔ سردار تمن پورا فارمولا حاصل کرنے کے بعد اس منصوبے پہ سرمایہ کاری کرنے کے حق میں تھے جبکہ حاجی گل اور دیگر لوگ' پچاس فیصد شراکت کو فی الحال مناسب سمجھتے تھے۔ ان جرائم پیشہ' کالے دھندے والوں کی وفاداریاں محض وقت کے تقاضوں اور وسیع تر مفاد حاصل کرنے کے لئے ہوتی ہیں۔ وعدے' اخلاق' تعلقات اور انسانی جانیں کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ مکاری' ابن الوقتی' ہوشیاری اور خطرات مول لینے کے فن میں جو طاق ہو گا وہی سکندر کہلائے گا۔ ایک اور راز جس سے صرف سکندر بخت اور شہزاد ہی واقف تھے' یہ تھا کہ بلیک ٹائیگر کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ وہ مرد یا عورت دونوں کے جنسی اور جذباتی نظام کو بری طرح انگیخت کرتا ہے بالکل ایسے ہی جیسے شدید گرمی میں انسان ٹھنڈی بوتلوں پہ بوتلیں چڑھاتا جاتا ہے' پیٹ پھٹنے پہ آ جاتا ہے مگر پیاس نہیں بجھتی۔ بلیک ٹائیگر کے انجکشن لینے والے کی بھی یہی حالت ہوتی ہے۔ اندرون جسم زخم بن جاتے ہیں۔ اگر فوری طور پر نشہ نہ چھوڑے یا علاج پہ توجہ نہ دی جائے تو زخموں میں پیپ پڑ جاتی ہے جو بگڑ کر خطرناک آتشک کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور آتشک وہ نامراد مرض ہے جو میل ملاپ سے آکاس بیل کی طرح پھیل کر زندگیاں تباہ کر دیتا ہے۔ انگارے پھانکنے سے وہ جلن سڑن نہیں ہوتی جو پیشاب کا ایک قطرہ رکنے سے ہوتی ہے۔ شہزاد بھی اس قبیح عارضے کا پرانا لاعلاج مریض تھا۔ سکندر بخت نے اسے اس خوفناک حقیقت سے بے خبر رکھا۔ شہزاد کو ہوش اس

وقت آیا جب پانی سر سے اُوپر ہو چکا تھا' کوشش کے باوجود پھر نہ تو وہ اس مرض سے خلاص حاصل کر سکا اور نہ ہی بلیک ٹائیگر سے جان چھڑا سکا۔ اس کو یقین تھا کہ وہ کتے کی موت مر گا۔ اسے اپنے انجامِ بَد کی خبر تھی لیکن وہ مرنے سے پہلے سکندر بخت' موتیاں جان اور م عاشی کو بھی ان کے انجام تک پہنچانا چاہتا تھا۔ بالکل وہی مجرمانہ ذہنیت --- اچھی طرح علم ہ ہے کہ انجام گولی ہے پھر بھی مجرم' پولیس سے مقابلہ کرتے ہیں۔ موتیاں جان اور مس عاشی ک وہ ڈس چکا تھا بلکہ ان کے ساتھ غیر ارادی طور پر مکافاتِ عمل کے تحت مس عاشی کے دوسر ساتھی بھی لپیٹ میں آ گئے تھے۔ اب صرف سکندر بخت اس کے سامنے تھا' وہ کسی مناسب ا نفع بخش موقع کی تلاش میں تھا اور یہ موقع اسے خود ہی فراہم ہو گیا--- کئی روز گزر گ منصوبے میں شامل افراد کسی قابلِ قبول فیصلے پہ پہنچ نہیں سکے تھے۔ ایک دن حاجی گل اور ش اکیلے بیٹھے اسی موضوع پہ غیر رسمی بات چیت کر رہے تھے۔ حاجی گل نے یونہی اسے کُریدا۔

"شہزاد بھائی! یہ سکندر بہت بڑی ڈیمانڈ کر رہا ہے۔ تم بھی تو اس کے ساتھ ایک لم عرصے سے کام کر رہے ہو۔ وہ تمہارا دوست ہے۔ کچھ اسے سمجھاؤ' ہاتھ ذرا نرم کرے۔ وہ بہت بڑی رقم مانگ رہا ہے۔ تم جانتے ہو یہ نیا نیا نشہ ہے' چلے نہ چلے--- شروع شروع میں اتنا بڑا رسک نہیں لیا جا سکتا---"

"حاجی صاحب! آپ اس فیلڈ میں پرانے اور تجربہ کار آدمی ہیں۔ یہ نشہ' تمام دوسر نشوں کا باپ ہے۔ اس کے اثرات اور فائدے تو آپ جانتے ہی ہیں--- بلیک ٹائیگر کو ذر مارکیٹ میں ہوا تو لگنے دیں۔ پھر دیکھیں' کتنی ڈیمانڈ ہوتی ہے---"

"یقیناً" تم بھی تو اس فارمولے کو جانتے ہو گے---" وہ اسے اعتماد میں لینے کی کوشش کرتے ہوئے چاپلوسی کرنے لگا۔ "اتنا بڑا سودا اور تمہارا صرف پانچ فیصد حصہ--- سچی بات ہے' اگر تم جیسا شخص میرے پاس ہو تو تمہیں ساٹھ فیصد کا حصہ دار بنا لوں---"

شہزادہ بھی بڑا کائیاں تھا' وہ اس کا اصل مقصد بھانپ گیا۔ اپنی عیاری پر قابو رکھتے ہو بڑی معصومیت سے کہنے لگا۔ "حاجی صاحب! سکندر بخت کی ڈیمانڈ واقعی کچھ اوپر ہے لیکن بات تو یہ ہے کہ میں تو ملنگ آدمی ہوں۔ نشہ پانی مل جائے' وہی بہت ہے۔ اس نے جو آفر میں نے بھی بنا سوچے سمجھے قبول کر لی تھی--- باقی رہا فارمولا تو اسے بنا میں بھی سکتا ہو بس ایک آدھ کیمیکل میں ذرا شک ہے کہ وہ کیا ہے اور مقدار کتنی ہے---؟"

"دیکھو' شہزاد بھائی! اگر تم کسی طرح یہ فارمولا مکمل کر دو تو ساٹھ فیصد تم منافع میں حصہ دار--- اگر ایڈوانس چاہو تو جتنا دل چاہیے' ابھی نقد لے لو۔ تم بھی خوش' ہم



اضی---"

شہزاد گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر آہستہ سے اس کے قریب سرک کر سرگوشی کرنے لگا۔ "یہ ناممکن نہیں۔ اگر کسی طرح مجھے سکندر بخت کی ڈائری دیکھنے کا موقع مل جائے--- وہ اپنا کام زیادہ تر کوڈ ورڈ میں کرتا ہے لیکن کسی حد تک اس کی گرل فرینڈ میگی یا پھر میں پڑھ سکتا ہوں---"

"یہ کون سا مشکل کام ہے؟ اگر آپ وعدہ کریں کہ فارمولے کا مسئلہ حل ہو جائے گا تو میں ڈائری کے ہر صفحے کی فوٹو اسٹیٹ آپ کو فراہم کر دیتا ہوں---"

وہ ہنستے ہوئے کہنے لگا۔ "حاجی صاحب! وہ اتنا بیوقوف نہیں۔ اصل ڈائری تو چوبیس گھنٹے اس کی کلائی پہ گھڑی کی صورت بندھی رہتی ہے۔ یہ محض گھڑی نہیں' ایک مکمل کمپیوٹر ڈائری ہے۔ وہ اپنی تمام خفیہ معلومات اور تحقیقات مخصوص کوڈ ورڈ میں فیڈ کر دیتا ہے۔ ناواقف آدمی اسے حاصل کرنے کے باوجود کچھ حاصل نہیں کر سکتا جب تک وہ اسے آپریٹ کرنے کا کوڈ ورڈ اور ڈیٹا سمجھنے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو--- میں اسے آپریٹ کرنے اور سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہوں' اگر وہ گھڑی مجھے مل جائے---"

"میں گھڑی کا انتظام بھی کر لوں گا--- بلکہ کل رات کسی وقت گھڑی تمہیں مل جائے گی۔"

اگلے دن' آدھی رات سے بہت پہلے حاجی گل نے وعدے کے مطابق وہ گھڑی شہزاد کے سامنے' میز پر رکھ دی۔ شہزاد گھڑی کو پھٹی پھٹی نظروں سے گھورنے لگا جیسے وہ گھڑی نہ ہو' اڑ کر ماتھے پہ ڈنک مارنے والا اژن سانپ ہو۔

"شہزاد بھائی! کیا دیکھ رہے ہو؟--- یہ وہی گھڑی ہے۔" وہ قلم اور کاغذوں کا پلندہ اس کے آگے دھرتے ہوئے بولا۔ "ایک گھنٹے کے اندر اندر اس گھڑی کو واپس کلائی پہ باندھنا ہے---"

شہزاد سمجھ گیا تھا کہ یہ گھڑی آسانی سے کلائی سے نہیں اتری۔ وہ حاجی صاحب سے کہنے لگا۔

"آپ آدھ گھنٹے کے لئے مجھے اکیلا چھوڑ دیں تاکہ میں سکون سے یہ کام کر سکوں۔"

حاجی صاحب اٹھ کر کمرے سے باہر نکل کر ساتھ والے کمرے میں ایک مخصوص صوفے پہ بیٹھ گئے۔ دیوار پر لگے ہوئے بڑے سے فریم کو سرکایا' شہزاد کے کمرے کا پورا منظر اس کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ شہزاد نے اپنا کام شروع کر دیا۔ مختلف فنکشن گھماتا رہا' ساتھ ساتھ کاغذ پر

لکھتا بھی جا رہا تھا۔ تیس چالیس منٹ تک وہ مصروف رہا۔ اچانک ایک بٹن دباتے ہی ا
دھماکا ہوا، گھڑی سے زرد رنگ کا دھواں فوارے کی صورت خارج ہوا۔ شہزاد کے چہرے ا
گھڑی کے درمیان چند انچ کا فاصلہ تھا، چشم زدن میں پورا چہرہ اُڑ گیا۔۔۔ اگلے روز منگھو
پہاڑیوں سے مسخ شدہ چہروں والی دو لاشوں کی برآمدگی کی خبر اخباروں میں چھپی، بر
کاغذات کے مطابق متوفی امریکہ سے آئے تھے۔ پولیس کا خیال تھا کہ کسی ٹیکسی والے
انہیں لوٹ کر قتل کرنے کے بعد یہاں پھینک دیا ہے۔ پاسپورٹ بھی پولیس کو مل گئے تھ
انہوں نے مزید کارروائی کے بعد لاشیں پوسٹ مارٹم کے لئے ہسپتال پہنچا دیں۔ ان کی خبر
تصویریں اخباروں میں چھپیں۔ ملنے والے پتہ پر شہزاد کی اطلاع لاہور پہنچی تو موتیاں جان
عامل ظہوری شاہ اینڈ کمپنی کے رنگ پیلے اور سانسوں میں جیسے پھندے سے پڑ گئے، ا
دوسرے کو یوں دیکھنے لگے جیسے آخری بار دیکھ رہے ہوں۔ شہزاد تو خس کم جہاں پاک کر گ
مگر انہیں ناپاک وہم اور ایک خوفناک عارضہ ناقابل فہم تقسیم کر دیا تھا۔ ہر کوئی خود کو ٹٹو
تھا، ایک دوسرے سے اس کی کیفیت پوچھ رہا تھا۔ کچھ وہم، کچھ اپنے بداعمال کا خوف، کچھ
سنائی باتوں کا ڈر۔۔۔ سب سہمے ہوئے چوہوں کی طرح ایک دوسرے کی دُمیں کتر رہے
اس قسم کی ہیجانی کیفیت میں انسان نفسیاتی مریض بن کر رہ جاتا ہے اور جس بات کا خدشہ
ہے وہی ہو کر رہتی ہے۔ اسی سہا سہمی میں چند روز اور آگے کھسک گئے۔

☆☆☆

استاد قربان کے مثانے میں مسور جیسے سنگ دانے رڑک رہے تھے، تکلیف بڑ
پیشاب تیزاب کی طرح لگنے لگا۔ بیت الخلاء، بیت القضاء بن گیا۔ ایک ایک کے بعد د
سب میں یہی آثار نمایاں ہونے لگے۔ سوزش پھیلنے لگی، سرخ دھبوں کے نشان بھی
ہونے لگے۔ بلیک ٹائیگر، کالی موت کی صورت آنکھوں کے سامنے پھر رہا تھا۔ شبانہ خر
موقوف ہو گئیں۔ شاید یہ پہلا موقع تھا شمسہ کئی دنوں سے فارغ تھی۔ کسی نے اس کی
آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا، دیکھ بھی لیتا تو کیا کر لیتا۔ وہ تو خود بھی نئی افتاد سے ہلکان ہو کر کچا پکا
ہوئی تھی۔ اس کے جسم میں جیسے تنور دہک رہا تھا۔ پکی پت جیسے پیپ دانے۔ کھجلی، خار
بے دَم کر دیا تھا۔ ہوش، یادداشت بحال ہونے پہ یہ پہلا عذاب تھا جو وہ جان پہ جھیل
تھی۔ کھوئی ہوئی یادداشت کا ڈرامہ جاری تھا البتہ اس نے اب یہ اہتمام کر لیا تھا کہ د
کسی بہانے اپنی دوا کو ضائع کر دیتی مگر بے سُدھ ہونے والی نشے کی کیفیت کا ڈرامہ
رچاتی۔ حالت زیادہ بگڑی تو الف ننگی ہو کر نگران کھسرے کے رُوبرو پاؤں پٹخنے لگی۔



دیکھا تو وہ گھبرایا، ظہوری شاہ کو فوری اطلاع دی تو وہ حکیم جمالی کے ساتھ بھاگا بھاگا آیا۔ شمسہ
فرش پہ پڑی ایڑیاں رگڑ رہی تھی جیسے ہزاروں بھڑوں نے کاٹ لیا ہو۔ حکیم جمالی نے آنکھوں،
ناخنوں کا تفصیلی معائنہ کیا لیکن کیا بتائے کہ اسے کیا ہوا ہے؟۔۔۔ وہی جو سب کے ساتھ ہو رہا
تھا جن میں وہ خود بھی شامل تھا۔۔۔ حسب عادت زبردستی مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔
"سب ٹھیک ہو جائے گا، گھبرانے کی ضرورت نہیں۔۔۔"
فی الفور منشیات اور حرام کاری، حرام قرار دی گئی۔ لوگوں سے ملنا جلنا، تمام مصروفیات
ترک کر کے سوڈیوال ڈیرے پہ علاج معالجے کے لئے اکٹھے ہو گئے۔ مکمل رازداری برتی گئی،
کسی کو کانوں کان خبر تک نہ ہوئی۔ حکم دے دیا کہ جب تک افاقہ نہ ہو، کوئی ڈیرے کی حدود
سے باہر نہ نکلے۔ مزید ٹسٹ لئے تو انکشاف ہوا کہ بشمول اس کے سب کو امریکن آتشک لگ
گیا ہے۔ آپ اسے ایڈز مرض کی پہلی اسٹیج بھی کہہ سکتے ہیں۔ سب کو سانپ سُونگھ گیا جیسے
شہزاد کی بدروح نے سرنج کے ذریعے ان کے جسموں سے روح کھینچ لی ہو۔
"اب کیا ہو گا۔۔۔؟" بڑی مشکل سے استاد قربان کے منہ سے نکلا۔
رفیق ڈوگر نے شہزاد کی ماں کا رشتہ کتوں کی نسل سے ملاتے ہوئے کہا۔ "یہ امریکہ سے
ہمیں برباد کرنے کے لئے آیا تھا کیا۔۔۔؟"
حکیم جمالی نے اسے ازلی لاپروائی سے ڈانٹا۔۔۔ "گھبرانے اور گالیاں بکنے کی ضرورت
نہیں۔ آج سے شہزاد کا نام اپنے ہونٹوں پر مت لانا ورنہ کسی اور مصیبت میں پھنس جاؤ گے۔
وہ دونوں اسی وجہ سے مارے گئے ہیں کہ وہ خطرناک نشہ اور خوفناک بیماری لے کر یہاں آئے
تھے اور ان کا پہلا شکار موتیاں جان تھی۔۔۔"
رفیق ڈوگر بولا۔ "ٹکر تو اس کی موتیاں جان سے تھی، ہم سے اس کی کیا دشمنی
تھی۔۔۔؟"
"میری جان! ایسے کاموں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔۔۔ شاید وہ اپنے انجام سے باخبر تھا اور اپنی
لاعلاج بیماری کا بھی اسے علم تھا۔ وہ اپنے انجام تک پہنچنے سے پہلے یہ تحفہ اپنے جیسے دوستوں
میں بھی بانٹنا چاہتا تھا جیسے ہاتھی گرتے گرتے پانچ دس سوروں کو بھی لے کر مرتا ہے، ایسا سلوک
وہ ہمارے ساتھ بھی کر گزرا۔۔۔ ڈوگر صاحب! آخر ہم اچھا برا سب مل بانٹ کر ہی کھاتے پیتے
ہیں اور کچی پکی کھانے سے کبھی کبھی بدہضمی بھی ہو جاتی ہے۔۔۔" پھر سب سے سنجیدہ ہو کر
کہنے لگا۔ "اپنی منحوس شکلیں گم کر کے یہاں ڈیرے میں بند ہو جاؤ۔ علاج کراؤ، پرہیز اور
آرام کرو۔ تین چار ہفتوں میں ٹھیک ہو جاؤ گے۔ یہاں بند رہنا اس لئے بھی ضروری ہے کہ

شہزاد اور اس کے ساتھی مارے گئے ہیں۔ مجھے پکا یقین ہے کہ یہ کارروائی موتیاں جان
غنڈوں نے ڈالی ہے۔ وہ شہزاد کی تلاش میں یہاں بھی پھیرا ڈال گئے تھے' شہزاد کے یہاں
اور ہمارے اس سے تعلقات کا شک انہیں ہو گیا ہوا ہے اور ہو سکتا ہے کہ وہ پھر ہمیں
کریں یا پولیس کو ہماری نشاندہی کر دیں۔ پولیس ابھی ان کی موت کی تفتیش کر رہی
ممکن ہے کہ پوسٹ مارٹم یا کسی اور ذرائع سے ان کی بیماری بھی سامنے آ جائے۔ پھر
یقیناً" ان لوگوں کو بھی تلاش کرے گی جن سے وہ ملا ہو یا انہیں جانتا ہو اس لئے زبان بند
پانچ وقت نماز پڑھو' اللہ سے اپنے گناہوں کی توبہ کرو اور باقاعدگی سے علاج کراؤ---"

عالم ظہوری شاہ بولا۔ "یار' جمالی! بہت برا ہوا' ہم تو مارے گئے--- کام دھندا چھ
یہاں کیسے بند رہ سکتے ہیں---؟"

"شاہ جی! کام دھندا چھوڑ کر انسان قبر میں بھی تو رہ سکتا ہے' جیل میں بھی تو سڑ سکتا
ہم اگر یہاں نہ رہیں گے تو یقین کریں' پھر قبر ہی ہماری منزل ہو گی یا کم از کم جیل تو کہیں
نہیں--- کسی کو ہوا نہ لگنے دیں کہ ہمیں کیا بیماری یا تکلیف ہے۔ کسی نہ کسی طرح مہ
مہینہ پرہیز اور علاج کر لو--- وقت گزاری کے لئے کوئی نہ کوئی مشغلہ اختیار کر لو۔ مہ
ہے کہ پہلے داڑھیاں بڑھاؤ' بابے میاں ہنگا شانی کے مزار پہ نعت قرأت کے مقابلے شر
دو۔ رمضان شریف بھی آ رہا ہے۔ خوب روزے' نمازیں' تراویحاں پڑھو۔ افطار پارٹ
اپنی صحت اور عاقبت کے لئے دعائیں کراؤ' اللہ بہتر کرے گا---"

"شمسہ کا کیا کریں' اس کا تو ہم سے بھی برا حشر ہے--- مس عاشی کہہ رہی تھیں
لیڈی ڈاکٹر کو دکھائیں---" ظہوری شاہ نے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔

"نہیں' بالکل ایسا نہ کرنا--- فی الحال اسے وہیں فلیٹ میں رہنے دو۔ میں نے اس
بندوبست کر دیا ہے' اس کا علاج وہیں ہو گا--- ہاں' کوئی بھی اس کے قریب
جائے---"

سیانے کہتے ہیں کہ عورت کے لئے بچہ جننے سے زیادہ اور کوئی تکلیف یا مصیب
ہوتی اور مرد ہر مصیبت' دکھ' درد ہنستے مسکراتے برداشت کر سکتا ہے۔ حتیٰ کہ عالم
ہاتھ پاؤں تک کٹوا دیتا ہے مگر پیشاب اور اسی نوع کے جملہ عوارض ایسے عذاب
تکلیف دہ ہوتے ہیں کہ بڑے بڑے شہہ زوروں اور حوصلے والوں کو بچوں کی مان
ہوئے دیکھا ہے۔ انہی امراض خبیثہ میں سرفہرست سوزاک اور آتشک ہے۔ سوزا
شاید دو چار پل چین مل جاتا ہو مگر آتشک کا آزار' ایک عذاب ہے۔ آتشک لفظ



ف آتش ہیں۔ آگ' گندھک سا تیزاب اور متعفن پیپ' مریض کا مقدر بن جاتی ہے۔
رہ دیواروں سے ٹکریں مارتا ہے مگر اسے چین نہیں پڑتا' نرخرہ کٹے بکرے کی طرح ڈکراتا اور
بلاتا ہے مگر اسے موت نہیں آتی۔ علاج بھی بڑے دردناک اور ناقابل برداشت ہوتے ہیں۔
پچھی میں تو بالشت بھر لمبی لمبی موٹی موٹی سرنجیں جب پیٹھ پہ ٹھونکی جاتی ہیں تو مریض کی چیں
ل جاتی ہے۔ حکیم' سنیاسی' عطائیوں ویدوں کے اپنے علیحدہ علاج اور طریقہ کار ہوتے ہیں مگر
دے وہ بھی عذاب ناک ہیں۔ مریض پکے اشٹام پہ لکھ دیتا ہے کہ ساری زندگی وہ ناف کے
نیچے نظر نہیں ڈالے گا۔ حکیم جمال کے پاس ان جملہ عارضوں کے بے شمار تیر بہدف نسخے اور
لاج موجود تھے' وہ کھاتا پیتا ہی انہی نسخوں ٹونوں کے دم سے تھا۔ سنیاسی باوا آنجہانی نے بتایا تھا
ہ بچہ پھانسی کی پھانس اتنی دکھن نہیں دیتی جتنی آتشک کی دھانس دکھ دیتی ہے۔ آتشک کا
ریض اور پاگل ہاتھی ایک برابر ہیں' دونوں توپ دم کے قابل ہوتے ہیں۔ ہاتھی کے پاگل
ونے کا کارن جوانی کی مستی' غضب کی انتہا ہوتی ہے جبکہ آتشک غلیظ بیمار عورت۔ یا پھر کسی
م حکیم کے ہاتھوں غلط سلط' کچے پکے بھسم استعمال کرنے سے جڑیں پکڑ لیتا ہے۔ مرے ہاتھی
ے سوا لاکھ نکل آتے ہیں مگر آتشک کا مریض اپنے اور دوسروں کے ساتھ ساتھ اپنی آئندہ
سل کو تباہ و برباد کر کے دو کوڑی کا کر دیتا ہے لیکن سنیاسی باوا شاید امریکی بلیک ٹائیگر' سنگاپور کی
زور اثر اسپرے' ویاگرا سری لنکن لنگوروں کی غدودوں کے قیمتی تھلے' ریچھ کی ہڈی اور ببر شیر
کی چربی' جرمن سلور کیپسولز کے اثرات اور ہلاکت آفرینیوں سے واقف نہ تھا اور نہ ہی وہ
جنگلوں' پہاڑوں' ویرانوں سے نکل کر شہروں کی منڈیوں' فیشن ایبل پوش علاقوں کے
یٹ قحبہ خانوں' کلبوں' ہوٹلوں' نام نہاد کمیونٹی سینٹروں' گیسٹ ہاؤسوں اور ہوسٹلوں سے
گزرا تھا جہاں ہزاروں الماسائیں' نیلمیں' پکھراجیں' زمردیں یہ سوغات فراوانی سے تقسیم
ہیں ورنہ وہ مرض آتشک کے ماخذ اتنا محدود نہ بتاتا۔
حکیم جمالی کو ایک رات ابرق سیاہ کے بھسم کی پھرنڈ کستے ہوئے باوا نے بتایا تھا کہ بچہ!
ب کو الٹا پڑھو تو کشتا بنتا ہے اور کشتا اندر دباؤ تو آتشک باہر نکل پڑتا ہے۔ سنیاسی باوا کی
نظر سے اسے کئی مجرب' آزمودہ نسخے' ٹوٹکے ازبر تھے جبکہ وہ خود بھی اسی وقت اسی
مرض سے گلابی ہو رہا تھا اور یہ چند مریض ہرچند اس کے لئے لائق تشویش نہ تھے۔
یقین تھا کہ اگر یہ سب جم کر علاج پرہیز اور صبر کر لیں تو اس مصیبت سے نجات حاصل کر
گے

گوڈیوال ڈیرے پہ سب ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔ ڈیرے دار حکیم جمالی نے عقب

میدان باوا میاں ہنگا ثانی کے مزار پہ دو تین ڈھول پیٹنے والوں کا مستقل انتظام کر دیا تھا، کچھ وھاریئے ملنگوں کو اکٹھا کر کے بھنگ رنگ کا انتظام بھی کر دیا۔ ڈھول اور دھمال والے باری چوکیاں بھرتے۔ مقصد اس دھما چوکڑی کا ان مریضوں کی آہ و بکا پہ پردہ ڈالتے ہوئے کرنا تھا۔ ڈیرے کے اندر چادریں دریاں بچھا کر، ان کے گلوں میں ہار ڈال کر مراقبے کی میں بٹھا دیا، درمیان میں دو من کابلی چنوں کا ڈھیر ڈال دیا۔ ادھر ادھر لوگوں میں مشہور کر باوا ہنگا ثانی کا سوا کروڑی جلالی وظیفہ ہے۔ شامل ہونے والوں کے لئے ضروری ہے کہ ا آخر، مسلسل یہاں بیٹھ کر پڑھیں۔ پنج گانہ نماز کے علاوہ روزے کی بھی پابندی ہے او تقریباً" چالیس روز۔ دس دن پہلے اور تیس دن رمضان کے، ستائیسویں کی رات ختم پڑھ کر باوا کے مزار پر چادر چڑھائی جائے گی۔ وہاں کن ٹٹوں میں ایسا کون سا پرہیزگا ساتھ بیٹھ جاتا۔ جس نے شرائط سنیں، دم دبا کر بھاگا۔ مقصد بھی یہی تھا کہ کوئی اور نہ ٹ یہ پاکھنڈیئے، وظیفے کی آڑ میں اپنا منحوس علاج شروع کر سکیں۔ حاجی رجی بیگم نے اپنے چ قسم کے چیلے ان کی دیکھ بھال اور خدمت پر مامور کر دیئے تھے اور دروازے بند۔

حکیم جمالی نے گائے کے مکھن میں دو تنکے کشتہ رکھ کر پہلی خوراک خود کھائی، پھر کو بھی چٹائی۔ بعد میں عرق بادیان اور گلاب کے عرق کے ساتھ کوئی اور دوا بھی استعمال سرخ مٹی کے پختہ گلاس جن کے پیندوں میں ایک تہائی حسن ابدال کے چشموں اور کیلا ملی نیم گرم سفید ریگ تھی، کچے انگوروں پہ انگوچھوں کی مانند چڑھا کر انہیں ڈال دیا۔ پھر اوپر چادر ڈال کر اکڑوں بیٹھایا، پیٹھ تلے موٹی تلائیاں اور گدے ٹکا دیئے اندازا" کلو بھر چنے آیتہ الکریمہ پڑھنے کے لئے رکھ دیئے۔ خاموشی سے ورد کرنے کا کر، خود بھی شامل ورد ہو گیا۔

بدمعاش اور جرائم پیشہ لوگ بڑے بزدل اور ڈرپوک ہوتے ہیں۔ ان کی دھمکیوں، وارداتوں اور کاروائیوں کا اگر گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت کی طرح واضح ہو جائے گی کہ یہ سارے جعلی عکس ہوتے ہیں۔ قاتل، ڈکیت، اشت اشتہاریوں کو چھوڑ کر نچلی سطح کے جتنے بھی جرائم پیشہ ہوتے ہیں، بیچارے قابل ر بکریاں ہوتے ہیں کہ ذرا کہیں کھٹکا ہوا، جھٹ مینگنیاں کرنا شروع کر دیں گے۔ ہلکا کے پیٹ پتلے کر دیتا ہے، یہ ہمیشہ ایک دوسرے کے کندھوں پر سوار ہو کر اور گیدڑ غولوں میں رہ کر شیر ہوتے ہیں، اکیلے دوکیلے کارروائی ڈالنا ان کے بس کی بات نہیں روباہوں کا غول بھی اسی "قبیلہ بزدلاں" سے تعلق رکھتا تھا۔



ماہ رمضان کی آمد آمد تھی۔ اس مقدس مہینے میں یوں بھی قدرتی طور پر شیطانی کاموں اور کاروائیوں میں کمی آ جاتی ہے۔ بڑے سے بڑے لوگ بھی وقتی طور پر ہی سہی، دیکھا دیکھی ... اور پارسا بن جاتے ہیں۔ عشرت گاہیں، رنگ و رامش اور جام و مینا کی محفلیں سنسان ہو جاتی ہیں۔ گھنگھرو خاموش اور طبلے سارنگیوں پہ غلاف چڑھ جاتے ہیں۔ چلو، اچھے برے سہی اس مہینے اکثر لوگ مسلمان نما تو بن جاتے ہیں۔۔۔ استاد شفو کی اکیڈمی اس غیر موجودگی سے پہلے ہی پھیکی پھیکی سی تھی، رمضان شریف کی آمد سے بالکل ہی اجڑ گئی۔ ساز سازینے، سفید کفنوں میں لپیٹ کر طاقوں کی قبروں میں لٹا دیئے گئے۔ موسیقی اور رقص کے طالب علم عید کی چھٹی پہ چلے گئے اور مستقل یہاں روٹیاں توڑنے والے سفید ٹوپیاں اوڑھ کر انڈوں پہ بیٹھ گئے۔ بھائی جی، شمشاد پاندان اٹھائے اپنے میکے یعنی حاجی رجی بیگم کے ڈیرے آ براجمان ہوئے۔ آخری عشرے اعتکاف بیٹھنے کا ارادہ تھا۔ ادھر حکیم جمالی کے ڈیرے پر سارے لعنتی بیمار سوزاکیئے زانوں میں دوا آلود ریت سے بھرے ہوئے گلاس دبائے، چنوں کے پہاڑ سے دانہ دانہ بھاڑ پھوڑتے ہوئے ہائے ہائے کر رہے تھے۔ علاج اور اذیت، دونوں عروج پہ تھے۔ ڈیرے کے پچھلے دروازے کے باہر، نیم کی سبز ٹہنیوں کا انبار پڑا ہوا تھا۔ حکیم جمالی نے ماہ صیام کی رعایت سے سب مریضوں کے لئے فٹ فٹ بھر لمبی مسواکوں کا اہتمام کیا ہوا تھا۔ کچھ نباتات قسم کے ملنگ نیم کی نبولیاں اور بکل بھنگ کے کونڈوں میں گھوٹ رہے تھے جو سحری میں ان روزہ داروں کو بطور سحری کھلائی جاتی تھی۔ نیم نبولی کی گری گوند اور بورانے کا لعوق تیار تھا جو افطاری کے وقت چٹایا جاتا تھا۔ اندر پڑھائی کے کمرے میں اگربتیوں کی بجائے نیم کی جڑیں سلگ رہی تھیں، گردنوں میں نیم کے سبز پتوں کے ہار بہار دکھا رہے تھے۔ بڑے لوٹے استنجے کے لئے نیم چھال کا ابلا ہوا پانی کنستروں میں بھرا پڑا تھا۔ کڑواہٹ سے بھرے ہوئے حلق، ادھ جلے شودر مردے کی طرح سفید خاک رنگے ہونٹ، وحشت اور دہشت سے ... ہوئی الوؤں کی مانند مَردم، مرض اور ماحول بیزار آنکھیں اور لرزیدہ خمیدہ بدن کمرے کے پراسرار ماحول میں یوں دکھائی دیتے جیسے ماہ رمضان کی برکت کی وجہ سے اس علاقے کے شیطانوں بدکاروں کو بیڑیاں ڈال کر یہاں قید کر دیا گیا ہو۔ حاجی رجی بیگم اور شاگرد پیشہ زنانوں نے اندر باہر، سارا انتظام سنبھالا ہوا تھا۔ نیم پرہیزی کھانے ان ہی کی نیم نگرانی میں تیار ہوتے۔ مزار پہ چوکی بھرنے والے ڈھولیئے سحری سے جگانے پہ مقرر کر دیئے تھے۔

★★★

ادھر شمسہ بھی زیر علاج تھی۔ نواب بی بی کھسرا اپنے ایک معتمد ہیجڑے کے ساتھ حکیم

جمالی کی ہدایات کے مطابق باقاعدگی سے اسکی دوا اور پرہیز علاج پہ دھیان رکھے ہوئے تھا۔ صبح
وشام دو دو گھنٹوں کے لئے اسے سرکنڈوں کے موہڑے پہ اکڑوں بٹھایا جاتا تھا جس کی نشست
معذور بوڑھوں کی کموڈ کرسی کی طرح درمیان سے کھلی ہوئی تھی۔ مٹی کی سوراخوں والی کھلے
منہ کی ہنڈیا جس میں چندن چیڑ، چلغوزوں کے چھلکوں کی ادھ بجھی گرم گرم بھوبھل کموڈ کے
نیچے دھری رہتی۔ وقفے وقفے سے نواب بی بی کسی دوا کا چٹکی بھر برادہ اس پہ ڈال دیتی۔ مددگا
ہیجڑا شمسہ کے بازو دبا کر اس کے پیچھے کھڑا رہتا۔ ہنڈیا سے پیلا پیلا بدبودار دھواں اٹھتا تو تکلیف
سے اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے، جسم اینٹھنے لگتا۔ ناقابل برداشت تو استنجا تھا۔ جو صبح دو
اور رات سوتے وقت کرنا پڑتا۔ برگِ بیری، برگِ حنا، عنکبوت کا جالا، بجھے چونے کا پانی، بر
تمباکو کے پتے ابال چھان پھر ٹھنڈا کر کے نیم گرم ہر فراغت کے بعد بطور استنجا استعمال کرنا پڑ
اس تکلیف دہ علاج اور اٹھک بیٹھک نے جہاں اسے نحیف ونزار کر دیا تھا وہیں ذہنی طور
چاک وچوبند بھی ہو گئی۔ اس کی یادداشت کے گرد رہے سہے، کٹے پھٹے جالے اور دھند
غبار بھی جیسے چھٹ گئے تھے۔ اپنی تکلیف اور ان کی وجوہ کا ادراک بھی ہو گیا لیکن اس
باوجود وہ اپنی پہلی سی ذہنی کیفیت کو اپنائے ہوئے تھی۔ وہ کسی حتمی نتیجے پہ نہیں پہنچ پائی تھ
رہ رہ کر اپنی بیمار ماں اور بہنوں کی طرف دھیان جاتا کہ خدا جانے وہ کس حال میں ہوں،
زندہ بھی ہے یا اس کی جدائی اور اپنوں کی بے وفائی نے اسے موت کی نیند سلا دیا ہے۔ با
دھیان آتے ہی اس کا خون کھولنے لگتا۔ اسے اس حالت میں پہنچانے کا واحد ذمہ دار وہی
لے دے کے سوتیلا بھائی زلفی ہی تھا جس کے لئے اس کے دل میں نرم گوشہ تھا۔ جو باپ
مخالفت کے باوجود اس کا خیال رکھتا تھا یا پھر اسے اپنے قریب شانی دکھائی دیتا تھا۔ نظر تو وہ
آتا تھا مگر اس میں جرات، وقار اور رکھ رکھاؤ تو مَردوں جیسا تھا۔ ابھی تک وہ اس کی شخص
اور اس کے پس منظر کو صحیح طور پر نہ جان سکی تھی اور نہ ہی وہ اس دن کے بعد دکھائی دیا تھا

★★★

شانی دکھائی کیا دیتا، وہ تو اس دن پتنگ کے چکر اور شمسہ کی گردن پہ ڈور کاٹ لگنے
جیسے خود بھی کٹ کر رہ گیا تھا۔ اس دن پتنگ کٹ گئی، ڈور ٹوٹ گئی تھی مگر زلفی اس کے
میں بڑے تیز مانجھے والی ڈور تھما گیا تھا جس کے دوسرے سرے پہ کٹی پھٹی مگر بڑی قیمتی
شمسہ کی صورت ناموافق ہوا، تیز دھار ڈوریوں والے گڈوں کے جھرمٹ میں ڈگمگا رہی
وہ کس طرح اسے بچائے، نیچے اتارے؟--- زلفی نے اسے بھائی کہا تھا، وہ کس طر
بتائے کہ جسے تو پاگلوں اور دیوانے کی طرح کھوجتا پھر رہا ہے وہ بہن تیرے اس منہ بو



کے فلیٹ سے چند فٹ دور ایک پنجرے میں بلبل کی مانند قید ہے۔ زلفی، شمسہ! بھائی، بہن کی
بازگشت اس کے کانوں میں گونجتی رہتی۔ عامل ظہوری شاہ اور اس کے چیلے چانٹوں پہ شہزاد کے
حوالے سے جو گزر رہی تھی، اس سے بھی وہ بے خبر تھا۔ شہزاد کی موت کے بارے میں وہ جان
چکا تھا مگر اس کی وجہ سے کتنی جانوں پہ بنی ہوئی ہے، وہ نہیں جانتا تھا۔ شمسہ پہ کتنا کٹھن وقت
آیا ہوا ہے، سے بھی بے خبر تھا۔ اس کا زلفی سے اس دن کے بعد رابطہ ہی نہیں ہوا تھا، اس کو
اس نے خود ہی ادھر آنے سے منع کیا ہوا تھا۔ یعنی اسے ٹیلی فون بھی نہ کر سکا اور والدین---
وہ انہیں جیسے بھول ہی چکا تھا۔ منشی کرم الٰہی جمعہ کے جمعہ گھر پھیرا ڈال آتا اور خیر خبر، گھی شکر
لے آتا۔ اس کی اپنی تکلیف تقریباً" ختم ہو چکی تھی۔ نہ رہے بانس، نہ بجے بانسری۔

★★★

ریشمی سنہری زلفیں شانوں پہ جھول رہی تھیں۔ روئیدگی سے پاک چہرہ کنول کی مانند کھلا
ہوا، موی انگلیوں کے سروں پہ سرخ دراز ناخنوں کی روشن لوئیں، تازہ چھدے ہوئے کانوں
میں فیروزے جڑے ٹاپس، ناک سے نتھنے میں نیلم کی ننھی سی جھلمل جھلمل کرتی ہوئی
لرزاں لونگ۔ دن بہ دن جیسے اس پر نکھار آرہا تھا۔ نزاکت، نرماہٹ، ملاحت جیسے انگ انگ
سے پھوٹ رہی ہو۔ چال ڈھال میں بھی اک نزاکت دَر آئی تھی۔ اس کے ملازموں اور
اردگرد جاننے والوں نے جیسے اسے اس نئے انداز و روپ میں قبول کر لیا تھا۔ پڑھائی کے لئے
پہلے وہ سمن آباد کے ایک سنٹر میں جاتا تھا، لباس رنگ و روپ بدلے تو وہاں جانا ترک کر دیا اور
اسی سنٹر کے ایک ٹیوٹر عرفان صاحب سے اپنے فلیٹ میں ہی پڑھنے کا انتظام کر لیا۔

★★★

استاد شفو اور ظہوری شاہ اپنے اپنے ٹھکانوں سے غیر حاضر تھے۔ مس عاشی انہیں کھوجتی
ہوئی شاہ کے پاس پہنچی، یہیں سے معلوم ہوا کہ یہ سب لوگ سوڈیوال ڈیرے پہ ہیں۔ دونوں
وہاں پہنچے۔ باوا کے مزار کا رنگ ہی بدلا ہوا تھا۔ ڈھولئے ڈھول پیٹ رہے تھے، ملنگ اور بھنگ
باز اپنے اپنے رنگوں میں رنگے ہوئے تھے۔ آگے پیچھے دروازے بند تھے۔ اپنی آمد کی اطلاع
کروائی تو دروازہ کھلا۔ اندر داخل ہوئے--- سبحان اللہ! بگلے بھگت، سفید ٹوپیاں پہنے چنے
رولنے میں مصروف تھے۔ نہ علیک نہ سلیک، نہ کسی نے نظر ملائی، نہ بیٹھنے کو کہا۔ یہ دونوں
حیران پریشان، ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ عجیب سے حلیئے۔ چہروں پہ نحوست اور اذیت بھری
مروڑی، زیرِ لب کچھ گنگنا رہے تھے۔ اردگرد چند زنانے سروں پہ اوڑھنیاں باندھے خاموشی
سے باادب بیٹھے تھے۔ مس عاشی بھی سر پہ دوپٹہ استوار کر کے ایک کونے میں بیٹھ گئی، نیم کی

جڑوں کا کڑوا دھواں، مدھم سی روشنی۔ جن نکالنے والوں ایسا ماحول ---
مس عاشی کو دھویں سے حلق میں پھندا پڑ گیا تھا۔ شانی کی آنکھوں میں مرچیں سی بھر گئیں۔ ان دونوں کے لئے جب یہاں مزید بیٹھنا مشکل پڑا تو ایک دوجے کی جانب دیکھتے ہوئے باہر کھسک آئے، تازہ ہوا میں سانس درست کیا۔ ان کے پیچھے پیچھے عامل ظہوری شاہ بھی نکل آیا۔ علیک سلیک کے بعد شانی نے عرض کی۔

"شاہ صاحب! ہمہ یاراں دوزخ، ہمہ یاراں بہشت۔ اس نیک کام میں ہمیں بھی شامل کر لیتے --- آخر یہ کیا سلسلہ ہے، کچھ ہمیں بھی بتائیں؟"

کچھ جواب دینے کے بجائے وہ عاشی اور شانی کو لے کر باوا کے مزار کی طرف آ گیا۔ اذان کا وقت قریب تھا، ڈھول تاشے خاموش تھے۔

"شانی جی! اتفاق ہی سمجھ لیں کہ آپ اور مس عاشی سے بات کرنے کا موقع نہ مل سکا --- آپ کو معلوم ہو گا کہ شہزاد کراچی میں مارا گیا ہے۔"

"ہاں، میں اخبار میں پڑھ چکا ہوں --- کیا یہ ختم شریف اس کی مغفرت کے لئے ہے؟"

"لعنت بھیجو یار! اس خبیث پہ --- یہ ختم شریف دراصل ہم اپنے لئے پڑھ رہے ہیں! وہ حرام زادہ ہمیں ایک خوفناک مرض میں مبتلا کر گیا ہے ---" اچانک وہ مس عاشی کی جانب متوجہ ہوا۔ "عاشی! تم تو ٹھیک ہو، نا! کوئی گڑ بڑ --- میرا مطلب ہے، کوئی تکلیف، پریشانی --- اس نے کوئی انجکشن تو نہیں لگوایا تھا --- ؟"

"اللہ کا کرم ہے، شاہ صاحب! میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں --- آپ جانتے ہیں، میں نشہ وشہ نہیں کرتی۔ انجکشن کے متعلق اس نے بتایا ضرور تھا --- بس!"

"میڈم! اس خبیث کے پاس بیٹھنے والا بھی بیمار ہو سکتا ہے --- بہرحال، میں نے برسبیل تذکرہ یونہی پوچھ لیا تھا۔" ظہوری شاہ اب شانی سے مخاطب ہوا۔

"یار! خدا جانے اس نے ہم سے کون سا بدلہ لینا تھا، وہ اپنا مرض ہمیں بھی تحفے میں دے گیا ہے --- یہ جو آپ اندر دیکھ رہے ہیں، دراصل ہمارے علاج کا ایک حصہ ہے ---" اشارے سے اپنا بایاں ہاتھ دکھانے لگا جس سے اس نے اپنی ٹانگوں کے درمیان مٹی کا ... تھاما ہوا تھا۔

"یہ کیا چیز ہے --- ؟" شانی حیرانی سے پوچھنے لگا۔

"یہ بھی ہمارے علاج کے ایک حصہ ہے --- حکیم جمالی صاحب کے مطابق ہمیں چالیس روز برداشت کرنی ہے۔ رمضان شریف بھی ہے --- میرا خیال ہے، آپ



بات سمجھ گئے ہوں گے؟"

"ہوں --- میرا خیال ہے، میں سب کچھ سمجھ گیا ہوں مگر صرف ایک بات اور سمجھا دیں۔ کیا یہ مرض خطرناک نوعیت کا ہے --- ؟"

"ہاں، آپ ایسا کہہ سکتے ہیں مگر حکیم صاحب کے کہنے کے مطابق یہ کوئی ایسا خطرناک بھی نہیں کہ اس پہ قابو اور کنٹرول نہ کیا جا سکے۔ بس، ذرا پرہیز اور دل جما کر صبر سے علاج کی ضرورت ہے اور ملنے جلنے کی پابندی کرنی پڑے گی۔ اسی لئے ہی ہم لوگ رازداری سے یہاں جمع ہیں --- ہاں، آپ ذرا اپنے ہمسائیوں کا خیال رکھئے گا، وہاں بھی ایک مریضہ ہے۔ میرا مطلب شمسہ سے ہے، میں نے اس کے علاج کا بندوبست وہیں کر دیا ہے ---"

"یہ میرا فرض ہے، آپ مطمئن رہیں ---" شانی نے جواب دیا۔

☆☆☆

شانی کے اندر کھُد بُد تو اسی وقت سے شروع ہو گئی تھی جب اس نے ان کی بیماری کا سنا تھا، اس کی چھٹی حس گھنٹیاں بجا رہی تھی کہ شمسہ بھی ان کے ساتھ دلدل میں پھنس چکی ہے۔ ظہوری شاہ کی تصدیق اور تشویش نے اسے بوکھلا کر رکھ دیا تھا، اسی بوکھلاہٹ اور گھبراہٹ میں بھاگم بھاگ واپس آیا۔ رات کے دس بج چکے تھے۔ منشی کرم الٰہی بیٹھا حساب کتاب میں مصروف تھا۔ جیرے ملازم نے کھانے کا پوچھا مگر کھانے کا کسے ہوش تھا۔ وہ تنہائی اور یکسوئی سے شمسہ کے معاملے پہ غور کرنا چاہتا تھا۔ اس نے ارادہ کر لیا کہ ہر قیمت پہ شمسہ کو بچائے گا، چاہے اس کے لئے کچھ بھی کرنا پڑے، جو بھی قیمت ادا کرنا پڑے --- کافی دیر وہ دماغی ٹاکم ٹوئیاں مارتا رہا جب کسی خاطر خواہ نتیجے پر نہ پہنچ سکا تو کھلی چھت پہ آ گیا۔

ہلکی ہلکی خنکی، تاروں بھرا آسمان، مہین نازک سا چاند --- تھپ سے کوئی چیز گری۔ وہ ہڑبڑا اٹھا، پھڑپھڑاتی ہوئی سفید کبوتری دانتوں تلے دبی ہوئی تھی۔ بجلی سی سرعت سے شانی اس کی جانب لپکا، گھبراہٹ میں کبوتری بلے کے دانتوں تلے سے نکل گئی۔ بلا اسے گھورتا، غراتا منڈیر پہ جا چڑھا۔ پھولوں کا گملا شمسہ والی چھت پہ گرا --- کبوتری زندہ تھی۔ گرم گرم لال خون، سفید پر۔ دائیں بازو اور سینے سے خون رس رس کر اس کے سفید روئی جیسے پروں میں جذب ہو رہا تھا۔ گملے کے گرنے کی آواز سن کر نواب بی بی کھسرا باہر نکلا اور شانی کو دیکھ کر کھسیایا۔

"ہائے، میں واری جاؤں۔ شانی بیٹی! آپ اس وقت یہاں کیا کر رہی ہیں؟"

"اس بیچاری کبوتری کو وہ بلا کہیں سے اٹھا لایا تھا ---" شانی نے جواب دیا۔ وہ بلے کی

طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا جو ابھی تک منڈیر پہ بیٹھا تھا۔ نواب بی بی جوتی اتار' بلے کی طرف لپکا مگر وہ بھاگ چکا تھا۔

"حرامخور' اوتر جانا---" وہ بلے کو گالیاں بکتا ہوا واپس پلٹا۔ "ذرا دکھانا کبوتری کو---" وہ کبوتری کو لت پت دیکھنے لگا پھر بولا۔ "جان بچ گئی بیچاری کی--- آؤ' ذرا اسے ہلدی پھٹکری لگاتے ہیں---"

شانی اندر داخل ہوا۔ دو نوخیز سے زنانے ٹیلی ویژن پر کوئی پروگرام دیکھ رہے تھے' ثمر اسے نظر نہ آئی۔ کبوتری کے بال و پر' ڈیٹول سے صاف کرنے کے بعد نواب بی بی سے ثمر کے بارے میں دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ اپنے کمرے میں آرام کر رہی ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سوچتا' شمسہ اس کی آواز سن کر خود ہی باہر آ گئی اور معصومیت سے تالی بجاتے ہوئے بولی۔

"آہا' میرا گڈا آ گیا---"

پیلا پھٹک رنگ' دھنسی ہوئی آنکھوں کے نیچے سیاہ ہالے' پپڑی جمے ہونٹ' بے ترتیب بال' کمزور مرجھائی ہوئی شمسہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اسے اس حال میں دیکھ کر وہ اندر سے دہل سا گیا' کئی لمحے ٹکٹکی باندھے کھڑا دیکھتا رہا۔

"کیسی ہو--- میری--- بہن؟" بغیر کچھ سوچے سمجھے' خود بخود اس کے منہ سے نکل گیا۔ شمسہ کی بجھی بجھی آنکھوں میں کیمرہ فلیش کی مانند روشنی کا کوندا لپکا اور بجھا۔ پلکیں جھپکے بغیر کئی ساعتیں کھڑی اسے دیکھتی رہی' اس دوران میں وہ شاید اپنی کیفیت پہ قابو پا چکی تھی۔

"اچھی ہوں--- اچھی ہوں---" وہ یہ کہتی ہوئی اس سے لپٹ گئی اور وہ بے اختیار اس کے سر پہ ہاتھ پھیرنے لگا۔ پھر وہ نواب بی بی سے مخاطب ہوا۔ "اسے کیا ہوا' یہ بڑی کمزور ہو گئی ہے؟"

نواب بی بی آنکھیں مٹکاتے ہوئے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولا۔ "اللہ نہ کرے شاہ جی! بڑی تکلیف ہے بے چاری کو--- یہ اسی معصوم بوٹی کا حوصلہ ہے جو سب کچھ برداشت کر رہی ہے۔ کوئی اور ہو تو اللہ معافی' تھاں مرجاوے---"

"اللہ رحم کرے---" وہ شمسہ کو پچکارتے ہوئے بولا۔ "سب ٹھیک ہو جائے گا انشاء اللہ---"

سینے لگی شمسہ دنیا و مافیہا کے آزاروں سے بے نیاز' کیف میں ڈوبی ہوئی کسی اور ہی



میں پہنچ گئی تھی۔ نواب بی بی نے چائے پانی کا پوچھا تو شمسہ' شانی سے الگ ہو کر "میں برگر کھاؤں گی' میں برگر کھاؤں گی" شمسہ بچوں کی طرح ضد سی کرنے لگی۔

نواب بی بی بتانے لگا۔ "کئی دنوں سے برگر کھانے کو کہہ رہی ہے' میری بٹیا! میں نگوڑی کیا کروں' شاہ جی نے پرہیزی کھانے کی تاکید کی ہوئی ہے--- شانی چندا! ویسے کئی روز سے میرا جی بھی برگر کھانے کو چاہ رہا ہے---"

"میں برگر ضرور کھاؤں گی--- اوں' اوں۔" شمسہ نے پھر ضد کی۔

شانی نے اسے پیار سے پچکارتے ہوئے کہا۔ "اچھا' بابا! ناراض مت ہو۔ ہم تمہیں اور نواب بی بی کو ابھی برگر لا دیتے ہیں---"

"شانی بٹیا! شاہ صاحب ناراض ہوں گے' مجھے ڈانٹیں گے۔" نواب بی بی نے خدشہ ظاہر کیا۔

"ایسی کوئی بات نہیں--- میں ان ہی کے پاس آج گیا ہوا تھا' انہوں نے مجھے اسے خوش رکھنے کی تاکید کی ہے---" وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ "اچھا' تم یہاں بیٹھ کر ٹیلی ویژن دیکھو۔ میں تمہارے لئے برگر اور جوس لاتا ہوں---"

"میں بھی ساتھ چلوں گی---" وہ سلیپر پہنتے ہوئے پھر ضد کرنے لگی۔

"اس وقت؟--- دیکھو' دیر ہو گئی ہے--- میری پیاری بہن! ضد نہیں کرتے۔"

وہ باقاعدہ رونے لگی' کشن اٹھا کر ٹیلی ویژن پہ دے مارا تبھی نواب بی بی بولا۔

"ہائے ہائے' کیا کر رہی ہو چندا! ٹیلی ویژن توڑو گی---؟" وہ شانی سے مخاطب ہوا۔ "شانی چندا! اسے بھی ساتھ لے ہی جاؤ' خواہ مخواہ یہاں روتی رہے گی۔ خود بھی ہلکان ہو گی اور ہمیں بھی پریشان کرے گی۔"

شانی نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔ "اچھا' چلو--- مگر پہلے اپنا حلیہ درست کرو' منہ ہاتھ دھو کر بالوں میں کنگھی کرو---"

☆☆☆

مون مارکیٹ' شیریں محل کے سامنے شانی نے ٹیکسی رکوائی۔ یہاں رات گئے تک اچھی خاصی بھیڑ رہتی ہے۔ ٹیکسیاں' کاریں' موٹر سائیکل' آس پاس کے متوسط طبقے کے لوگ جو گلبرگ' مال روڈ یا دیگر اعلیٰ درجے کے کھانے پینے کے مراکز میں جانا' کھانا پینا افورڈ نہیں کر سکتے وہ یہیں اپنا رانجھا راضی کر لیتے ہیں۔ تکے' کڑاہی گوشت' فرائی مچھلی' بندو خان کے بلب پراٹھے' چکن کارن سوپ' کاغذی سموسے' آئس کریم' چائے کافی' فروٹ چاٹ'

مٹھائیاں' ہار گجرے' پھل پھلاری' ہر چیز کی دوکانیں سجی رہتی ہیں۔ اُچکّے' تیل مالشیئے' فقیر' فقیرنیاں' پھانسنے والے' پھنسنے والے' ہر قبیل خرابات یہاں رات گئے تک موجود ہوتی ہے۔ گاڑی میں بیٹھے بٹھائے ہر چیز حاضر کردی جاتی ہے۔

اس سمے اور اس حلیئے میں تو وہ ویسے بھی باہر نہیں نکل سکتے تھے۔ ہیجڑوں کھسروں' اکیلی دُکیلی لڑکیوں کی تو ویسے ہی شامت آئی رہتی ہے۔ ٹیکسی والے کو شانی نے چکن سوپ' برگر کا آرڈر دیتے ہوئے کہا کہ "تم بھی باہر کھاؤ پیئو' ہم کچھ دیر یہاں رکیں گے۔" ٹیکسی والا دونوں کو آزاد خیال لڑکیاں سمجھ رہا تھا لہٰذا "جی' میڈم" کہہ کر دہ سامنے برگر والے کے پاس چلا گیا تو شانی بڑی سنجیدگی سے شمسہ کی جانب متوجہ ہوا۔

"نگہت---!" شمسہ کی آنکھیں پھیل کر دگنی ہوگئیں' منہ کا دہانہ کھُل گیا۔ وہ وحشت بھرے انداز سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"حیران تم ہو سکتی ہو مگر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں---" وہ اس کا یخ بستہ ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر تھپتھپانے لگا۔ "---یاد ہے' اس دن چھت پہ تم نے غیرارادی طور پر مجھے بھائی کہا تھا۔ یاد ہے نا؟--- اور آج کچھ دیر پہلے ہی میں نے ارادی طور پر تمہیں بہن کہا تھا۔ ایک بار نہیں بلکہ دو بار' ہے نا!--- جس طرح تمہارا ایک بوتل خون میری نس نس میں سرگرداں ہے اسی طرح تمہارا دکھ بھی میرے دل کے اندر پھوڑا بن کر ناسور کی طرح پھیل گیا ہے۔ میری بہن! میں تمہارے حال سے بے خبر نہیں' مجھے سب کچھ معلوم ہے۔ یہ موقع تفصیل سے باتیں کرنے کا نہیں' اس وقت صرف میرے چند سوالوں کا جواب دو--- کیا تمہاری یادداشت مکمل طور پر واپس آچکی ہے' کیا تم غیردانستہ کوئی نشہ آور دوا استعمال کرتی ہو یا تمہیں زبردستی یا بے خبری میں استعمال کرائی جاتی ہے اور تیسرا سوال' کیا تم اس جہنم سے نکل کر واپس اپنے گھر جانا چاہتی ہو---؟"

برگر والے کا "چھوٹا" ٹرے اٹھائے باہر کھڑا تھا۔ شانی نے ہاتھ بڑھا کر کوک کی دو بوتلیں اٹھالیں' برگر پیک کر کے لانے کے لئے کہا تو وہ "جی' باجی" کہہ کر چلا گیا۔

"ہاں' تو میں نے پوچھا تھا کہ---"

"شانی بھائی! تم تو بہت کچھ کہہ چکے مگر میں تمہیں بہت کچھ نہیں بتا سکتی۔ اسے میرا معذوری سمجھ لو یا مجبوری--- اور اگر تم میری طرح مجبور نہیں ہو تو اتنا بتادو کہ تمہیں میرا صحیح نام کیسے معلوم ہوا' تم مجھے کس حوالے سے جانتے ہو؟"

"ایزی' ایزی--- اُلجھ کر بات مت کرو' پہلے ہی بہت سے گورکھ دھندے ہیں۔ تمہیں



بہن سمجھ کر مدد کرنا چاہتا ہوں' ساتھی بن کر ساتھ نبھانا چاہتا ہوں۔ اگر زیادہ مین میخ نکالو گی تو بات بنے گی نہیں' بگڑے گی--- جن لوگوں میں تم پھنسی ہوئی ہو ان کے ہاتھ بہت لمبے اور مضبوط ہیں اور تم بہت کمزور--- خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ کسی بھی وجہ سے تمہاری یادداشت لوٹ آئی ہے اور اس تبدیلی سے وہ شیطان بے خبر ہیں' صرف میں جانتا---"

وہ بات درمیان سے قطع کرتے ہوئے بولی۔ "تم نے کیسے جانا کہ میری یادداشت لوٹ آئی ہے؟"

"تمہیں یاد ہو گا' اس دن چھت پہ تم نے مجھے بھائی کہا تھا جبکہ تم ہمیشہ مجھے اپنا گڈا کہتی تھیں۔ اس دن تمہاری حرکات' آنکھیں' اور بھی بہت سی تبدیلیاں تھیں۔ تم اس وقت ایک نارمل انسان کی مانند بات چیت کر رہی تھیں--- نگہت! میں عمر میں تم سے کچھ چھوٹا ہی سہی لیکن اتنا ناسمجھ بھی نہیں کہ یہ نمایاں تبدیلیاں محسوس نہ کرسکوں۔ پلیز! میں اسی دن سے اسی ادھیڑبن میں ہوں کہ کسی طرح تمہیں ان بھیڑیوں کے چنگل سے آزادی دلاؤں مگر یہ سب اسی وقت ممکن اور قابل عمل ہو سکتا ہے جب تم بھی یہی کچھ چاہو اور میری مدد کرو---"

"بھائی! تمہارے جذبات قابل قدر ہیں مگر افسوس کہ میں اس معاملے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کرسکتی۔ میری داستانِ بربادی بڑی طویل اور المناک ہے جسے سنا کر میں تمہارا مُوڈ اور وقت برباد کرنا نہیں چاہتی۔ میرے اپنوں اور حالات نے مجھے جس راہ پہ چلنے پہ مجبور کردیا ہے' میں چاہوں بھی تو واپس لوٹ نہیں سکتی۔ میں پہلے بھی کسی اپنے کے لئے قابل حفاظت و عزت نہ تھی اور اب جب میرے پلے نہ آبرو ہے' نہ عِصمت و عِفت کی پاکیزگی اور نہ صحت تو کون میرا اپنا ہے جو اپنے دل اور گھر کا دروازہ میرے لئے کھولے گا--- نہ' بابا---!" اچانک دونوں ہاتھوں سے سر تھامتے ہوئے وہ گھٹنوں پہ جھک کر پھس پھس رونے لگی۔

"لو--- کوک پیئو---" شانی نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

وہ وہیں جھکی جھکی بولی۔ "نہیں' مجھے کوک نہیں چاہئے--- مجھے میری دوا چاہئے۔ میرا بدن بری طرح ٹوٹ رہا ہے' میرا دل ڈوب رہا ہے۔ مجھے فوراً فلیٹ پہ لے چلو---"

"نگہت---!"

وہ چیخی۔ "میں نگہت نہیں' شمسہ ہوں۔ سنا تم نے---" پھر شانی کے چہرے پہ استہزائیہ نگاہیں ڈالتے ہوئے بولی۔ "تم--- اور تم شایان نہیں' شانی زنانے ہو---"

برگر کا پیکٹ لے کر شانی نے ڈرائیور کو بلایا۔ ریورس لے کر ٹیکسی مسجد کے پاس سے گزری تو اسے قاسم اور زلفی دکھائی دیئے جو چند دوستوں کے ساتھ بیٹھے تکے کباب کھا رہے

تھے۔۔۔ شمسہ کے اچانک بدلتے ہوئے رویئے اور ہتک آمیز سلوک سے وہ جل بھن کر کباب ہو رہا تھا' کیا جواب دیتا؟ مصلحتاً' خاموش رہا۔۔۔ شمی پان والے کے پاس گاہکوں کا جمگھٹا دیکھ کر ٹیکسی والے کو سمن آباد موڑ چلنے کے لئے کہا۔ وہ دراصل شمسہ کی اس موجودہ کیفیت کی انتہا دیکھنا چاہتا تھا' سمجھ گیا تھا کہ یہ نشے کی ٹوٹ ہے جو عادی کو وقت پہ خوراک دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ اسے گھر نہیں لے جانا چاہتا تھا۔۔۔ گاڑی سڑک پہ سیدھی ہوئی تو وہ اینٹھنے لگی' واہی تباہی تو پہلے سے ہی بک رہی تھی۔ شانی آہستہ آہستہ اس کی گردن اور شانوں کے پیچھے سہلانے لگا مگر وہ زور سے اس کے ہاتھ جھٹک کر گالیاں بکنے لگی۔ شانی نے رخ پھیر کر ایک زناٹے کا تھپڑ اس کے دائیں گال پہ جڑ دیا۔

"خاموش رہو' اب اگر کوئی حرکت یا بکواس کی تو برا حشر کر دوں گا۔۔۔"

خلاف توقع وہ اسے سرخ سرخ آنکھوں سے گھورتی ہوئی' منڈی ڈال کر خاموش ہو گئی۔۔۔

یتیم خانہ پہنچ کر ایک پان شاپ کے پاس ذرا ہٹ کر اس نے ٹیکسی رکوائی۔ ادھر سے گزرتے ہوئے کبھی کبھی وہ یہاں سے پان سگریٹ لے لیا کرتا تھا۔ دوکاندار نظر نہ آیا تو وہ انتظار کرنے لگا۔ موڈ آف تھا' دونوں طرف خاموشی۔۔۔ ڈرائیور بھی سہا سہا سا شیشے میں ان کو اچٹتی سی نظر سے دیکھ لیتا' انجن چل رہا تھا اور وہ ان کے اگلے حکم کا منتظر۔۔۔ اور یہ دونوں بظاہر ایک دوسرے سے بیزار' بے تعلق' منہ پھیرے آتی جاتی ٹریفک کو دیکھ رہے تھے سہے ہوئے ڈرائیور نے پہل کی۔

"میرے لئے کیا حکم ہے جی۔۔۔؟"

دوکاندار وہاں نہیں تھا۔ ایک سفید داڑھی والے بزرگ اندر ایک سٹول پہ بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔

"دیکھو' ڈرائیور! پان والا تو نظر نہیں آیا' یہیں کہیں گیا ہو گا۔ تم ان بزرگوں سے ڈن ہل کا پیکٹ اور ایک سرخ لائیٹر لے آؤ اور پان والے کا پوچھ لینا کہ وہ کہاں ہے؟ یہ لو پیسے۔۔۔"

شانی نے اسے پچاس کا نوٹ دیا۔ وہ دوکان پہ آیا تو اس بزرگ نے سلام میں پہل کر دی۔

"جی' فرمایئے۔۔۔؟" وہ عینک کے فریم سے اوپر میٹھی میٹھی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولے۔

"جی' پان چاہئے تھے۔۔۔ دوکاندار کدھر ہے؟"



"بیٹا! وہ باتھ روم گئے ہیں۔ ذرا انتظار کر لیں' ابھی آتے ہی ہوں گے۔"

"اچھا' آپ ایک پیکٹ ڈن ہل اور سرخ رنگ کا لائیٹر دے دیں۔ پانوں کے لئے ہم ان کا انتظار کر لیتے ہیں۔"

"ہاں' ہاں۔۔۔" انہوں نے اپنی جیب ٹٹولتے ہوئے ڈن ہل کا پیکٹ اور سرخ لائیٹر نکال کر اسے دے دیا۔

"بابا جی! مجھے نیا پیکٹ اور لائیٹر چاہئے۔۔۔" ڈرائیور نے کہا۔

وہ لکھنے سے ہاتھ روک کر پھر عینک کے اوپر سے گھورتے ہوئے کہنے لگے۔ "بھائی! پیکٹ اور لائیٹر پہلے دیکھ تو لو' پیکٹ سیل بند اور لائیٹر استعمال تک نہیں ہوا۔۔۔"

ڈرائیور نے اک نظر گاڑی کی جانب دیکھا۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے پچاس کا نوٹ ان کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ "لیجئے' پیسے لے لیجئے۔۔۔"

"نہیں' بیٹے! میں دوکاندار نہیں' امانت دار ہوں۔۔۔" پھر بڑی شفقت سے مسکراتے ہوئے کہنے لگے۔ "مجھے خوشی ہوئی کہ کوئی میری طرح ڈن ہل اور سرخ لائیٹر پسند کرنا والا آیا۔۔۔" وہ جو لکھ رہے تھے' وہیں سے ایک ورق اسے دیتے ہوئے کہا۔ "یہ میری جانب سے انہیں دے دو۔"

لکھا تھا۔۔۔ "خون رگوں ہی میں سرخرو و سرفراز رہتا ہے' رگوں کی گرفت و گردش سے باہر گر پڑے تو سرد ہو کر کوئلے کی مانند سیاہ پڑ جاتا ہے۔ سرخاب کی آنکھ' کلغی' پر' گلوٹی' سرخ شعلہ' بیر بہوٹی۔۔۔ مرغابی' اڑے بھی پر بھیگے۔ گرے بھی تو آنکھ نم۔۔۔"

وہ کاغذ پکڑے' منہ اٹھائے چلا آیا۔ بابا جی نے یہ بات جس رنگ انگ ہی لکھی تھی' شانی نے اس سے کیا مطلب نکالا؟۔۔۔ چند لمحوں بعد ڈرائیور واپس آیا اور کہنے لگا۔

"بابا جی! باجی آپ کا نام اور پتہ پوچھ رہی ہیں' آپ انہیں کچھ وقت دے سکتے ہیں۔۔۔ وہ آپ سے کچھ بات کرنا چاہتی ہیں۔"

بابا جی اپنے دھیانے لکھنے میں مصروف تھے۔ گاڑی سائیڈ پہ کھڑی تھی' نہ وہ گاڑی کو دیکھ سکتے تھے اور نہ گاڑی والے انہیں۔۔۔ باجی کا لفظ سنتے ہی وہ ہلکا سا مسکرائے۔

"بیٹا! میں یہاں کبھی کبھی آتا ہوں۔ یہ جگہ باجیوں سے بات چیت کرنے کی نہیں ہے۔ اللہ ان کے لئے بہتر کرے' انہیں میرا سلام کہئے گا۔۔۔"

★★★

فلیٹ پہ پہنچتے پہنچتے بارہ بج چکے تھے' انہیں دیکھتے ہی نواب بی بی نے صدقے واری ہوتے ہوئے کہا۔

"اتنی دیر لگا دی؟--- ارے' بھوک کے مارے پیٹ میں آنتیں ڈانس کر رہی ہیں--- لاؤ' وہ ہمارے برگر---"

شایان نے اسے برگر تھماتے ہوئے کہا۔ "پان تو ملے نہیں--- ذرا کڑک سی چائے بنا کر بھیجو' ہم یہاں کچھ باتیں کریں گے۔"

چائے کے ساتھ نواب بی بی چند کیپسول اور ایک چوتھائی گلاس کسی محلول کا لایا' شمسہ کو دوا پینے کا کہہ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ تین کیپسول نسواری رنگ کے شانی کے سامنے پڑے ہوئے تھے۔

"اچھا تو یہ تمہاری دوا ہے--- اور گلاس میں کیا ہے؟" شانی نے سونگھتے ہوئے پوچھا۔

"یہ میری دوا ہے' اس کے بغیر مجھے سکون نہیں ملتا--- پلیز! مجھے میری دوا دے دو۔ میری حالت دیکھو۔ میرا جسم ٹوٹ رہا ہے' آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا ہے---" شمسہ نے التجا کی۔

"ہاں' شمسہ! اندھیرا تو ہے اور اندھیرے میں انسان کچھ واضح دیکھ نہیں سکتا۔ میں ان اندھیروں کو ختم کرنا چاہتا ہوں اور تم---"

وہ جھنجلا اٹھی۔ "دیکھو' شانی! بات لمبی مت کرو۔ کچھ لوگ پیدائشی اندھے بھی ہوتے ہیں' ان کے لئے اندھیرے اجالے چنداں اہمیت نہیں رکھتے۔ ان کے لئے سب ایک سا ہوتا ہے۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ میں نہیں جانتی؟--- میں خوب جانتی ہوں کہ میں کیا پی رہی ہوں' کھا رہی ہوں لیکن میں کیا کروں؟ اب یہی زہر میرے لئے تریاق ہے' نشہ اور ایک گونہ ... میری زندگی ہے۔ میں نے اپنی سوچ اور احساس کو ختم کر دیا ہوا ہے' آج سے نہیں



بلکہ اسی وقت سے جب--- جب میرے والد نے میری مظلوم دکھیا ماں کو اس لئے اپنی زندگی سے نکال دیا کہ وہ اس کے لئے ایک بیٹا پیدا نہیں کر سکی۔ بڑی بیٹی ہونے کے ناطے جب میں نے اپنی بے سہارا ماں کا بیٹا اور معصوم بہنوں کا سہارا بننا چاہا تو مجھے قدم قدم پہ احساس دلایا گیا کہ اس معاشرے میں کسی عورت کا باعزت' باوقار رہ کر روزی کمانا بہت مشکل ہے۔ ہاتھ کی محنت سے تو ڈھنگ کا جوتا تک نہیں خریدا جا سکتا۔ البتہ جسم کی مشقت سے کار کوٹھی کی مالک بن سکتی ہے۔ کسی نے بہن کہہ کر مجھے بہکایا' کسی نے منہ بولی بیٹی بنا کر' مجھے بیوی بنانا چاہا۔ بڑے بڑے حاجی نمازی بباطن پاجی نکلے۔ بیمار ماں' چھوٹی بہنوں کی پڑھائی' کرائے کا مکان' بیگانہ شہر' اجنبی لوگ--- مجبوریوں اور ضرورتوں کا جب کوئی باعزت حل نہ نکلا تو میرے لئے خودکشی ہی واحد حل رہ گیا۔ پھر یکلخت مرنے کی ہمت نہ پا کر قسطوں میں مرنے کی راہ سجھائی دی' یعنی اپنے احساس اور کچوکے لگاتی ہوئی سوچوں کو منشیات کے دھندلکوں میں دھکیل دیا۔ مرتے ہوئے انسان کے سامنے اخلاقی' انسانی' قانونی شرعی قدریں اور تقاضے قطعی کوئی اہمیت نہیں رکھتے' وہ تو صرف جینا چاہتا ہے۔ سو شانی! میں بھی صرف جی رہی ہوں۔ کیسے' کیوں اور کس لئے؟ یہ میں سوچنا نہیں چاہتی---"

وہ ایک دم کیپسول کو اچکنے کے لئے جھپٹی اور اس سے پیشتر کہ شانی اسے پکڑتا' وہ کیپسول نگل چکی تھی۔ مگر ایک کیپسول شانی کے ہاتھ آ گیا--- پرسکون ہو کر وہ مسکرائی۔

"تم مرد سے زنانے بن گئے' میں ساری کہانی سے واقف ہوں--- سچ کہو' کیا تم نے ایسا بننا چاہا؟ یقیناً" "نہیں۔ میں تمہاری انتہائی عزت اور قدر کرتی ہوں۔ جانتے ہو کیوں؟ اس لئے کہ تم یہ حقیقت جان چکے ہو۔ کہ تم صرف اور صرف ایک زنانے کی حیثیت سے ہی زندہ رہ سکتے ہو۔ ایک بہت بڑی حقیقت کو تم نے ذلیل اور خوار ہوئے بغیر وقت سے پہلے تسلیم کیا اور اس پر عمل کر لیا۔ یہ حالات اور مقدر کے مقابل تمہاری بہت بڑی جیت ہے۔ منافق سے کافر بہت بہتر ہوتا ہے' انکار تو کرتا ہے۔ مگر ہاں' ہاں کا عذاب نہیں جھیلتا---"

ہاتھ کے اشارے سے شانی اسے روکتے ہوئے سمجھانے لگا۔ "ٹھیک ہے' تم نے سچ کہا--- میرے سامنے بھی دو ہی راستے تھے۔ زندگی یا موت--- زندہ میں اسی حیثیت سے رہ سکتا تھا۔ مگر تمہارے آگے متبادل راستے بھی ہیں۔ جو تمہاری کم ہمتی' کج فہمی اور عورت ہونے کی وجہ سے تمہاری نظروں سے اوجھل ہیں--- ذرا سوچو' تمہارے اس طرز عمل اور اس سوچ کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ ظاہر ہے' تم آج نہیں تو کل اپنے برے انجام کو پہنچ جاؤ گی۔ ماں' بہنیں' بلپ اور زلفی کسی کو کچھ خبر نہ ہوگی اور پھر جبکہ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم بہت سی

برائیوں کے ساتھ ساتھ ایک خطرناک بیماری کے چنگل میں بھی پھنسی ہوئی ہو۔ کیا تم ایک نامراد کی حیثیت سے مرنا چاہتی ہو؟---- نہ، تم ایسا نہیں کرو گی۔ میں تمہیں ایسے نہیں مرنے دوں گا۔ تم زندہ رہو گی، جیو گی بامراد زندگی----"

دوا کے اثر سے شمسہ کی پتلیاں سکڑنے لگی تھیں، سرور اور غنودگی کے لہریئے اس کے چہرے پہ لہرانے لگے تھے اور رات دوسرے پہر میں داخل ہو چکی تھی۔ چائے سامنے دھری ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ کیپسول اور گلاس اٹھا کر وہ اپنے فلیٹ میں چلا آیا۔

اگلے روز وہ صبح صبح ایک واقف کار کو ساتھ لے کر ایک پرائیویٹ منشیات کے عادی مریضوں کے شفاخانے میں پہنچا۔ کیپسول اور محلول کے بارے میں معلوم ہوا کہ یہ انتہائی مسکن مگر خطرناک ادویات ہیں، دماغ آہستہ آہستہ مفلوج اور نفسانی خواہشات میں شدت پیدا ہو جاتی ہے۔ علاج ممکن ہے۔ دوا کی خوراک میں آہستہ آہستہ کمی 'خوراک'، پرہیز ورزش اور صحت مند ماحول سے مریض افاقہ محسوس کرتا ہے۔ ساتھ ہی اس نے ایک اور ڈاکٹر سے شمسہ کی زنانہ بیماری کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ معلوم ہوا کہ اس ابتدائی اسٹیج پر مرض پر قابو پانا ممکن ہے۔

عصر سے ذرا پہلے وہ زلفی کو ملنے چلا گیا۔ جوگیا رنگ کے ملتانی مچھلی کانٹا کام والے سوٹ چُنٹوں والے قوس وقزحی دوپٹے، ہلکے سے میک اپ میں وہ ایک نوخیز الٹرا ماڈرن دوشیزہ کے روپ میں جب ٹیکسی سے اترا تو زلفی کے ملازم اور چند خریدار جو ایک تین سالہ پرانی پیجارو دیکھ رہے تھے، اس نئے ماڈل کو دیکھ کر دیکھتے ہی رہ گئے۔ خوبصورت سنہری بالوں کو اک ادائے دلبری سے جھٹکا دے کر وہ ان ندیدوں کو نظر انداز کرتا ہوا زلفی کے آفس کی جانب بڑھا۔ زلفی اس آتی ہوئی قیامت کو پہچان چکا تھا۔ اس کے لبوں پہ مسکراہٹ پھیل گئی، اٹھ کر دروازہ کھولا اور ہاتھ بڑھا کر سینے سے چمٹا لیا۔ ایک دو خریدار دفتر میں بھی بیٹھے تھے، دیکھنے والی نظریں دیکھتی ہی رہ گئیں۔ کوئی بھی اس بت طناز کو پہچان نہیں پایا تھا، دیکھنے والے اسے لڑکی ہی سمجھ رہے تھے---- گاہکوں کی موجودگی میں اس بے ساختگی سے بغل گیری؟ زلفی کو بھی بعد میں اس کا احساس ہوا مگر اب کیا کر سکتا تھا۔ زلفی کے ملازموں نے ایسا منظر اور یہ لڑکی پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی---- گاہک چلے گئے تو اس نے دفتر کے پردے کھینچ دیئے اور ایک دفعہ پھر اسے کھینچ کر سینے سے لگا لیا۔ شایان نے شرارت بھرے انداز میں اس سے پوچھا۔

"خیریت ہے نا، پردے بھی کھینچ دیئے ہیں----؟"

"خیریت ہوتی تو ایسی حرکت نہ کرتا، آج تو جی چاہتا ہے کہ تمہیں سمیٹ کر اپنے سینے میں



بند کر لوں---- سچ پوچھو تو میں تم سے بڑا سخت ناراض ہوں----"

اس کے سینے سے چمٹے چمٹے ہی شانی نے اس کے کان میں اشرفی سی کھنکتی آواز میں سرگوشی کی۔ "ناراض بھی ہو اور سینے سے بھی لگا رکھا ہے----؟"

وہ اسے مزید بھینچتے ہوئے بولا۔ "ہاں، سینے سے تو میں نے اپنے بھائی کو لگایا ہوا ہے۔ نہیں نہیں---- تم ایسی خوبصورت چیز کو، کوئی اس طرح سرعام سینے سے لگاتا ہے----

شانی مصنوعی غصے سے اسے علیحدہ کرتے ہوئے شکایتاً کہنے لگا۔ "بھائی کے بغیر تکے کباب تو خوب کھائے جاتے ہیں، کبھی جھوٹوں منہ پوچھا تک نہیں کہ بھائی کو بھی کبھی آؤٹنگ کرا دیں----"

"کبھی نظر آؤ تو پوچھوں بھی، جب بھی جاؤ تو غائب۔ ٹیلی فون مصروف---- ویسے تم نے مجھے تکے کھاتے ہوئے کہاں دیکھا؟"

"وہیں---- کل رات مون مارکیٹ----" شانی نے سرگوشی کی۔

"تم نے مجھے دیکھا---- تو ملے کیوں نہیں؟"

"مجبوری---- اور پھر تم دوستوں کے ساتھ تھے۔"

"تو پھر کیا ہوا؟---- آج بھی تو یہاں بہت سے لوگ ہیں، آج کی طرح کل بھی مل لیتے----"

"آج میں اکیلی ہوں----"

"ہاں، آج تم اکیلے ہو تو کل تمہارے ساتھ کون تھا----؟"

"ابھی نہیں بتا سکتی---- اچھا یہ بتاؤ، آج تم مصروف تو نہیں----؟"

"نہیں---- بولو، کیا بات ہے۔ کہیں چلنا ہے----؟"

☆☆☆

شانی، زلفی کے ساتھ اس کی گاڑی میں اپنے ماموں کے گھر پہنچا۔ ماموں شاید گودام میں تھے، قاسم کی موٹر سائیکل باہر کھڑی تھی۔ گھنٹی بجانے پر ممانی نے دروازہ کھولا۔ حسب سابق وہ شایان کو پہچان نہ سکیں، زلفی سے پوچھنے لگیں کہ یہ بیٹی کون ہے؟

"آپ خود ہی پہچان لیں----" زلفی نے کہا۔

وہ اسے غور سے دیکھتے ہوئے پہچان کر چیختے ہوئے بولیں۔ ہائے وے شایان تُو----؟"

شایان [illegible] تے ہوئے سلام کیا۔

"وے، اتنی تیز خوشبو؟ بیڑا پار تیرا--- چل اندر، پتر!"

قاسم بھی ماں کی چیخ سن کر آگیا تھا، نین تارا، صحن کی دوسری طرف کھڑی اکھیوں کے جھروکوں سے دیکھ رہی تھی--- رمضان کا مہینہ تھا مگر شایان کے علاوہ زلفی بھی روزے سے نہیں تھا۔ زبردستی ان کی تواضع کی گئی۔ کافی دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ شانی بار بار پہلو پہ پہلو بدل رہا تھا۔ بظاہر باتیں ہو رہی تھیں، دھیان کسی اور جانب تھا۔ زلفی کے پسندیدہ موضوع یعنی گاڑیوں پہ سلسلہ گفتگو چل نکلا۔ قاسم اور زلفی کو مصروف چھوڑ کر وہ بہانے سے ممانی کے پاس آ بیٹھا، ممانی نماز کی تیاری کر رہی تھیں--- نین کی خیر خیریت پوچھی، نین کو نیناں تلاش کر رہے تھے۔

"نین نظر نہیں آئی--- کہاں ہے؟"

"جہاں ہوتی ہے، اپنے کمرے میں--- کتابیں، کتابیں اور کتابیں اور، وہ---؟"

وہ اجازت لے کر اس کے کمرے میں چلا آیا تو وہ خلاف توقع بالوں میں کنگھی کر رہی تھی۔

"کیسی ہو، نین!--- سب باہر اور تم اندر، کیا چکر ہے؟"

"مُردے اپنی قبروں میں پڑے اچھے لگتے ہیں---" نین نے جواب دیا۔

شانی شرارت آمیز لہجے میں کہنے لگا۔ "اتفاق کہہ لو کہ میں نے کسی مُردے کو بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے آج پہلی بار دیکھا ہے اور اسی موقع مناسبت سے ایک شعر یاد آگیا۔

زلفیں سنوارنے سے بنے گی نہ کوئی بات
جایئے کسی غریب کی قسمت سنواریئے

وہ غصے سے کنگھی میز پر پٹختی ہوئی دہاڑی۔

"شایان---!"

شانی اس کے غصے سے لطف اندوز ہوتے ہوئے تصحیح کرنے لگا۔ "میرا نام شایان نہیں مس شانی ہے---" پھر الفاظ چباتے ہوئے منہ بگاڑ کر بولا۔ "تم شاید میرے شعر کی داد دینا چاہ رہی تھیں، میں نے درمیان میں ہی تمہاری بات قطع کردی۔ آئی ایم ساری---" وہ اس کے قریب آکر، اس کے الجھے ہوئے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے مشورہ دینے لگا۔ "چھی، چھی، چھی۔ کیا جھاڑ جھاڑو بال بنا رکھے ہیں۔ انہیں کھٹی لسی سے نہیں، واش اینڈ شیمپو سے دھویا کرو۔ میرے بالوں جیسے ملائم اور چمک دار ہو جائیں گے---" پھر اس کی نازک سی ٹھوڑی کو اوپر اٹھاتے ہوئے بولا۔ "ذرا میری طرف دیکھو--- میرے مدھ بھرے نین



میری چیک دیکھو۔ ہونٹ، آئی شیڈ، آئی لیشز، یہ سب میکس فیکٹر کے برانڈ نیو شیڈ ہیں۔ یہ میری گردن، جسم سے لہراتی ہوئی بھینی بھینی مہک محسوس کرو۔" وہ لمبی سی سانس بھر کر آنکھیں بند کرتے ہوئے بولا۔ "پوائزن نائنٹی نائن، وٹ اے چارمنگ فینٹسی ڈریمی خوشبو---" ماڈل گرل کی مانند پوز بناتے ہوئے اس نے کہا۔ "لک مائی ڈریس، کلر کنٹراسٹ، ڈیزائن اینڈ ویئر--- میری جان! چارمنگ لک بنو، گلیمر پیدا کرو--- ہاں، آج میں اپنے یار زلفی کو ساتھ لائی ہوں۔ وٹ اے ونڈر بوائے! ایک دم سمارٹ، ہینڈسم، فل آف لائف اینڈ فن۔"

وہ پلنگ کی پٹی پہ بیٹھ کر رونے لگی تو اس کے ہاتھ کو ہاتھ میں لے کر شانی نہایت متانت سے سمجھانے لگا۔

"نین! اپنے خول اور خوابوں کے حصارے باہر آجاؤ۔ زندگی جیسی نعمت یوں ضائع اور برباد کرنے کے لئے نہیں۔ اس کی قدر کرو، جو کھو گیا اسے بھول جاؤ اور جو مل سکتا ہے اس کو حاصل کر کے اللہ کا شکر ادا کرو--- میری بہن! اگر مجھے خوش اور زندہ دیکھنا چاہتی ہو تو زلفوں کو نہیں، زلفی کی قسمت کو سنوار دو---"

پلنگ سے کنگھی اٹھا کر، اس کے دو ٹکڑے کر کے نین کے ہاتھ میں تھما کر وہ باہر نکل آیا۔

وہاں سے نکلتے نکلتے افطار کا وقت سر پہ آگیا لیکن ممانی کے اصرار کے باوجود وہ وہاں نہیں رکا۔

☆☆☆

واپسی پہ وہ اور زلفی نہر کی طرف نکل گئے۔ موسم خوشگوار اور فضا میں ہلکی ہلکی خنکی تھی۔ یونیورسٹی کیمپس کی جانب کنارے کنارے خوبصورت سبزہ زاروں میں سفیدے کے درخت، مولسری کے جھاڑ، پھولوں کی کیاریاں، طالب علم لڑکے لڑکیاں اکیلے دو کیلے، گروپس مختلف مشاغل میں مصروف۔ اندرون لاہور کی گہما گہمی، بھیڑ بھاڑ، گھٹن اور شور شرابے سے نکل کر انسان یہاں کتنی طمانیت اور فرحت محسوس کرتا ہے۔ ذہنی بوجھ اور دین و دنیا کی ذمہ داریوں میں دبا پسا انسان یہاں کی کھلی نتھری ہوئی معطر فضا میں پہنچتے ہی آزاد پرندے کی مانند چہچہانے لگتا ہے۔ پیدل ہو تو نہر کے کنارے یا کسی درخت کی گھنیری چھاؤں میں بنچ پہ بیٹھ جاتا ہے اور سواری پہ ہو تو رفتار کم کر کے زیادہ سے زیادہ یہاں کے رومان پرور اور پرسکون ماحول سے لطف اندوز ہونے کی کوشش کرتا ہے--- شایان بھی سیٹ بیک سے سر ٹکائے، آنکھیں موندھے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اسٹریو ڈولبی ساؤنڈ ڈیک پہ مہدی حسن نے فراز کی غزل چھیڑی ہوئی تھی۔

اِک عمر سے ہوں لذتِ گریہ سے بھی محروم

حسنِ ادائیگی، سُر کا رچاؤ اور شعر کے باطن میں چھپی ہوئی محرومی' التجا' انا اور کسک نے اسے منجمند کر دیا ہوا تھا۔ اس کا سراپا جیلی کی مانند' گاڑی کی حرکت کے ساتھ جھول رہا تھا۔

"طبیعت ٹھیک ہے؟---" زلفی نے ڈیک کا سوئچ آف کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہوں' ٹھیک ہوں--- اچھا کیا جو ٹیپ بند کر دی۔" پھر دائیں بائیں دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ "یہیں کہیں گاڑی روک لو---"

سڑک کی سائیڈ پہ گاڑی پارک کر کے وہ سرسبز میدان میں اتر کر ایک بنچ پہ بیٹھ گئے۔ شایان نے پرس سے ڈن ہل کا پیکٹ اور سرخ لائیٹر نکال کر غور سے دیکھنا شروع کر دیا۔

"کیا دیکھ رہے ہو--- دو نمبر تو نہیں لے آئے؟"

"زندگی میں پہلی بار ایک نمبر چیز ملی ہے---" اس نے مسلسل پیکٹ کو گھورتے ہوئے کہا۔

"ایزی ایزی بات کرو' یہاں کا موسم اور ماحول فلسفے کی خشکی اور سنجیدگی برداشت کرنے کا متحمل نہیں ہو سکتا---" زلفی نے اس کے ہاتھ سے پیکٹ لیتے ہوئے کہا۔

وہ ہاتھ کے اشارے سے اسے دکھاتے ہوئے بولا۔ "وہ دیکھو' پھولوں کی باڑ کی اوٹ میں ایک لڑکی اور ایک لڑکا۔ تمہیں کتابیں نظر آ رہی ہوں گی لیکن میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ کتابیں نہیں بلکہ اک دوجے کو پڑھنے کے لئے یہاں آئے ہیں--- ایک اور منظر۔ اُدھر' وہ دیکھو۔ وہ درخت کے نیچے ایک خوبصورت سی لڑکی اور لمبے لمبے بالوں والا لڑکا--- بظاہر دکھائی دے رہا ہے کہ لڑکی ایزل کے سامنے کھڑی سامنے درختوں اور کھیتوں کی منظر کشی کر رہی ہے' لڑکا پاس کھڑا اسے برش پکڑنے کا طریقہ بتاتے ہوئے بار بار اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیتا ہے اور لڑکی بھی بڑی دلچسپی سے نیلے پیلے رنگوں میں چاہت کا رنگ مکس کر رہی ہے--- دیکھ رہے ہو' نا! یہ لڑکا اسے مصوری سکھانے کے لئے نہیں' پریم سکھانے کے لئے یہاں لایا ہے۔ کچھ ان لوگوں سے ہی سبق حاصل کرو---"

زلفی شرارت سے اس کے لہراتے بالوں کی ایک لٹ چہرے سے ہٹاتے ہوئے بولا۔ "ہم بھی ایک جوڑا یہاں بیٹھے ہیں' اور کچھ نہیں تو کم از کم پیار بھری باتیں تو کر سکتے ہیں---؟"

"بس' ختم ہو گئی تمہاری چخ چخ---؟" شانی نے کہا اور پیکٹ اس کے ہاتھ سے چھینتے ہوئے بتانے لگا۔ "زلفی! یہ پیکٹ اور لائیٹر کل رات مجھے ایک باباجی نے دیئے ہیں' اور یہ تحریر بھی--- وہ پان والی دوکان پہ بیٹھے تھے---" پرس سے کاغذ نکال کر اسے دکھانے لگا۔ "یہ



تحریر انہوں نے میرے لئے نہیں لکھی تھی بلکہ وہ میرے پہنچنے' سگریٹ لائیٹر طلب کرنے سے پیشتر ہی لکھ رہے تھے--- اسے پڑھو۔ میں اسے سمجھ نہیں سکی لیکن مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس تحریر میں' میرے لئے کوئی پیغام چھپا ہوا ہے' کسی نہ کسی طور اس تحریر کا مجھ سے تعلق ضرور ہے---"

زلفی بڑے بے دلی سے کاغذ پر لکھی تحریر پڑھنے لگا۔ شایان دُور سامنے ایک گھنے درخت کے تنے پہ نظریں جمائے مزید بتانے لگا۔

"وہ بزرگ کوئی عام بزرگ دکھائی نہیں دیتے تھے۔ ان کی سادہ سی شخصیت' پرنور مطمئن چہرہ' لہجے کی شائستگی اور رُوح میں اُتر جانے والی نظریں--- مجھے تو وہ کوئی خاص ہستی دکھائی دیئے۔"

زلفی کاغذ لوٹاتے ہوئے معذرت کے لہجے میں کہنے لگا۔ "بھائی! پلے تو کچھ نہیں پڑا لیکن اس تحریر کے اندر کچھ نہ کچھ ہے ضرور جو کم از کم میری عقل سے بالا ہے--- میرا خیال ہے کہ وہ کوئی ٹھرکی قسم کا بابا تھا۔ جو تم پہ ریشہ خطمی ہو گیا ہو گا۔ ایسے بڈھے بڑے نمبری ہوتے ہیں۔ تمہیں خوبصورت اور بیوقوف لڑکی سمجھ کر اوٹ پٹانگ تحریر لکھ دی اور اس طرح تمہیں متاثر---"

"نہیں' یار! ایسی کوئی بات نہیں۔ انہوں نے تو مجھے دیکھا تک نہیں اور نہ ہی سگریٹ لائیٹر کے پیسے لئے بلکہ ڈرائیور سے کہا تھا۔ مجھے خوشی ہوئی کہ کوئی تو میری طرح ڈن ہل اور سرخ لائیٹر پسند کرنے والا آیا--- عجیب سی بے نیازی تھی ان کے انداز میں' ان سے میں نے ملنے اور نام جاننے کی کوشش کی مگر جواب میں انہوں نے مجھے صرف دعا دی اور بس---!"

"اچھا' بابا! وہ باباجی بڑے پہنچے ہوئے بزرگ ہیں--- آگے--- بولو؟"

"میں چاہتی ہوں کہ تم ان سے ملو۔ کیا حرج ہے؟--- میرا دل کہتا ہے کہ تم ان سے مل کر بہت خوش ہو گے۔ کیا عجب ان کی دعا برکت سے ہمارا بھی کچھ بھلا ہو جائے--- زلفی! انہیں دور سے دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں کئی بار پہلے بھی ان سے مل چکی ہوں۔ وہ مجھے قطعی اجنبی نہیں لگے۔ میرے اندر جیسے وہ کہیں موجود ہوں' میری روح سے ان کی شناسائی ہو---"

"اچھا' بابا! مل لیں گے--- ویسے ایک بات کہوں' بُرا نہ ماننا۔ تم بدقسمتی یا خوش قسمتی سے ان لوگوں میں شمار کئے جا سکتے ہو۔ جو اپنی اوقات' سمجھ وقت اور اندازے سے کوسوں آگے کی کوڑی لاتے ہیں۔ ہر بات میں اسرار تلاش کرنے اور سسپنس پیدا کرنے میں تمہیں

شاید مزہ آتا ہے۔۔۔ میری جان! اگر تم داتا دربار یا کسی بھی مزار پہ چلے جاؤ' ادھر بیٹھے ہوئے لوگوں کو دیکھو تو تمہیں وہاں بیٹھا ہوا قریب قریب ہر شخص ولی اللہ دکھائی دے گا۔ کوئی تمہیں آگے کی خبر دے گا' کوئی بشارت سنائے گا' ڈرائے گا تو کوئی پیری مُریدی کے چکر میں ڈال کر تمہیں اُلو بنائے گا۔۔۔ بھائی! ڈھونگیوں سے بچو' پہنچے ہوئے لوگ پانوں کی دوکانوں اور تھڑوں پر نہیں بیٹھتے' ڈن ہل اور سرخ لائیٹر استعمال نہیں کرتے۔ ایسے لوگ ٹھرکی اور بڈھے بھوڑ ہوتے ہیں۔۔۔ ہو سکے تو اپنی یہ کُرید بُرید کرنے والی عادت ترک کرو اور ایسے فراڈیوں سے اجتناب کرو۔۔۔"

وہ مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔ "مشورے کا شکریہ!۔۔۔ اجازت ہو تو ایک واقعہ گوش گزار کروں۔۔۔؟"

زلفی ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔ "وہ بھی ارشاد فرمالیں' بندہ بے دام ہمہ تن گوش ہے۔۔۔"

شایان' وہ نہر کنارے ایک بوڑھے آدمی کو گندے کپڑے دھوتے دیکھتے ہوئے بتانے لگا۔ "کچھ عرصہ ہوا' میں اسی تکلیف کے سلسلے میں ماں جی کے ساتھ پاکپتن شریف سلام کے لئے گئی۔ عرس کے دن ہم دُور کے ایک رشتہ دار کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ایک روز شام کو میں اکیلی ہی دربار شریف چلی آئی۔ جنتی دروازے سے گزرنے کی بہت خواہش تھی مگر بھیڑ بھاڑ کی وجہ سے اپنی یہ خواہش پوری ہوتی نظر نہیں آ رہی تھی۔ بڑی بڑی لمبی قطاریں اور عجب افراتفری کا عالم تھا' کئی لوگ کچلے گئے' کئی زخمی ہو گئے۔ یہی سب کچھ دیکھ کر میری ہمت نہ پڑی۔ میں پریشانی کے عالم میں قبرستان کی جانب نکل آئی۔ یہاں بیرون شہر اور بیرون ملک آنے والے زائرین کے گروپ ٹھہرے ہوئے تھے۔ گھومتے گھومتے ایک پرانی بیری کے نیچے عجیب و غریب حلیئے کے لوگ دکھائی دیئے۔ یہ دس بارہ ادھیڑ عمر کے ہیجڑے تھے جو زرق برق لباس' لمبے لمبے بال' رنگ برنگی مالائیں' ہاتھ پاؤں مہندی' سولہ سنگار کئے ہوئے اپنے ایک بہت ہی بزرگ ہیجڑے کے گرد حصار باندھے عجیب و غریب بھاشا میں کبت پڑھ رہے تھے۔ ایسی وضع قطع حال حلیئے کے ہیجڑے کم از کم میں نے پاکستان میں کبھی نہیں دیکھے تھے کچھ دیر میں کھڑی دیکھتی رہی' پھر مزید کرید کرنے کی خاطر میں ان کے ٹولے کے پاس بیٹھ گئی۔ جو کچھ وہ پڑھ رہے تھے۔ اس میں ہندی' فارسی' اردو اور پوربی کے الفاظ کی بھرمار تھی۔ ایک بات جو میں نے خاص طور پر محسوس کی' یہ تھی کہ ہمارے ہاں ملنگوں' مست قلندروں کے برعکس ان میں بڑی متانت سنجیدگی اور وقار تھا۔ ایک قرینہ اور اسلوب تھا' تھے تو وہ ہیجڑے مگر ہیجڑوں والا



والا اوچھا پن اور سوقیانہ حرکات و سکنات نہیں تھیں۔

پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ رکا تو چائے کا دور شروع ہوا۔ ایک مرنجاں مرنج ہیجڑے نے مٹی کی پیالی میں میرے سامنے بھی چائے لا کر رکھی۔ عجیب سی چائے تھی۔ جس میں دھوئیں کی کڑواہٹ کے علاوہ مٹی کا ذائقہ بھی شامل تھا۔ چائے شروع ہوئی تو آتے جاتے لوگ بھی چائے کے لوبھ میں جمع ہونے لگے' دیکھتے ہی دیکھتے ایک اچھا خاصا تماشا لگ گیا۔ کچھ لوگ آگے بڑھ کر بزرگ ہیجڑے کے ہاتھ بھی چُوم رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ یہ بزرگ دہلی سے تشریف لائے ہیں۔ حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کے خلیفہ خاص حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے اس خاص عقیدت مند اور منظور نظر ہیجڑے کے سلسلہ سے ہیں جو بستی نظام الدین کے راستے میں مٹی کی کوری ناند رکھے بیٹھا رہتا تھا' درگاہ شریف جانے والوں کی ٹھنڈے پانی سے تواضع کیا کرتا اور ہر اک سے بِنتی کرتا کہ "نجام پیا" تک میرا سلام پہنچا دینا اور کہنا کہ اس لونڈی کو کب سہاگن بناؤ گے؟۔۔۔ ساری زندگی وہ دلہنوں جیسا لباس اور ہار سنگار کئے لمبے راستوں کے تھکے ہارے پیاسے زائرین کی ٹھنڈے میٹھے پانی سے پیاس بجھاتا اور اپنے باباؒ کے گیت گاتا' اپنے سہاگن ہونے کی درخواست اور انتظار کرتا رہتا۔ آخر "نجام الدین پیاؒ" نے اپنی لونڈی کو سہاگن بنا کر بلند مرتبت کر دیا۔ حضرت نظام الدینؒ اپنے اس عقیدت مند سے بعد از وصال بھی بے پناہ شفقت فرماتے اور بے حد عزیز رکھتے۔ اس سلسلے کے ہیجڑے سوقیانہ طرز زندگی اور ناچ گانے سے متنفر ہوتے ہیں۔ البتہ لباس' بناؤ سنگھار اور زیورات کا اہتمام ہیجڑوں کی طرح ہی کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں بڑے بڑے نامور اور عالی مرتبت بزرگ گزرے ہیں اور موجود بھی ہیں۔ ان میں مکمل مرد بھی ہوتے ہیں۔ جو صرف لباس اور بناؤ سنگھار کی حد تک ہیجڑے نظر آتے ہیں۔ داتا سرکار کے پہلو میں بھی ایسے کئی ایک بزرگ بقید حیات ہیں۔۔۔"

زلفی نے گھڑی پہ نظر ڈالتے ہوئے اس کی بات اُچکی۔ "بھائی! ذرا سانس بھی لے لو۔۔۔ تمہاری باتیں سن کر تو میرا جی بھی چاہ رہا ہے کہ فوراً" اٹھوں' گلبرگ سے کوئی اچھا سا زنانہ سوٹ اور میک اپ کا سامان خریدوں اور مونچھیں منڈوا کر تمہارے ساتھ ہی چل نکلوں۔۔۔ بھیا! میرے کان دُکھنے کو آئے مگر تمہاری تو تلی نہیں تھکتی۔ اگر آج مجھے یہی بابوں' بزرگوں اور پیروں مُریدوں کی کہانیاں ہی سنانی تھی تو یہاں کیوں لائے' ادھر داتا دربار چلے جاتے۔۔۔؟"

"مجھے ٹوکو نہیں' صرف سنو۔۔۔ ہاں' تو میں کہہ رہا تھا کہ لوگوں کی دیکھا دیکھی میں نے بھی آگے بڑھ کر ان کے ہاتھ کو بوسہ دیا۔ اتفاق سے میں نے اس دن سر پہ سرخ رنگ کی پی

کیپ پہنی ہوئی تھی' زین کی پتلون پہ سرخ شرٹ تھی۔ آگ کے الاؤ کے قریب بیٹھنے سے چہرہ بھی سرخ ہو رہا تھا۔ میرے سر پہ ہاتھ رکھ کر اپنے عقیدت مندوں سے فرمایا۔۔۔ "ارے بلبلو!۔۔۔ دیکھو' سرخاب آیا ہے۔ آنکھ' کلغی' پر گلوٹی' سرخ شعلہ بیر بہوٹی"۔۔۔

میرے پلے کچھ نہ پڑا' میں گستاخی کر کے مطلب پوچھ بیٹھا تو وہ بولے۔۔۔ "ناہیں بڑا باوا ہی سمجھائیں گے۔۔۔"

کون باوا؟۔۔۔ مجھ سے پھر گستاخی سرزد ہو گئی۔

جواب ملا۔ "وہ خود ہی تمہیں ملیں گے' اوش ملیں گے۔۔۔"

شایان خاموش ہو گیا۔ کچھ دیر بعد زلفی خاموشی کو توڑتے ہوئے بولا۔ "اب تم کہو گے کہ یہ باباجی وہی ہیں جن کے متعلق دہلی والے باواجی نے اشارہ دیا تھا۔۔۔" شانی نے کہا۔

بظاہر تو کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ میں اس حقیقت سے انکار کروں۔۔۔"

زلفی اٹھتے ہوئے معذرت کرنے لگا۔ "اچھا' بھائی! کبھی ان سے بھی مل لیں گے۔ فی الحال اٹھو' کہیں چل کر اچھی سی چائے پلواؤ۔۔۔"

"بور ہو گئے میری باتوں سے۔۔۔؟"

"نہیں' یار! بور نہیں ہوا۔۔۔ دراصل تمہاری داستان الف لیلہٰ ختم ہونے کو ہی نہیں آتی۔ تمہیں یاد ہی نہیں رہتا کہ سننے والا محض کان ہی نہیں منہ میں زبان بھی رکھتا ہے۔۔۔ ہو سکتا ہے کہ میں بھی کچھ تم سے کہنا چاہتا ہوں۔۔۔"

وہ اسے کھینچ کر بٹھاتے ہوئے پوچھنے لگا۔ "میری جان! اب صرف تم بولو گے اور میں صرف سنوں گی۔۔۔ بولو' کیا کہنا چاہتے ہو۔ مگر میرا خیال ہے تم نہ ہی بولو۔ میں ہی بولتی ہوں کیونکہ تم دھکا اسٹارٹ ہو' سپیڈ پکڑتے پکڑتے' پکڑو گے۔۔۔ پہلی بات کہ تم بہن کے بارے میں پریشان ہو۔ میں نے خود کہا تھا کہ ٹیلی فون کروں گی جو میں نہیں کر سکی' معذرت!۔۔۔ دوسری بات جو تم جاننا چاہتے ہو یا پوچھنا چاہتے ہو۔ اس کا مختصر سا جواب یہ ہے کہ شہنائیاں ضرور بجیں گی' انشاء اللہ!"

"اچھے بھلے بات کرتے کرتے تم پٹڑی سے کیوں اتر جاتے ہو؟۔۔۔ میں واقعی بڑی بے تابی سے بہن کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔ تم اس کے بارے میں سب کچھ جانتے ہو لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی کہ تم یہ سب کچھ مجھ سے چھپا کیوں رہے ہو اور وہ کون سی مجبوری اور مشکل ہے جس کا اظہار کرتے ہوئے تم ہچکچا رہے ہو۔۔۔ حالات کچھ بھی ہوں' تمہیں مجھ سے کچھ چھپانے کی ضرورت نہیں ورنہ ہو سکتا ہے کہ تھوڑی دیر کرنے سے بہت



دیر ہو جائے۔"

"تم اپنی سمجھ کے مطابق صحیح کہہ رہے ہو۔ شانی نے کہا لیکن جو کچھ میرے سامنے ہے' اس کا تقاضا یہی ہے کہ فی الحال صبر اور انتظار کا دامن نہ چھوڑا جائے کیونکہ کبھی کبھی جذبات اور جلد بازی سے بازی چوپٹ بھی ہو جایا کرتی ہے۔۔۔ سردست یہ جان کر مطمئن ہو جاؤ کہ ہماری بہن ہمارے سامنے ہے' صرف وقتی طور پہ حالات میری گرفت میں نہیں۔

"شانی نے زیرِ لب مسکرا کر کہا تم نے پوچھا تھا کہ مون مارکیٹ میں میرے ساتھ کون تھا؟ میرے ساتھ میری بہن تھی۔۔۔"

"تم نے مجھے ملایا بھی نہیں' ظالم!۔۔۔ میں کب سے اس کی صورت دیکھنے کو ترس رہا ہوں' کم از کم تم مجھے دور سے ہی اسے دکھا دیتے۔۔۔" زلفی اچانک پھٹ پڑا۔

صبر' صبر۔۔۔ تمہاری اس بے صبری اور جذباتی کیفیت کی وجہ سے ہی میں نے اسے تمہیں ملانا یا دکھانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ دوست! دیر آید درست آید' جو میں جانتی ہوں تمہیں بھی بتا سکتی ہوں مگر وہ سب کچھ سن کر جو تمہارا ردعمل ہو گا۔ وہ میرے اور تمہارے حق میں کچھ زیادہ بہتر نہیں ہو گا۔۔۔"

"یار! کیا ہو گا۔ جھگڑا' لڑائی' قتل' تھانہ پولیس؟۔۔۔ میں اپنی بہن کے لئے کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ میرے اردگرد بھی کچھ لوگ ہیں' اللہ کا دیا روپیہ پیسہ بھی ہے۔ زور' طاقت' اسلحہ' پولیس' سب کچھ استعمال کیا جا سکتا ہے۔ عزت سے پیاری تو کوئی چیز نہیں آتی۔ کاش! تم سمجھ سکتے کہ بھائی کیسا بھی برا' گیا گزرا کیوں نہ ہو لیکن ماں بہن کی عزت کے مسئلے میں بڑا حساس ہوتا ہے۔۔۔"

شانی مسکرانے لگا۔ "دیکھا۔۔۔ کچھ بھی نہ جاننے کی حالت میں تمہاری یہ حالت ہے کہ پولیس اور اسلحے کی نمائش کرنے لگے اور روانی میں یہ بھی بھول گئے کہ میں تمہاری اور بہن کی کیا لگتی ہوں۔۔۔؟"

ایک تو میں تمہارے اس طرز تکلم سے بڑا پریشان ہوں۔ لگتی ہوں آتی ہوں' جاتی ہوں' کہتی ہوں۔۔۔ خدا کے بندے! سیدھی طرح سیدھا سادا انداز اختیار کرو۔ عورتوں کا لباس پہن لیا ہے سو پہنو' بات تو مردوں کی طرح کرو۔۔۔"

"وہی معصوم سی مسکراہٹ شانی کے چہرے پر نمودار ہوئی۔ وہ بولا۔ اس موضوع پہ تو کچھ مت بولو۔۔۔ تم اس وقت جذبات میں ہو۔ اس لئے ساری گفتگو لپیٹ کر ایک طرف رکھ دو' پھر کبھی سہی۔۔۔ وہ بہن تمہاری بھی ہے اور میری بھی' یہ معاملہ میری صواب دید پہ چھوڑ

دو۔ جب میں تمہاری انٹری کی ضرورت محسوس کروں گی، تمہیں آواز دے لوں گی۔ صرف چند دن اور صبر کرو، انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" پھر موضوع بدلتے ہوئے شرارت بھرا انداز میں چھیڑنے لگا۔ "زلفی! آج میں نے نین اور اس کی امی سے اشارتاً" تمہارے متعلق بات۔۔۔"

"شایان! خاموش ہو جاؤ۔ اس موضوع پہ کبھی کوئی بات مجھ سے اور نہ ہی ان سے کرنا، میں پہلے ہی اپنی اس گھٹیا سوچ پہ بڑا شرمندہ اور پریشان ہوں۔۔۔ اب میں نے خواب دیکھنے چھوڑ دیئے ہیں، زندگی اور ذمہ داریوں کی تلخ حقیقتوں نے مجھے سوتے ہوئے بھی آنکھیں کھلی رکھنا سکھا دیا ہے۔ وہ تمہاری منگیتر تھی۔ اب ہے یا نہیں، یہ تمہارا مسئلہ ہے مگر میرے لئے وہ صرف میری بہن ہے اور پھر میں اب شادی کرنا بھی نہیں چاہتا۔ اس وقت میرے پیش نظر سب سے اہم مسئلہ بڑی امی اور بہنیں ہیں۔۔۔"

☆☆☆

شانی دوسرے روز دوپہر کے قریب شمسہ کی خیر خبر لینے کے لئے اس کے فلیٹ پہ پہنچا تو نواب بی بی شمسہ کا جھاڑ سا سر کھولے موٹے موٹے شیشوں والی عینک سے اس کی جوئیں دیکھ رہا تھا۔

"ہائے ہائے، اتنی موٹی موٹی حرامخور جوئیں۔۔۔؟"

وہ اپنے بھدے انگوٹھوں کے ناخن دکھانے لگا۔ جو جوؤں کے خون سے داغ داغ تھے۔۔۔ شمسہ اسے دیکھتے ہی تالیاں پیٹنے لگی۔

"اخاہ، میرا گڈا آ گیا۔۔۔ کہاں تھے تم؟ میری گڑیا اپنے گڈے کا انتظار کرتے کرتے سو گئی ہے۔۔۔"

شانی اس کے پاس بیٹھ کر محبت بھری نظروں سے تکتے ہوئے کہنے لگا۔ "یہ گڑیا کے سونے کا وقت نہیں، جاگنے کا ہے۔ بے سُدھ نیند سونے والوں کو قافلے والے چھوڑ جایا کرتے ہیں اور نیند کی خاطر اپنوں سے بچھڑ جانا کوئی اچھی بات نہیں۔۔۔" وہ اس کے گال تھپتھپاتے ہوئے نواب بی بی سے پوچھنے لگا۔ "باجی، میں نے کچھ غلط کہا۔۔۔؟"

وہ اپنے دھیان نے لگا ہوا تھا بولا۔ "میں صدقے جاؤں، شانی بیٹی تم کچھ غلط کیوں کہو گی پر تم نے کہا کیا ہے، میں تو ایک مسٹنڈی جوں کا پیچھا کر رہی تھی۔ حرامخور کہیں ٹھمکا لگا کر چکمہ دے گئی ہے۔۔۔"

شمسہ آنکھیں پھاڑے سن اور شاید سمجھ بھی رہی تھی کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔۔۔ شانی نے



پوچھا۔ "باجی! حکیم صاحب نے جو دوائیں بھیجی تھیں وہ اسے دے رہی ہو نا۔۔۔؟"

وہ دو ہتھڑ تالی بجاتے ہوئی خفا سی ہونے لگی۔ "نگوڑی دوائی چاٹ چاٹ کر میری بچی ہلکان ہو رہی ہے، یہ کمینی جوئیں بھی ان دواؤں کی نحوست اور بدبو سے پیدا ہوئی ہیں۔ اب اس کے کپڑوں لتوں اور جسم جسے بھی سڑیل بدبو کے بھبکے اٹھ رہے ہیں۔۔۔"

وہ جیسے انجان بنتے ہوئے پوچھنے لگا۔ "اسے کیا تکلیف ہے، باجی؟"

"زنانہ تکلیف ہے۔۔۔" وہ کانوں کی چھچھڑوں کی طرح لٹکتی ہوئی لوؤں کو ہاتھ لگا کر بولی۔ "خدا دشمن کو بھی ایسا روگ نہ لگائے۔۔۔"

شانی کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ "لاؤ، باجی! میں اس کی جوئیں دیکھتی ہوں، تمہیں ان موٹے موٹے شیشوں سے چھوٹی چھوٹی جوئیں لیکھیں کہاں نظر آئیں گی۔۔۔" وہ زبردستی شمسہ کا سر پکڑ کر بیٹھ گیا، نواب بی بی سے پوچھنے لگا۔ "روزے رکھ رہی ہو، باجی؟"

"ہاں ہاں۔۔۔ بڑی رحمتوں کا مہینہ ہے۔ روزے رکھوں گی، قرآن پاک ختم کروں گی، رو رو کر اپنی اس بیٹی کی صحت تندرستی کے لئے دعائیں مانگوں گی۔۔۔" وہ اٹھتے ہوئے مزید بولا۔ "اچھا، بیٹی! تم اس کے پاس بیٹھو، میں ذرا کپڑے دھو لوں۔۔۔" یہ کہہ کر نواب بی بی باہر نکل گیا۔

"یہ کیا اجڑا اجڑا حلیہ بنا رکھا ہے، بے بی۔۔۔؟" شانی ناک سکوڑتے ہوئے کہنے لگا۔ "واقعی بڑی بدبو آ رہی ہے تمہارے جسم سے۔۔۔ اٹھو، نہاؤ۔ کپڑے تبدیل کرو۔۔۔"

"۔۔۔ کپڑے بھی بدل لوں گی، نہا بھی لوں۔۔۔" وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھنے لگی۔ "مگر بدبو کیسے دور ہو گی، یہ تو میری سانسوں، آسوں میں رچ بس گئی ہے۔۔۔"

وہ اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھامتے ہوئے کہنے لگا۔ "تم یہ کیسی باتیں کر رہی ہو؟۔۔۔ میں دراصل تم سے معافی مانگنے آیا ہوں۔ میں نے تمہیں تھپڑ مارا تھا۔ معاف کر دو۔۔۔"

وہ جیسے ٹھٹھر سی گئی، خدا جانے اسے کیا ہو گیا تھا۔ اچانک اس کے ہاتھ برف کی مانند ٹھنڈے ہو گئے، گرفت میں آیا ہوا ہاتھ ڈھیلا پڑ گیا۔ سر جھکائے، پاؤں کے ناخن سے فرش کریدنے لگی اور اس کی جھکی ہوئی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ کچھ کہنے کی کوشش میں محض ہونٹ پھڑپھڑا کر رہ گئی اور اس کی جانب رحم طلب نظروں سے تکنے لگی۔

"۔۔۔ نہ میری بہن! مجھے یوں نہ دیکھو۔ میں تمہارے لئے اپنی جان لڑا دوں گی مگر تمہیں آنچ نہ آنے دوں گی، یہ میرا وعدہ ہے۔ تم تھوڑی سی کوشش اور ہمت۔۔۔"

"۔۔۔ کچھ فائدہ نہیں۔۔۔ میں جس اذیت میں مبتلا ہوں، دکھائی دیتا ہے کہ اسی کی وجہ

سے میری موت واقع ہو جائے گی۔۔۔"

وہ کلائی چھوڑ کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے دلاسہ دینے لگا۔ "ایسی بات منہ سے مت نکالو۔ برکتوں رحمتوں کا مہینہ شروع ہو گیا ہے' میں اپنی بہن کے لئے رو رو کر دعائیں مانگوں گی۔ انشاء اللہ تم ٹھیک ہو جاؤ گی مگر اس کے لئے کچھ تمہیں بھی ہمت کرنا ہو گی۔۔۔ جانتی ہو' میں آج تمہاری دوا اپنے ایک کیمسٹ دوست سے ٹیسٹ کروا کر لائی ہوں۔ یہ دوا دوائیں انتہائی خطرناک ہیں' ان ہی کی وجہ سے تم اس حالت میں پہنچی ہو۔ تمہیں ہمت کر کے اس دوا کے ساتھ ساتھ اس جگہ کو بھی چھوڑنا ہو گا۔ اس جہنم میں رہو گی تو اک دن بھسم ہو جاؤ گی۔۔۔ بس' اب تمہیں تھوڑی سی ہمت اور کوشش کرنا ہو گی۔ میں قدم قدم پہ تمہارے ساتھ ہوں۔۔۔"

شمسہ آنکھیں بند کرتے ہوئے لمبی سی کراہ لے کر بولی۔ "میں بھی یہ سب کچھ جانتی اور سمجھتی ہوں لیکن اب بازی ہاتھ سے نکل چکی ہے۔۔۔ میری یہ حالت تم دیکھ رہے ہو؟ کسی اور کو کیا' میں خود اپنے آپ کو بھی منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی۔ ان لوگوں نے جو میری درگت بنا دی ہے' تمہارے سامنے ہے اور اب شاید میں بھی۔ گندی موری کے کیڑے کی طرح غلاظت کی عادی ہو چکی ہوں۔۔۔ تم کس ہمت اور کوشش کی بات کرتے ہو' اب یہ سب کچھ فضول ہے۔ تھوڑی بہت جو باقی رہ گئی ہے۔ اس کو بچا کر کیا کروں گی؟۔۔۔ دکھیا ماں اور معصوم بہنوں کو مزید ذلیل اور رسوا کرنے سے کہیں بہتر ہے کہ میں یہیں گھٹ گھٹ کر مر جاؤں۔۔۔"

"شمسہ! تمہارا باپ بھی موجود ہے۔ تمہارا بھائی زلفی بھی جو تمہیں اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہے' جو دن رات پاگلوں کی طرح تمہیں تلاش کرتا پھرتا ہے۔۔۔"

وہ اسے پاگلوں کی طرح گھور گھور دیکھنے لگی' ماتھے پہ تیوریاں چڑھا کر پوچھنے لگی۔ "تم میرے باپ اور بھائی کو کیسے جانتے ہو۔۔۔ کیا انہیں معلوم ہے کہ میں یہاں ہوں اور کیسی زندگی بسر کر رہی ہوں۔۔۔؟"

چند لمحے سکوت کر کے پھر پوچھنے لگی۔

"پھر تو تم میری ماں اور بہنوں کے بارے میں بھی جانتے ہو گے۔۔۔ بتاؤ؟ شانی! بتاؤ۔ میری ماں اور بہنیں کس حال میں ہے' خدا کے لئے مجھے کچھ ان کے بارے میں بتاؤ۔۔۔؟"

"تمہاری ماں اور بہنوں کے بارے میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ وہ زندہ ہیں اور خیریت سے ہیں۔ باقی باتوں کا جواب میں اس وقت نہیں دے سکتی' صرف اتنا بتا سکتی ہوں کہ تمہارا



سوتیلا بھائی میرا بہت ہی پیارا دوست بلکہ اس سے کہیں زیادہ ایک بھائی ہے۔ تمہاری تلاش میں اس نے مجھے تمہاری تصویر دکھائی تھی۔ میں نے اسے تمہاری بازیابی کی امید تو دلائی ہے مگر یہ نہیں بتایا کہ میں تمہیں جانتی ہوں اور نہ یہ کہ تم کہاں ہو۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ تم بڑے خطرناک لوگوں کے درمیان پھنسی ہوئی ہو اور وہ لوگ اس وقت اپنی ہی مصیبت میں ایسے پھنسے ہوئے ہیں کہ تمہاری کیا' انہیں خود اپنا ہوش نہیں۔ اب میں کسی ایسے موقع کی تلاش میں ہوں کہ تم ان کے چنگل سے نکل کر اپنے ماں باپ' بھائی بہنوں میں پہنچ جاؤ۔۔۔ ماں کی حالت تو میں نہیں جانتی مگر تمہارا بوڑھا بیمار باپ اور بھائی تمہارے لئے بہت پریشان ہیں۔۔۔"

وہ طنز بھرے انداز میں مسکرائی' بولی۔ "تم شاید میرے والد صاحب کی ہسٹری سے اچھی طرح واقف نہیں ہو۔۔۔ جو شخص اپنی وفادار اور نیک خو بیوی' جس سے اس کی تین بیٹیاں ہیں اور وہ عورت اس کی قریبی رشتہ دار بھی ہو' وفا نہیں کر سکتا۔ وہ اپنی بیٹی سے کتنا مخلص ہو سکتا ہے؟۔۔۔ باقی رہا بھائی' تو وہ اس کا دوسری بیوی سے بیٹا ہے' اس کی اپنی ماں اور باپ موجود' بہنیں اور بھائی موجود۔ اس کی اپنی دنیا' اپنے مفادات۔ اسے میرے برے بھلے سے کیا۔۔۔" غصے سے اس کی مٹھیاں بھینچ گئیں۔ "شانی! مجھے اس دنیا میں اگر کسی سے بے انتہا نفرت ہے تو وہ میرا باپ ہے۔ ان لوگوں سے بھی زیادہ نفرت جو دن رات مجھے نوچتے اور کھسوٹتے ہیں' کم از کم یہ لوگ منافق تو نہیں۔ کھانا' لباس سر کی چھت' سب کچھ دیتے ہیں۔ وہ باپ جس کا میں خون تھی' عزت تھی' بابل بن کر مجھے ڈولی میں بٹھاتا مگر وہ میری ماں کو چھوڑ کر ایک پڑھی لکھی خوبصورت عورت کی ڈولی لے آیا اور ہمیں بے گھر' بے عزت' بے وقار' بے آسرا کر دیا۔ مجھے باپ کی بعد ہر اس چیز سے بھی نفرت ہے جو میرے باپ سے تعلق رکھتی ہے یا منسوب ہے اور یہی خیالات میری ماں کے بھی ہیں۔ جس نے ہمیں ماں سے زیادہ بن کر پالا' جوان کیا ہے۔ ہم نے ہر اس چیز سے قطع تعلق کر لیا جو ہمیں باپ کی یاد دلائے۔ شہر' مکان' رشتہ دار' سب کچھ دفن کر دیا۔۔۔ یہ سب کچھ ہو جانے کے بعد اگر آج میرا باپ یا بھائی منافقانہ ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں یا اپنی عزت بے عزت کا رونا روتے ہیں تو یہ صرف دنیا دکھاوا ہے' حقیقت نہیں۔۔۔"

"قطعی صحیح' میں سو فیصد تم سے متفق ہوں۔۔۔" پھر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہنے لگا۔ "کیا تمہیں مجھ پہ یقین ہے۔۔۔؟"

"یہ پوچھنے کی تمہیں کیا ضرورت محسوس ہوئی۔۔۔؟" شمسہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے

ہوئے پوچھنے لگی۔

"---اس لئے کہ میں جو کچھ تمہیں بتانا چاہتی ہوں۔ اس سے پہلے میرے لئے یہ جا ضروری ہے کہ تمہیں مجھ پہ اعتماد ہے یا نہیں---؟"

"شانی! مجھے تم پہ پورا پورا بھروسا ہے۔ تم کو کیا کہنا چاہتے ہو---؟"

شانی نے نین تارا کے گھر، زلفی سے پہلی ملاقات سے لے کر آج تک گفتگو تک تما کہانی بلا کم و کاست اسے سنا کر کہا۔ "بہن! اعتماد، یقین بہت بڑی قوت اور نعمت ہیں۔ جسے یہ حاصل ہو جائیں اس کے لئے کوئی مشکل، مشکل نہیں رہتی۔ حالات، خیالات وقت کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں، نفرتیں، محبت میں اور محبتیں نفرت میں تبدیل ہوتی رہی ہیں۔ زلفی کو مجھے بہت قریب سے جاننے اور سمجھنے کا موقع ملا ہے۔ جبکہ اس کے والد صاحب سے بھی شرف ملاقات حاصل ہوا۔ اس لئے مجھے ان کے بارے میں کچھ نہیں کہنا۔ میں پہلے ہی بتا چکی ہوں زلفی بالکل نہیں جانتا کہ تم اس وقت کہاں اور کس حال میں ہو اور نہ ہی میں اسے بتانا چاہتی ہوں۔ اس طرح کام بننے کی بجائے بگڑ سکتا ہے---" وہ بڑے جذباتی لہجے میں بتانے لگا۔ "تم نے مجھے خون دیا تھا اور زلفی میرا بھائی بنا ہوا ہے، ہر دو ناطے سے تم میری بہن ہو۔ میں تمہیں بہن کہتے ہوئے قطعی شرمندہ نہیں ہوں۔ تم نے اور میں نے اس سے قبل جو کچھ بھی کیا یا جو بھی ہوا اس میں ہماری کسی کمزوری یا مجبوری کا دخل تو ہو سکتا ہے، ہماری عقل یا نیت کا نہیں۔ ہم سے زبردستی کی گئی۔ ہمارا یہ فعل اختیاری نہیں، مجبوری تھا---"

"---اور تمہارا یہ فعل---؟" وہ اس کے حلیئے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھنے لگی۔

شایان اس طنز کو سمجھتے ہوئے مسکرایا۔ "پیاری بہنا!--- یہ میرا فعل اختیاری ہے اور مجبوری بھی--- فی الحال اس موضوع پہ بات نہیں ہو گی، پھر کبھی سہی--- ہاں، تو تم کہہ---"

وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے کہنے لگی۔ "میں یہ بات شدت سے محسوس کر رہی ہوں کہ تم نے جو حلیہ اپنایا ہوا ہے، یہ تمہارا اوریجنل نہیں۔ یہ زنانوں والے کپڑے، میک اپ مجھے کچھ مصنوعی سا لگتا ہے۔ تمہارے خیالات، افکار اور سلجھا ہوا، مہذب پڑھے لکھوں کا انداز گفتگو یہ سب کچھ تمہارے باوقار مرد ہونے کی چغلی کھاتے ہیں---"

"تم سے کہا ہے نا، یہ وقت اس موضوع پہ بات کرنے کے لئے موزوں نہیں--- میں بات کر رہا تھا کہ یہ لوگ بڑے خطرناک ہیں۔ شاید تم نہیں جانتی کہ ان لوگوں کی بی



ں ہماری ویڈیو فلمیں اور فوٹو ہیں۔ یہ بلیک میلر اور بردہ فروش ہیں۔ افسوس! ان کا اصل پ اس وقت میرے سامنے آیا جب چڑیاں کھیت چگ چکی تھیں--- یہ تم نے بڑی عقل ی کا ثبوت دیا جو ابھی تک یادداشت کے گم ہونے کا اظہار کرتی رہیں ورنہ بڑی مشکل پڑ تی۔ میں نے بھی انہیں محسوس ہونے نہیں دیا کہ میں ان کے اصل چہرے پہچان چکا ہوں، را یہ حلیہ اور یہ انداز بھی اسی سلسلے کی ایک وجہ ہے۔ ہم ابھی انہیں بے نقاب کرنے کی یشن میں نہیں ہیں۔ میرا خیال ہے کہ قدرت انہیں خود ہی واصل جہنم کر دے گی جس کی ا ان کی بیماری کی صورت میں ہو چکی ہے---"

وہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے، آہستہ اور قدرے متفکر ہوتے ہوئے کہنے لگا۔

"میری اس وقت پریشانی کی بڑی وجہ تمہاری یہ تکلیف بھی ہے۔ تمہیں معلوم ہونا ہئے کہ تم بھی اسی مرض کا شکار ہو چکی ہو جس میں وہ ایڑیاں رگڑ رہے ہیں۔ تم سے یہ تمام لات بیان کرنے کا مقصد یہی ہے کہ تم حالات کی نزاکت اور اپنی خطرناک بیماری کے انجام مجھو اور غور کرو--- میری تم سے التجا ہے کہ مایوسی چھوڑو اور یہاں سے نکلنے کی فکر کرو۔ ل زلفی سے اختلاف بھول جاؤ، یہ بعد کے قضیئے ہیں---"

ٹھیک اسی وقت نواب بی بی ہاتھ پونچھتے ہوئے اندر داخل ہوا۔

"ہائیں، لڑکیو! تم ابھی تک یہیں بیٹھی ہو؟--- خیر سے روزے کا وقت ہے، اس کی بھی فکر کرو---" شمسہ کے سر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ "میری بچی تو روزہ رکھ نہیں سکتی، ا جو کھاتی ہے---" وہ واپس پلٹا۔ "اچھا، میں تمہارے کھانے کا بندوبست کرتی ---"

واب بی بی کے جانے کے بعد شمسہ بولی۔

"شانی! میں نے تمہاری ساری کہانی سنی ہے، تمہارا جذبہ اور خلوص قابل قدر ہے مگر ہا انجام نظر آ رہا ہے۔ میرے ساتھ جو بھی ہوا، سو ہو لیکن میں انہیں مزید رسوائیوں اور لتوں سے تو بچا سکتی ہوں۔ میری معصوم بہنوں کا میری وجہ سے مستقبل خطرے میں پڑ سکتا ، پھر جس بری طرح سے میری نسائیت اور میری انا مجروح ہو چکی ہے اور جس برے طریقے میری عزت نفس کچلی جا چکی ہے اسے دیکھتے ہوئے اب میں عورت تو کیا، ایک انسان بھی انے کی مستحق نہیں۔ میں ان درندوں سے ایسا انتقام لوں گی کہ یہ مجھ سے التجائیں کر کر کے مانگیں گے مگر انہیں موت نصیب نہیں ہو گی--- اگر تم میری مدد کرنا چاہتے ہو، میرے ہو، مجھے بہن کہتے ہو تو وعدہ کرو کہ میرے یا میری اس زندگی کے بارے میں یا میرے اس

ٹھکانے کے متعلق زلفی یا اور کسی کو کبھی کچھ نہیں بتاؤ گے اور اگر ہو سکے تو میری دیکھی بھالی
بہنوں کا خیال رکھو گے---" وہ زبانی ان کا پتہ ٹھکانا بتاتے ہوئے مزید کہنے لگی۔ "اگر تم
اپنا وعدہ نبھایا تو میں سمجھوں گی کہ تم نے بھائی ہونے کا حق ادا کر دیا--- اور ہاں، تم میری فکر
چھوڑ دو۔ میں اپنا راستہ خود ہی نکالوں گی۔ میں تمہیں اور زلفی کو کسی صورت بھی اپنے معاملے
میں ملوث نہیں کرنا چاہتی، خصوصاً" تم تو بالکل لاتعلق رہو ورنہ تم بھی کسی مصیبت میں پھنس
جاؤ گے جو میں کبھی بھی نہ چاہوں گی۔"

نواب بی بی کچھ کھانے پینے کا سامان اور دوائیں لے کر اندر داخل ہوا۔

"لو، بچیو! کھاؤ، پیو---" پھر شانی سے مخاطب ہوا۔ "کھانے کے بعد یہ دوا اسے دے
دینا، میں ذرا آرام کر لوں---"

"نگہت---!"

شانی نے کچھ کہنا چاہا تو شمسہ فوراً" اس کے لبوں پہ ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ "ایسی غلطی
کبھی نہ کرنا--- میرا نام شمسہ ہے۔"

"سوری، شمسہ!--- میں جانوں کہ میری کسی التجا کا کوئی اثر تم پہ نہیں ہوا اور تم---"

"تم اب چلے جاؤ شانی۔ میں اپنے بارے میں تم سے بہتر سمجھتی ہوں۔ تم پہلے کی طرح
لاتعلق سے رہو--- مجھے شدت سے محسوس ہو رہا ہے کہ کچھ ہونے والا ہے اور جو کچھ بھی
ہونے والا ہے اس میں تمہارا نام نہیں آنا چاہئے، اسی میں تمہاری اور میری بہتری ہے---"
وہ اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہنے لگی۔ "---جانے سے پہلے وعدہ کرو کہ تم میری التجاؤں پہ
عمل کرو گے، کسی بھی صورت کسی کو کچھ نہیں بتاؤ گے ورنہ تم اپنی مری ہوئی بہن کا منہ
دیکھو---"

وہ ہکا بکا سا اس کا منہ دیکھنے لگا جس پہ ایک نئے عزم کی روشنی صاف نظر آ رہی تھی۔

"وعدہ کرو، شانی! وعدہ---"

"ٹھیک ہے، میں وعدہ کرتی ہوں لیکن تم سے بھی ایک وعدہ چاہوں گی کہ تم بھی اپنی
زندگی کی حفاظت کرو گی اور اپنے ہر حال سے مجھے مطلع رکھو گی---"

"وعدہ---"

اچانک شانی کو یاد آیا--- "شمسہ! تم کو وہ بابا جی یاد ہیں جنہوں نے ڈن ہل کا پیکٹ اور
سرخ لائیٹر دیا تھا اور ایک تحریر بھی---"

"ہاں، یاد ہیں---" شمسہ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔



"مجھے یقین ہے کہ ان کا یہ سب کچھ دینا یونہی نہیں تھا۔ ان کی تحریر میں کوئی پوشیدہ اشارہ
ہمارے لئے کوئی پیغام ہے۔ سگریٹ کا بند پیکٹ اور لائیٹر کوئی نہ کوئی معنی اور مقصد رکھتے
جنہیں فی الحال میں سمجھ نہیں پائی۔ تم سگریٹ یا لائیٹر دونوں میں کوئی ایک چیز اپنے پاس
لو، مجھے یقین ہے کہ کہیں نہ کہیں یہ چیزیں تمہارے کام آئیں گی---"

وہ جھنجھلا کر بولی۔ "اوہو، شانی! میں نہیں سمجھتی تھی کہ تم ایسے ضعیف العقیدہ اور توہم
ت واقع ہوئے ہو کہ کسی بوڑھے کی دی ہوئی ان عام اور فضول سی چیزوں سے کوئی مطلب
ت بھی نکال لو گے۔ تم انہیں اپنے پاس ہی رکھو---"

"یہ موقع اس موضوع پہ بحث کرنے کا نہیں--- تحریر اور لائیٹر میرے پاس رہنے دو،
ٹ کا پیکٹ تم اپنے پاس سنبھال کر رکھو---" وہ اسے تاکید کرتے ہوئے کہنے لگا۔ "یاد
یقین اور اعتماد میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ تم اس پیکٹ کو یونہی بند رہنے دینا، کھولنا
---"

وہ جان چھڑاتے ہوئے پیکٹ کو پرس میں رکھتے ہوئے بولی۔

"اچھا، بابا! وعدہ---"

☆☆☆

نسان جہاں اشرف المخلوقات ہے وہیں عجیب العجائبات بھی واقع ہوا ہے۔ اس نے شاید
ل جینے مرنے، خوشی غمی، آسودگی، ناآسودگی، بلندی پستی، دوستی، دشمنی، عزت غیرت،
بت، اچھائی برائی اور اخلاقی جرات کا کوئی معیار مقرر نہیں کیا۔ جو چیز، حرکت، عمل اس
سوچ اور ضرورت کے کھانچے میں فٹ بیٹھ جاتی ہے، وہی اس کے لئے جائز اور اس کا
جاتی ہے اور پھر اس کو جائز اور صحیح ثابت کرنے کے لئے اس کے پاس بے شمار دلائل
یے بھی ہوتے ہیں--- شایان کی زندگی اور سوچ و عمل بھی ایسے کئی تضادات کا نمونہ
ں باپ جنہوں نے اسے ناز و نعم سے پال پوس، لکھا پڑھا کر جوان کیا وہ انہیں یکسر
کر دینے پر مجبور تھا۔ سگی بہنیں کئی ہفتوں سے اکلوتے بھائی کی صورت دیکھنے کے لئے
ی تھیں مگر اس نے ایک ایسی لڑکی کو بہن بنا لیا جس کی ایک ایک رات کی سیاہ
ں کا وہ شاہد تھا۔ جس نے اسے کئی بار بے لباس ہی نہیں بلکہ خود کو بھی اس کے پہلو
لباس دیکھا۔ جو منشیات کی عادی، خطرناک مریضہ تھی اور جس کی ذہنی حالت بھی
تھی۔ ادھر نین تارا---، جس کے دل کے تار ٹوٹ کر، اب نئے سرے سے پھر
ں تگ و دو کرنے والا جو خود خودکشی کی ناکام کوشش کر چکا تھا، وہی اب دوسروں کو ہر

حال میں جینے کا درس دے رہا ہے۔ وہ دوسروں کے سامنے زندگی کے متعلق بڑے بڑے دعوے اور فلسفے بیان کرتا مگر خود اپنی زندگی کی محرومیوں ناآسودگیوں کو گلی میں گلی ڈنڈا کھیلنے والے لونڈوں کی طرح ٹلے مار مار کر اڑا دیتا۔ بہشتی دروازے سے گزرنے والا' بزرگوں اور مجذوب بابوں کی قدر کرنے والا' ان کے قدموں میں باادب بیٹھ کر فیض یاب ہونے والا زنانوں' زنخوں کے جھرمٹ میں گھنگھرو باندھ کر ناچتا بھی ہے۔ جمال و جذبات کی کیفیتوں' مہکاروں خوشبوؤں کی لطافتوں' شعروادب کی نزاکتوں' نفاست سلیقے اور قرینے کی قدروں کا دلدادہ۔ فحاشی وخباثت اور ناؤنوش کی محفلوں میں سرمست بھی رہتا ہے۔۔۔ انسان جب اندر سے ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے' زندہ رہنے کا جب کوئی واضح مقصد اور سامنے کوئی نشان منزل نہیں پاتا تو شاید یوں ہی سوچتا ہے یا وہ یونہی کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ دیوانوں کی طرح جہاں طبیعت ٹھکی ٹک گئے۔ جہاں سے اٹھے پھر اٹھ ہی گئے اور جدھر چلے' ادھر چل ہی دیئے۔

؎ راز دل کیوں نہ کہوں سامنے دیوانوں کے
یہ تو وہ لوگ ہیں' اپنوں کے نہ بیگانوں کے
وہ بھی کیا دور تھے ساقی تیرے مستانوں کے
راستے راہ تکا کرتے تھے مے خانوں کے
راستے بند کئے دیتے ہو دیوانوں کے
ڈھیر لگ جائیں گے بستی میں گریبانوں کے
آپ دن رات سنوارا کریں گیسو تو کیا
کہیں حالات بدلتے ہیں پریشانوں کے
کیا زمانہ تھا' ادھر شام ادھر ہاتھ میں جام
صبح تک دور چلا کرتے تھے پیمانوں کے
ہاتھ خالی ہیں مگر ملک عدم کا ہے سفر
حوصلے دیکھیے ان بے سروسامانوں کے
سر جھکائے ہوئے بیٹھے ہیں جو کعبہ میں قمر
ایسے ہوتے ہیں نکالے ہوئے بت خانوں کے

★★★



افطاری کے بعد' کھانے سے فارغ ہوا ہی تھا کہ منشی کرم الٰہی صاف ستھرے کپڑے' سر پر سفید ٹوپی پہنے اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

"شایان پترا رمضان شریف کا بابرکت مہینہ ہے اور آج جمعرات بھی ہے۔ بڑی برکتوں اور رحمتوں والی۔۔۔ زندگی کا کوئی بھروسا نہیں۔ موت کو کبھی بھولنا نہیں چاہیئے' ہر وقت توبہ استغفار کرنی چاہیئے۔ اگر دل مانے تو تم بھی میرے ساتھ چلو۔ تراویح وہیں پڑھیں گے۔۔۔ اللہ پاک سے رو رو کر اپنے لئے ہدایت مانگو' اللہ بڑا غفور الرحیم ہے۔"

"چاچا! میں کیسے جا سکتی ہوں' میرا حلیہ اور کرتوت دیکھے ہیں؟۔۔۔ تم چلے جاؤ' وہ پاکیزہ جگہ مجھ جیسے بدکاروں کے لئے نہیں۔" شایان نے جواب دیا۔

"نہیں' بیٹا! ایسا نہ کہو۔۔۔ داتا سرکار تو اتنی دور سے یہاں آئے ہی اسی لئے تھے کہ بھٹکے ہوؤں اور گنہگاروں کی ہدایت کا وسیلہ بنیں اور پھر اللہ پاک تو گنہگاروں اور بدکاروں کی خوب سنتا ہے' بڑے دھیان اور کریمی سے توجہ دیتا ہے۔ کوئی مانگے' بخشش چاہے' کوئی آنسو بہانے والا ہو' کوئی ہو جو اپنے گناہوں پہ شرمندہ ہو' آئندہ کے لئے توبہ کرے تو وہ ضرور معاف کر دیتا ہے۔۔۔ بیٹا! توبہ کا دروازہ ابھی تک کھلا ہوا ہے۔ اٹھو چلو۔۔۔"

"اچھا' چاچا!۔۔۔ آج وہاں سے بھی کچھ مانگ کر دیکھ لیتے ہیں۔۔۔"

منشی اس کے بھولپن پہ قربان ہوتے ہوئے مسکرایا' بولا۔ "بیٹا! آزمائش اور شرط لے کر جانا ہے تو بے شک نہ جاؤ۔۔۔ عاجزی اور شرمندگی کے آنسو لے کر جاؤ۔ داتا سرکارؒ کے وسیلے سے مانگو' رو رو کر فریاد کرو۔ راضی برضا ہو جاؤ' مجھے یقین ہے کہ تم مایوس نہیں لوٹو گے۔۔۔"

پندرہ منٹ میں شایان نہا دھو' وضو سے فارغ ہو کر مردانہ سفید شلوار قمیض میں تیار کھڑا تھا۔ ناک کان کے زیور اتار دیئے تھے۔ سر کے بال سمیٹ کر سر پہ انگوچھا باندھ لیا۔ اس سادہ سے روپ میں بھی وہ بہت ہی پیارا لگا۔ منشی کی آنکھوں میں خوشی سے آنسو چھلک آئے' سر پہ

بڑے پیار سے ہاتھ پھیرا' دُعا کی۔ پھر آنکھوں کے بھیگے ہوئے کونوں کو چادر سے پونچھتا ہو
اسے ساتھ لے کر نیچے اتر آیا۔

★★★

داتا دربار رونق تو چوبیس گھنٹے رہتی ہے۔ بھاٹی چوک سے دربار تک انسانوں کا ٹھاٹھ
مارتا ہوا سمندر تھا۔ داتا" کے عاشق والہانہ انداز میں جوق در جوق اسی بحرِ جود و سخا کی جانب
رہے تھے جہاں پہنچ کر سوکھا تنکا بھی ہری بھری مُرادوں بھری شاخسار ثمربار میں بدل جاتا ہے
بڑی تگ و دو سے چوکھٹ تک پہنچے' چوکھٹ کو ہاتھ لگا کر بوسہ دیا اور اندر داخل ہوئے تو ج
باغ ارم میں پہنچ گئے ہوں' نور اور تجلیات میں بھیگتے ہوئے مزار شریف پہ حاضری دی۔ ہا
اٹھا کر فاتحہ پڑھی' دعا مانگی۔ سبیل سے پانی پیا اور پھر پاس ہی قرآن کھول کر بیٹھ گئے۔ عشاء
اذان پہ وہ مسجد میں آ گئے۔ نماز اور تراویح کے بعد سلام پڑھنے کے لئے سب کھڑے ہو گئے۔
داتا سرکار مسجد میں سلام پڑھنے کا بھی ایک عجیب سا سواد ہے۔ جو خوش قسمت نماز
باقاعدگی سے شامل ہوتے ہیں' وہی جانتے ہیں کہ سلام پڑھتے ہوئے وہ کیسی کیسی وجدانی
روحانی کیفیات و تجلیات سے سرشار و مستفیض ہوتے ہیں۔ جھکی آنکھوں میں وفورِ عقید
سے مچلتے ہوئے آنسو' بارِ ندامت سے جھکے ہوئے سر' غلاموں کے بندھے ہوئے ہاتھ' سُو
گلستانِ مدینہ سے آتی ہوئی نسیم رحمت بار کی مستی سے جھومتے ہوئے جسم' استغراق حضور
گنبد خضرا' اور جالی روضہ رسول" کا تصور تصویر بن کر سامنے ٹھہر جاتا ہے۔ ان خوش نصیبوں
داتا سرکار" کے وسیلہ پاک سے یہیں کھڑے کھڑے حاضری ہو جاتی ہے۔ شایان بھی مجسم
عجز و نیاز بنا شاید ایسی ہی سرشاری اور حضوری کی کیفیت سے دوچار تھا۔ سلام کے بعد سوز
گداز میں ڈوبی ہوئی دعا بھی اپنا ایک الگ ہی تاثر رکھتی ہے۔۔۔ دعا ختم ہوئی' لوگ آنکھیں
پونچھتے ہوئے مسجد سے باہر نکل رہے تھے لیکن وہ مجسمہ عجز و نیاز بنا وہیں پہ کھڑا تھا۔ ہاتھ اٹھے
ہوئے تھے جیسے ابھی مراد نہ ملی ہو' اُدھر سے کوئی جواب نہ آیا ہو۔ آنکھیں ابھی نم تھیں جیسے
کپڑے میں کچھ نچوڑ باقی رہ گیا ہو۔ منشی کرم الٰہی پاس کھڑے دیکھ رہے تھے۔ وہ زیر دام آ
ہوئے سرخاب کی نوائے آہ و فغاں میں مخل ہونا نہیں چاہتے تھے۔ پیچھے داتا' آگے داتا کا دا
درمیان میں درد میں ڈوبی ہوئی دعا۔۔۔ دیکھنے والا دیکھ رہا تھا' مانگنے والا مانگ رہا تھا اور شاید
دینے والا نے کچھ دے دیا۔ اس نے چہرے پہ ہاتھ پھیرے' واپس پلٹا تو سامنے داتا سرکار
جگمگ جگمگ کرتا ہوا روضہ تھا۔ سبز گنبد' انوار کی ضیا باریاں' بھینی بھینی خوشبو' روح کو سرشار
کرتی ہوئی نرم نرم خنکی' جیسے باغِ بہشت کی جانب سے کوئی جھروکہ کھل گیا ہو۔



اچانک اسے پان والی دکان کے بابا جی نظر آئے۔ دس قدم آگے مسجد کے بڑے دروازے
کے باہر بیٹھے وہ اسی کی جانب دیکھ رہے تھے۔ وہ بے اختیار ادھر لپکا' پاس بیٹھ کر سلام کیا۔ دھیمی
سی مسکراہٹ کے ساتھ انہوں نے سلام کا جواب دیتے ہوئے بٹھا لیا اور مزاج پوچھا۔
"جی' آپ کی دُعا سے ٹھیک ہوں۔۔۔ آپ یہاں آتے رہتے ہیں؟" بغیر سوچے سمجھے
شایان سوال کر بیٹھا۔
"ہاں' بیٹا! داتا دینے والے کو کہتے ہیں اور ہم منگتوں کو داتا دوارے آنا ہی پڑتا ہے۔
یہاں نہ آئیں تو کہاں جائیں؟۔۔۔ اچھا ہوا جو آج تم بھی اس در پہ آ گئے۔ یہ کرم الٰہی ہے'
داتا کی دیا ہے۔۔۔"
منشی کرم الٰہی بھی پاس بیٹھ گیا۔
"بابا جی! آپ مجھے جانتے ہیں۔۔۔؟" ڈرتے ڈرتے شایان نے پوچھا۔
مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "وہ سب کچھ جانتا ہے' سب کو جانتا ہے۔ صرف ہم ہی ہیں
جو کچھ نہیں جانتے اور اگر کچھ جانتے ہیں تو مانتے نہیں لیکن جاننا جوکھم ہے جبکہ ماننا بڑی مہانتا
ہے۔۔۔ ماننا' ماں سے شروع ہوتا ہے۔ ماں چکّی ہوتی ہے۔ جو گھر کی چکی کا مان جان لے اس کا
داتا گھر میں موجود۔۔۔ گھر کی چکی کا پسا کھاؤ' پُن کماؤ۔۔۔"
"میں کچھ سمجھا نہیں' بابا جی۔۔۔؟"
وہ کہہ رہے تھے۔ "اس ماں کا مان توڑ دیا۔ مان ٹوٹ گیا' بازار اُٹھ گیا۔۔۔ جاؤ' اسے
فوراً نکالو۔ کہیں لے جاؤ' چھپاؤ دو۔ سرخ پیکٹ کا تمباکو ابالو۔ سولہ پہر خوب پانی پلاؤ۔ پانچ سیر
پختہ برگ نیم' سر کا پورا مُونڈن بال کچے گھڑے میں سوختہ کروا کر خشک استنجا استعمال کراؤ۔۔۔
فوراً اسے نکالو' ابھی۔۔۔"
یہ کہہ کر وہ اٹھے اور ایک طرف چل دیئے۔

★★★

سحری کے وقت' نیچے پولیس کی گاڑی رُکی اور چار آدمی عامل ظہوری شاہ کے دفتر آئے۔
ہال اس کا ملازم موجود تھا' اندر آتے ہی انہوں نے اسے دبوچ لیا اور شاہ صاحب کے متعلق
پوچھا۔ اس نے حیل و حجت سے انہیں ٹالنے کی کوشش کی۔ وہ خفیہ ایجنسی کے کارندے تھے'
دو چار الٹے ہاتھ کی جمائیں تو جھٹ سوڈیوال ظہوری شاہ کے ڈیرے کا پتہ بتا دیا۔ اسے ساتھ
لے کر پولیس وہاں پہنچی۔ یہ سارے ابھی تک سوئے پڑے تھے۔ بغیر کسی مزاحمت یا زحمت
کے یہ سارے غلیظ چوہے پولیس کی گاڑی کے چوہے دان میں بند تھے۔۔۔

شہزاد اور سکندر بخت کا پراسرار قتل' پوسٹ مارٹم کی رپورٹ' اسپیشل پولیس کے لئے اچھا خاصا مسئلہ بن گیا تھا۔ ان کے پاسپورٹوں کی روشنی میں جب دائرہ تفتیش پھیلا تو پولیس کی بھی آنکھیں پھیل گئیں۔ امریکن ایجنسیاں بھی درمیان میں آگئیں' معلوم ہوا کہ یہ دونوں ادھر امریکہ میں بھی پولیس کو مطلوب تھے لیکن دونوں کسی نہ کسی طور پولیس کو جُل دے کر پاکستان آگئے تھے۔ امریکن ایجنسیوں کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق یہ دونوں میکسیکن ڈی ڈی' انتہائی خطرناک قسم کے سوزاک میں مبتلا تھے جو رُسوائے زمانہ لعنتی مرض ایڈز سے بھی چار ہاتھ آگے خطرناک بیماری ہے۔ ایڈز میں مبتلا مریض کسی نہ کسی طرح ایک لمبا عرصہ زندہ بھی رہ سکتا ہے اور اسے تھوڑا بہت کنٹرول بھی کیا جا سکتا ہے مگر یہ عفریت' انسان کے جنسی غدود اور اعضا کو شور کے تیزاب کی مانند گلا کر شوربا بنا دیتا ہے اور اس کا اگر ایک قطرہ کسی دوسرے انسان کے لعاب یا خون میں شامل ہو جائے تو وہ بھی اسی بیماری میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

شہزاد اور سکندر بخت کی لاشیں اپنی تحویل میں لے کر تفتیش کا دائرہ پھیلا دیا گیا۔ سندھ پولیس' پنجاب پولیس' امریکن امیگریشن' اور کئی دوسری حساس ایجنسیاں' محکمے شامل تھے۔ ابتدائی تفتیش سے یہ حقیقت ثابت ہو چکی تھی کہ شہزاد لاہور کا رہائشی ہے' اس کے احباب دوست اور رشتہ دار لاہور میں ہی مقیم ہیں اور پاکستان آنے کے بعد اس نے زیادہ عرصہ لاہور میں ہی عیش و عشرت میں گزارا۔ ظہوری شاہ اینڈ پارٹی اور موتیا جان بھی منظر عام پہ آ کر پولیس کی تحویل میں آ چکے تھے۔ لاہور پولیس پر بڑا پریشر تھا کہ جتنی بھی جلدی ہو سکے' ان تمام لوگوں کو پکڑا جائے جن سے شہزاد ملا۔ کن کن لوگوں سے واسطہ رہا' کہاں کہاں وہ ٹھہرا۔ اس کی سرگرمیاں کس نوعیت کی تھیں اور سب سے بڑی بات کہ یہ منشیات کس کس نے استعمال کیں؟ جب تحقیق سے یہ معلوم ہوا کہ یہ دونوں اس نشہ کو پاکستان میں تیار کرنا چاہتے تھے اور کسی حد تک تیار کر بھی لی تھی تو سرگرمیاں اور تیز ہو گئیں۔ شہزاد کے سابقہ ریکارڈ کی مدد سے



اس کے شاہی محلے کے چند اوباش اور مشتبہ دوست پکڑے گئے' یہیں سے موتیا جان بھی شکنجے میں آئی تھی۔ اس کو پرائیویٹ کلینک سے قابو کیا گیا تھا۔ اس کی بیماری کے ریکارڈ اور اسی کی حالت سے یہ خدشہ بھی درست نکلا کہ یہ بیمار آگے بڑھ چکی ہے۔ دائرہ بڑھتے بڑھتے مس نوشی کے دفتر تک آ پہنچا' یہ سب کچھ اتنی سرعت اور رازداری سے ہوا کہ اس بے چاری کو سنبھلنے کا موقع تک نہ مل سکا۔

شایان اور منشی کے داتا صاحب سے واپس پہنچنے سے پیشتر ہی یہاں کا گند صاف ہو چکا تھا۔ ملازم نے ساری تفصیلات بتائیں۔ نواب بی بی اور دونوں زنانے بھگدڑ مچتے ہی شمسہ کو شایان کے فلیٹ میں پھینک کر بھاگ گئے تھے۔ شمسہ ابھی تک بظاہر ساری صورت حال سے بے خبر اپنے خیالوں میں مگن تھی۔ شایان کے دماغ میں شہد کی مکھیوں جیسی بھنبھناہٹ سی ہو رہی تھی۔ باباجی کے الفاظ' اشارے ایک ایک کر کے یاد آ رہے تھے۔۔۔ "بازار اٹھ گیا۔۔۔ جاؤ' اسے فوراً" نکالو۔ کہیں لے جاؤ' چھپا دو۔ سرخ تمباکو ابالو' سولہ پہر خوب پانی پلاؤ۔۔۔ فوراً" اسے نکالو' ابھی۔"۔۔۔ اس نے منشی کرم الٰہی کی جانب دیکھا۔ وہ پہلے ہی اسی کی طرف دیکھ رہے تھے' شاید دونوں کے دماغ بیک وقت باباجی کے الفاظ پر غور کر رہے تھے۔

"چاچا! اب کیا کریں۔۔۔؟"

"وہی کرو جو باباجی نے کہا تھا۔"

"سگریٹ کا پیکٹ کہاں ہے۔۔۔؟" اس نے شمسہ سے پوچھا۔

"یہ' میرے پاس۔۔۔" وہ پیکٹ دکھاتے ہوئے بولی۔

شایان نے پیکٹ لے کر اپنی جیب میں ڈال لیا۔ شمسہ کہنے لگی۔

"چاچا! کچھ مجھے بھی بتاؤ' یہ کیا افراتفری ہے۔۔۔ نواب بی بی مجھے یہاں چھوڑ کر کہاں غائب ہو گئی ہے' آپ لوگ پریشان کیوں ہیں؟"

"اس وقت صرف یہی جان لو کہ پولیس نے چھاپا مارا ہے' سب گرفتار ہو گئے ہیں۔ شاہ صاحب کے دفتر پہ پولیس کا پہرہ ہے' سوڈیوال والے بھی سب پکڑے گئے ہیں اور کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے۔۔۔ فوراً" یہاں سے نکلنے کی کرو۔ خاموشی سے' چپ چاپ۔۔۔"

پھر وہ اپنے ملازم جیرے سے مخاطب ہوا۔

"تم فوراً" اس کے بال مونڈھ کر ایک شاپر میں جمع کر لو۔ اسے میری شلوار قمیض پہنا دو۔۔۔ فوراً" دو منٹ میں۔۔۔"

کچھ دیر بعد وہ اسے لے کر سڑک پر آ گیا۔ ذرا ہٹ کر اسے رکشہ مل گیا۔ بند روڈ سے

ہوتا ہوا پرانے سانڈے' واپڈا والوں کے دفتر سے ذرا آگے مسجد کے ساتھ والی گلی میں داخل ہو کر اس نے ایک دکاندار سے ٹھیکیدار محمد یوسف کے مکان کا پتہ پوچھا۔

"تم مجھے گھر لے جا رہے ہو---؟" شمسہ نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"--- صرف خاموش رہو' اس وقت کوئی سوال یا حرکت مت کرو۔" شایان نے اسے جھڑک دیا۔

دکان دار نے گلی کے آخر میں کونے والے مکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ "جہاں لوگ جمع ہیں' وہی مکان ہے---"

"خیریت ہے' وہاں لوگ کیوں جمع ہیں؟"

"جی' حاجی صاحب کے مکان میں ایک کرائے دار بوڑھی عورت رہتی تھی۔ ایک گھنٹہ پہلے وہ انتقال کر گئی ہے---" دوکاندار نے بتایا۔

وہ آگے بڑھا۔ لوگوں' محلّہ داروں کا ہجوم تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ وہ اب کیا کرے؟ کوئی واضح بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ یہ روح فرسا خبر سن کر وہ خود دہل گیا تھا۔ شمسہ ساتھ تھی' دل پکا کر کے خاموش رہا۔ شمسہ کی جانب دیکھا تو وہ گم صم سی تھی۔ پاس سے ایک بوڑھی عورت گزر رہی تھی۔

"ماں جی! یہاں کون فوت ہو گیا ہے---؟"

"پتر! ایک بے سہارا بیمار عورت تھی۔ خاوند کا پتہ نہیں تھا بھی یا نہیں' بیٹا کوئی نہیں تھا۔ ایک جوان بیٹی عرصہ ہوا کہیں بھاگ گئی' نشہ کرتی تھی--- بس' پتر! اسی کا غم لے کر مر گئی---"

ابھی اس کی بات ختم نہیں ہوئی تھی مگر وہ رکشہ والے کو واپسی چلنے کا کہہ چکا تھا۔ اس کے لئے اب بڑی گمبھیر صورت حال پیدا ہو چکی تھی۔ کیا کرے' کدھر جائے؟--- رکشہ بند روڈ پہ بھاگا جا رہا تھا مگر دماغ جیسے ٹھس--- پہلے ہی پریشانی کیا کم تھی جو یہ نئی افتاد بھی آ پڑی۔ شمسہ اس کی شانے پر ڈھے چکی تھی۔ ایک ہوٹل کے قریب اس نے رکشہ رکوایا' پانی منگوا کر شمسہ کے منہ پر چھینٹے ڈالے تو آنکھیں کھلیں۔

"ہوش کرو' بہن! جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ صبر اور تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے خود کو سنبھالو' یہاں رکشے میں تماشا نہ لگانا--- اس وقت سب سے بڑا مسئلہ تمہیں پولیس سے بچانا ہے' پولیس چھاپے مار رہی ہے' خوش قسمتی سے ہم ان کی نظر میں نہیں آئے اور نہ ہی کسی نے ہماری نشاندہی کی ہے ورنہ ہم اس وقت یہاں نہیں' کسی پولیس تھانے میں ہوتے لیکن بہت



ہی جلد پکڑے جانے والے ہماری نشاندہی کرنے پہ مجبور کر دیئے جائیں گے۔ جب انسان کی اپنی جان پہ بنی ہوتی ہے تو اسے کسی سے بھی ہمدردی نہیں ہوتی' پھنسا ہوا دوسروں کو بھی پھنسا دیتا ہے۔ میں تو حیران ہوں کہ پولیس تمہیں کیسے چھوڑ گئی ہے--- شاید یہ باباجی کی نظر کرم تھی کہ انہوں نے مجھے ان حالات سے پہلے ہی آگاہ کر دیا تھا---"

سرخ پیکٹ کو تھپتھپاتے ہوئے وہ رکشے والے کو فیروز پور روڈ کی جانب چلنے کو کہہ چکا تھا۔ شمسہ نے بڑی دقت سے پوچھا۔

"اس کا مطلب ہے کہ تم جو کچھ بھی کر رہے ہو' اپنے باباجی کی ہدایت پر کر رہے ہو اور آج ان سے ملے بھی ہو---؟" شمسہ نے پوچھا۔

"ہاں--- رات میں چاچا کرم الٰہی کے ساتھ داتا سرکار' سلام کرنے اور تراویح پڑھنے گیا تھا' وہیں ان سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے خود ہی ان خطرات کا اظہار کرتے ہوتے تمہیں "فوراً" کسی محفوظ جگہ پر منتقل کرنے کی ہدایت کی تھی۔ تمہاری بیماری کے لئے انہوں نے سرخ پیکٹ کا تمباکو بہت سے پانی میں ابال کر سولہ پہر خوب پیٹ بھر کر وقفے وقفے سے پینے کو کہا۔ پانچ سیرنیم کے پتے اور تمہارے سر سے اترے ہوئے بال کسی کورے مٹکے میں جلا کر ان کی راکھ کو بطور خشک استنجا استعمال کرنے کی تاکید کی--- یقین اور اعتماد میں بڑی طاقت ہوتی ہے' مانو تو ٹھاکر اور نہ مانو تو پتھر--- ان دو لفظوں سے بڑے بڑے بگڑے کام سنور جاتے ہیں۔ تمہیں یقین ہونا چاہئے کہ باباجی کے ارشاد کے مطابق عمل کرنے تم بالکل تندرست ہو جاؤ گی اور مجھ پہ بھی اعتماد ہونا چاہئے کہ میں تمہارا اپنا بھائی ہوں---"

★★★

نین تارا کے گھر سے چند قدم آگے رکشہ رکوا کر اس نے زلفی کی بیٹھک کے دروازے پر ہلکی سی دستک دی' دروازہ کھلنے میں دیر نہیں لگی۔

"تم---؟" زلفی اسے شلوار قمیض میں ملبوس دیکھ کر حیران رہ گیا' بہت خوش ہوا۔ "آؤ' آؤ۔ اندر آؤ--- تم آج میرے گھر پہلی دفعہ اس لباس میں آئے ہو۔"

وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتا ہوا اندر لے گیا۔ اس کے منہ سے بمشکل نکلا۔ "زلفی! میرے پاس وقت نہیں' نہ ہی اس وقت میں تفصیل سے بات کر سکتا ہوں۔ صرف چند لفظ کہنے کے ہیں' امید ہے کہ تم صبر و تحمل سے سنو گے اور جو میں کہوں' بغیر سوال اور انکار' اس پر من و عن عمل کرو گے---"

"بھائی پہلے بیٹھو--- کیا کھڑے کھڑے بات کرو گے؟" زلفی پریشان سا ہو گیا۔

"میں بیٹھ نہیں سکتا' میرے ساتھ کوئی اور بھی ہے۔۔۔" شایان نے باہر دیکھتے ہ
جواب دیا۔

"کون ہے؟ اسے بھی اندر لے آؤ۔۔۔" زلفی دروازے سے باہر جھانک کر رکشے
جانب دیکھنے لگا۔

"اس کے سامنے بات نہیں ہو سکتی لہٰذا تم یہیں میری بات سنو۔"

"تم جب تک بیٹھو گے نہیں' میں قطعی تمہاری بات نہیں سنوں گا؟" زلفی بولا۔

"اچھا' ذرا ٹھہرو۔ میں ابھی آتا ہوں' ایک گلاس پانی منگواؤ۔۔۔"

پھر باہر آ کر پانی کا گلاس شمسہ کو دیتے ہوئے بولا۔ "لو پانی پیو' اور سگریٹ کا پیکٹ سنبھ
کر رکھنا۔ میں دو منٹ میں آتا ہوں۔"

واپس آنے کے بعد دروازہ بھیڑ کر وہ زلفی کو بتانے لگا۔

"زلفی! تمہید اور لمبی بات کا وقت نہیں۔۔۔ تمہاری بڑی امی کا دو گھنٹے قبل انتقال ہ
ہے' مناسب سمجھو تو گھر والوں کو بھی بتا سکتے ہو لیکن تم فوراً" وہاں پہنچو۔ تمہاری وہاں
ضرورت ہے۔۔۔ دوسری بات' مجھے ابھی ایک گاڑی ڈرائیور کے ساتھ چاہئے اور تیسری ب
یہ کہ باہر رکشے میں نگہت بیٹھی ہے لیکن تم ابھی اس سے مل نہیں سکتے۔ آخری بات یا تاکی
ہے کہ میری غیر موجودگی میں تم کسی سے بھی ہم دونوں کے متعلق کوئی بات نہیں کرو گے
ہی یہاں ہماری آمد کی خبر کسی کو ہونے دو گے۔ کچھ بھی معلومات نہیں دو گے' پولیس تفتی
کے لئے کسی وقت بھی یہاں آ سکتی ہے۔۔۔"

زلفی پاگلوں کی مانند منہ کھولے' آنکھیں پھاڑے اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ آنکھوں
آنسو' لبوں پہ چپ کی مہر لگی ہوئی تھی۔ شایان اس کے کاندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے مزید بولا

"میرے بھائی! میں تمہارے دکھ میں برابر کا شریک ہوں لیکن حالات ایسے ہیں کہ
تفصیلات بیان نہیں کر سکتا' مجھ پہ بھروسا رکھنا اور میری ان باتوں پر عمل کرنا۔۔۔" وہ کھڑا
گیا۔ "میں خود ہی تم سے رابطہ کروں گا۔۔۔ جلدی گاڑی منگواؤ۔"

زلفی ٹیلی فون کی جانب بڑھ گیا تو شایان باہر نکل کر رکشہ کے پاس آیا مگر نگہت' یعنی شم
غائب تھی۔ وہ ہڑبڑا کر رکشے والے سے پوچھنے لگا تو اس نے بتایا کہ سواری نکل کر سامنے
میں مسجد کی طرف گئی ہے۔ شایان نے زلفی کو آواز دے کر بلایا۔ وہ دونوں گلی کی جان
دوڑے' رکشے والا کرائے کی فکر میں پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ ادھر ادھر سب طرف دیکھا' کو
سراغ نہ ملا۔ رکشے میں بیٹھ کر قریب' نزدیک کی سب سڑکیں' گلیاں کھنگال ڈالیں مگر اسے شا



زمین نگل گئی تھی یا آسمان کھا گیا۔ اسے نہ ملنا تھا' نہ ملی۔ پسینے سے شرابور' ہانپتے کانپتے پریشانی
کے عالم میں واپس آئے۔ رکشے والے کو برا بھلا کہتے ہوئے کرایہ تھما کر فارغ کر دیا۔۔۔

☆☆☆

بیٹھک میں سب گھر والے جمع تھے' اندر داخل ہوتے ہی جیسے زلفی کی آنکھوں کے بند
کھل گئے' دہاڑیں مارتے ہوئے رونے لگا۔ اس کے اس طرح رونے کی وجہ کسی کی سمجھ میں نہ
آئی۔ قاسم' اس کی والدہ اور نین بھی پہنچ گئے۔ اسے بری طرح روتے دیکھ کر اس کی بہنیں اور
والدہ بھی آبدیدہ ہو گئیں' سب تسلیاں دلاسے دیتے ہوئے رونے کا سبب دریافت کرنے لگے
مگر اسے اک چپ لگی ہوئی تھی۔ شایان سے وجہ دریافت کی تو وہ بھی خاموش رہا۔ آخر اس
کے والد نے بیزار ہو کر انتہائی سخت لہجے میں اسے ڈانٹا۔

"میں مر گیا ہوں' تمہاری ماں مر گئی ہے جو اس بُری طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہے
ہو۔۔۔؟"

زلفی آستین سے اپنی آنکھیں اور ناک پونچھتے ہوئے بولا۔ "ہاں ہاں' میری ماں مر گئی
ہے۔ میری اپنی ماں مر گئی ہے۔۔۔" وہ میز پر ٹکریں مارنے لگا' وہ اپنے آپ میں نہیں تھا۔ پھر
باپ کی جانب اشارا کرتے ہوئے پاگلوں کی طرح چیخ چیخ کر کہنے لگا۔ "اچھا ہوا' وہ مر گئی۔ اسے
مر ہی جانا چاہئے تھا' اسے جی کر کیا لینا تھا۔ آپ نے اسے کیا دیا۔ دکھ' تکلیفیں اور در در کی
ٹھوکریں۔ تین بیٹیاں۔۔۔ اور بیٹا نہ پیدا کرنے کی پاداش میں طلاق۔ کیا کسی عورت نے بیٹا نہ
ہونے کی وجہ سے اپنے خاوند سے طلاق طلب کی ہے' دوسری شادی کی ہے۔۔۔ وہ مر کر مٹی
پاک کر گئی اور آپ ہمیشہ اپنے ضمیر کی عدالت میں مجرم بن کر کھڑے رہیں گے۔۔۔ میں جا رہا
ہوں اپنی مظلوم ماں کی میت کو مٹی دینے' اس سے معافی مانگنے' اپنی بہنوں کو کلیجے سے لگانے'
ان معصوموں کو دلاسا دینے۔۔۔"

طوفان گزر چکا تھا مگر اس کے طوفانی جھکڑوں نے اس بوڑھے درخت کو جڑوں سے اکھاڑ
پھینکا تھا۔

☆☆☆

شایان' قاسم اور زلفی وہاں پہنچے تو دوپہر گزر چکی تھی۔ عورتیں چارپائی کے گرد بیٹھی
پڑھنے پڑھانے میں مشغول تھیں' باہر گلی میں دریوں پہ محلے دار بیٹھے کفن دفن کے لئے رقم
اکٹھی کر رہے تھے۔ یہ بھی وہیں بیٹھ گئے' انہیں شاید یہاں کوئی نہیں جانتا تھا۔۔۔ قاسم بولا۔

"بھائیو! مائی جی کے ہم وارث ہیں' سارا انتظام ہم خود کریں گے۔۔۔"

"برخودار! آپ کون ہیں۔۔۔؟" ایک ہمسائے نے پوچھا۔

"جی' یہ ان کے سوتیلے بیٹے ہیں۔" قاسم نے زلفی کی جانب اشارہ کیا۔ "ہم دونوں کے دوست ہیں۔ کچھ خانگی غلط فہمیوں اور رنجشوں کی وجہ سے مائی جی علیحدہ رہتی تھیں۔۔۔ بہرحال' ہم اپنی کوتاہیوں پہ شرمندہ ہیں۔ آپ سب کا بہت بہت شکریہ۔۔۔"

ٹھیکیدار حاجی نذیر نے مائی صاحبہ کی زبانی وصیت کے تحت ان کی اس پیش کش کو نہایت نرمی سے مسترد کر دیا۔ میت' غسل اور کفنانے کے بعد دفنانے کے لئے تیار تھی۔ عورتیں سورۃ یٰسین تلاوت کر رہی تھیں۔

عورتوں میں ایک عورت منہ' جسم ڈھانپے' چارپائی کی پٹی سے لگی خاموشی سے آنسو بہا رہی تھی۔ شاید وہ خاموشی کی زبان سے یہ شکوہ کر رہی تھی کہ ماں! میرا چند منٹ تو انتظار کرلیا ہوتا۔۔۔ اتنے میں مرنے والی کے بھائی رشتہ دار' روتے پیٹتے پہنچ گئے۔ ان کے آتے ہی وہ عورت' معصوم بلکتی بچیوں کے سر پہ ہاتھ پھیر کر باہر نکل آئی۔

شام سے پہلے دفنا کر لوگ فارغ ہو چکے تھے۔ رمضان کا مبارک مہینہ' تھکے ماندے روزہ دار رسم دنیا نبھا کر اپنے اپنے گھروں کو چل دیئے۔ آس پاس' پڑوس والے دریوں پہ بیٹھے مرنے والی کی محرومیوں کا ذکر کرنے بیٹھ گئے۔۔۔ موت بھی کیا چیز ہے اور موت والا گھر' اس سے بھی عجیب تر جگہ بن کر رہ جاتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ دفنانے تک شاید کوئی خوف یا تکلف کی گنجائش رہتی ہو اور اس کے بعد تو موت والے گھر میں بچھی ہوئی دری بحث مباحث' چغلیوں' سیاسی موشگافیوں' کاروباری نفع ونقصان اور حالات حاضرہ کا اکھاڑا بن کر رہ جاتی ہے۔ یوں دکھائی دیتا ہے جیسے دنیا بھر کے موضوعات پہ کوئی سیمینار منعقد ہے۔۔۔ مرنے والی کے سب دور نزدیک کے رشتہ دار جمع تھے جو شاید اس کی زندگی میں کبھی اس کے نزدیک نہیں آئے تھے اور نہ ہی کسی نے کبھی اس کے مرنے جینے کی خبر لی تھی۔ اب سب چہروں پہ منافقت کی ہمدردی اور افسوس سجائے دنیاداری کر رہے تھے۔ ان کے درمیان زلفی' قاسم اور اس کے گھر والوں کے ساتھ شایان اور منشی کرم الٰہی وغیرہ بھی بیٹھے ہوئے تھے چپ چپ' خاموش' رشتہ داروں کی کھٹی میٹھی باتیں سن رہے تھے۔ مرنے والی کے بھائی' رشتہ داروں نے ان کی آمد اور موجودگی پہ ناک منہ چڑھایا اور کچھ تلخی کی باتیں بھی شروع کی تھیں مگر ادھر سارے تو چپ شاہ کا روزہ رکھے بیٹھے تھے۔ اسی صبرا صبری اور ذہنی دب دباؤ میں پرسے کی دری لپیٹ لی گئی۔ نگہت کے ماموں' اس کی دونوں بہنوں اور گھر کا سامان لاد کر واپس چلے گئے' مکان خالی کر دیا گیا۔۔۔ زلفی کا باپ اس دن سے چپ چپ تھا' زلفی نے شاید کچھ دے کر اس کے ضمیر کو



زخمی کر دیا تھا۔

ادھر سے جیسے تیسے فرصت ملی' ہوش درست ہوئے تو پھر نگہت کی پریشانی لاحق ہوئی۔۔۔ چار پانچ روز سے شایان مکمل طور پہ اردگرد کے حالات سے بے خبر تھا' صرف منشی کرم الٰہی سے رابطہ تھا۔ ظہوری شاہ کے دفتر کے باہر ابھی تک پولیس بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی زبانی معلوم ہوا کہ مس عاشی' عملے سمیت پولیس کی حراست میں ہے۔ حاجی رجی بیگم اپنے چیلوں چانٹوں کے ساتھ کہیں روپوش ہو گئے ہیں' سوڈیوال کا ڈیرا ابھی پولیس کے قبضے میں ہے اور باوا ہنگا شاہ کے مزار پر جھاڑو پھری ہوئی ہے۔ ان لوگوں کے دفتروں اور ڈیروں سے پولیس کوئی ایسی کام کی چیز برآمد نہ کر سکی تھی جو اس کیس کو آگے بڑھانے میں معاون ثابت ہوتی۔

پولیس ابھی تک ہوا میں تیر چلا رہی تھی۔ سخت پہرے میں ان سب کو والٹن کی ایک فوجی بیرک میں جسے ہنگامی طور پر ہسپتال وارڈ میں تبدیل کیا گیا' منتقل کر دیا گیا تھا۔ بڑے بڑے ڈاکٹر ان کے خون' پیشاب' لعاب اور غلاظتوں کے مختلف تجزیئے کر رہے تھے۔ پولیس کو ابھی تک پنا روایتی انداز استعمال کرنے کا موقع نہیں ملا تھا اس لئے ابھی تک کوئی کام کی بات معلوم نہیں و سکی تھی سوائے اس کے کہ شہزاد ان کے پاس ایک آدھ دن ٹھہرا تھا' پرانے دوستوں سے مل ا کر وہ کراچی چلا گیا۔ کوئی نشہ آور دوا وہ ضرور ساتھ لایا تھا اور یہ بیماری اسی کا نتیجہ ہے۔ شایان جان کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتے۔

شایان اور شمسہ کا نام ابھی تک درمیان میں نہیں آیا تھا۔ پولیس گرفتار ہونے والے لے سے مزید اور کچھ اگلوانے کے لئے تھرڈ ڈگری آزمانا چاہتی تھی مگر ڈاکٹر ان کی خطرناک ت کے پیش نظر اجازت نہیں دے رہے تھے البتہ پولیس کی خفیہ طور پہ تفتیشی سرگرمیاں ی تھیں۔ پولیس کی مجبوری ہوتی ہے کہ اگر کوئی کیس ایک نقطے پہ آکر ٹھہر جائے یا آگے ئے کا کوئی رخ اختیار نہ کرے تو وہ گھسی پٹی لکیروں کو پھر سے پیٹنا شروع کر دیتی ہے اور یہ ن کن حقیقت ہے کہ اس طرح وہ کچھ نہ کچھ نکالنے میں ضرور کامیاب ہو جاتی ہے۔ اسی ولے کے تحت پولیس نے ایک بار پھر ظہوری شاہ' حکیم جمالی اور مس عاشی کے دفتروں ڈیروں کو کھنگالنا شروع کر دیا۔ اس بار الماریوں' میزوں کے ڈبل تہہ دار پیندوں اور دیگر خانوں سے بہت سی تصویریں' بلیو پرنٹ اور ویڈیو فلمیں مل گئیں جن میں بے شمار مرد اور ں ناقابل بیان حالتوں میں دکھائے گئے تھے۔ فلموں اور تصویروں میں ایک لڑکی جو مختلف ل دکھائی گئی' وہ یقیناً" شمسہ" تھی۔ ایک فلم میں شمسہ کے ساتھ شایان بھی تھا۔ کئی اور بھی ان کے ہتھے چڑھ گئے تھے' زنانے ہجڑے بھی۔۔۔ پولیس بھی جانتی تھی کہ یہ بلیک

میل کی ضرورت کی فلمیں ہیں مگر یہ ایک علیحدہ کیس تھا' موجودہ کیس کو اس برآمدگی سے ک
تقویت نہیں ملی تھی۔ پولیس نے پٹ کر پٹی ہوئی لکیر کو پھر ایک بار پیٹا۔ جس طرح نیار
صرافہ بازار کی موریوں نالیوں کا ملبہ اس وقت تک چھانتے اور نتھارتے رہتے ہیں جب تک
اس کا وجود ختم نہیں ہو جاتا' اسی طرح پولیس بھی کیس کو اس وقت تک نہیں چھوڑتی جب
تک مکا یا مر مرا نہ ہو جائے۔ ملزم موجود' فلمیں اور تصویریں حاضر' وہ کیسے چھوڑتی
تفتیشی ماہرین نے فلموں کے ایک ایک فریم کو ایکسپوز کرایا' ایک ایک چہرے کو واضح اظہار
کیا۔ ان تصویروں کو سامنے رکھ کر ان لوگوں کی تلاش شروع کر دی۔ پولیس کے اپنے مخبر او
غیر سرکاری ٹاؤٹ بھی میدان عمل میں آ گئے۔ ایک مخبر جو ان کی اکثر رنگ رلیوں میں شا
واجہ ہوتا تھا' انعام کے لالچ میں اس نے کئی چہروں کو پکڑوا دیا۔ مارکیٹ کا سابق چوکیدار او
خاکروب بھی بکنا شروع ہوئے۔ اسی شام منشی کرم الٰہی اور تینوں ملازموں کو بھی پولیس۔
تفتیش کے لئے حراست میں لے لیا۔ پولیس نے ان سے شایان اور شمسہ کے متعلق پوچھا
پہلے تو وہ لاعلمی کا اظہار کرتے رہے مگر جب پولیس نے اس کے والد کو پکڑنے کی دھمکی دی
انہوں نے اس کے ماموں کا پتہ بتا دیا۔ پھر صبح صبح' شایان بھی ان کی حراست میں تھا۔ زلفی او
قاسم اب ایک اور نئی افتاد میں پھنس گئے۔ شیخوپورہ خبر پہنچی تو اس کے والدین بھی بھاگے
بھاگے لاہور پہنچ گئے۔ شایان تو پہلے ہی ذہنی طور پہ اس گرفتاری کے لئے تیار تھا' زلفی او
شایان کو اصل فکر تو نگہت کی تھی جس کے بارے وہ کچھ نہیں جانتے تھے کہ وہ اس وقت کہا
اور کس حال میں ہے' زندہ بھی ہے یا کہیں خودکشی کر چکی ہے؟ حالات ایسا رخ اختیار کر چکے
تھے' کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس کا کیا نتیجہ نکلے گا۔۔۔ زلفی نے بہت کوشش کی کہ وہ شایان ک
گرفتاری کی وجہ جان سکے مگر وہ کامیاب نہ ہو سکا اور نہ ہی یہ معلوم ہو سکا کہ اس کو تفتیش کے
لئے کہاں لے جایا جا رہا ہے۔ چند روز چکر کاٹتے گزر گئے۔ وکیلوں کے ذریعے کافی دوڑ دھوپ
اور مخصوص ذرائع استعمال کرنے کے بعد صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ معاملہ سنگین نوعیت کا
ہے۔ اصل مجرم مارے گئے ہیں' گرفتار شدگان صرف تفتیش کی غرض سے پابند ہیں اور ان کی
گرفتاری ناقابل ضمانت ہے۔ اخباروں میں بھی کچھ اس طرح کی خبریں شائع ہوئی تھیں۔

☆☆☆

اس دن جب وہ نگہت کو رکشہ میں چھوڑ کر زلفی سے باتیں کر رہا تھا' نگہت بھی بغیر سوچے
سمجھے بھاگنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ اپنی ظاہری باطنی حالت' اچانک پولیس کی ریڈ اور ماں کی ناگہانی
موت نے اسے کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔ رکشہ ڈرائیور کو کیا خبر کہ پیچھے



لڑکا نہیں' ایک جوان لڑکی ہے۔ وہ سامنے گلی میں مسجد کی جانب تیز تیز قدموں سے چلی گئی'
گریٹ کا پیکٹ اور سر کے مونڈھے ہوئے بال ہاتھ میں ہی تھے۔ مسجد کے ساتھ والی پتلی سی
لی سے نکل کر وہ سڑک پہ آ گئی' وہاں سے رکشہ پکڑا۔ وہ مغل پورہ اپنی ایک سہیلی پروین گڈو
کے پاس جا رہی تھی۔

اس کرسچن لڑکی گڈو سے اس کی دوستی ایک گارمنٹ فیکٹری میں چند ہفتوں کی ملازمت
کے دوران ہوئی تھی۔ تیکھے نین نقش' سانولی سی رنگت' چھریرے سے سراپے والی یہ آزاد
ل لڑکی بھی منشیات' سگریٹ' شراب اور عیش و عشرت کی دلدادہ تھی۔ ان دونوں میں بس
آنچ کا ہی فرق تھا۔ نگہت عزت وقار اور محنت سے روزی کمانا چاہتی تھی جبکہ گڈو کی نظر
عزت وعصمت کسی چڑیا کا نام تھا۔ اس کا نظریہ تھا کہ جب عورت بازار میں کمانے کے لئے
ہی آتی ہے تو پھر اسے شرم وحیا' عزت وعصمت کی چادروں کو لپیٹ کر گھر ہی چھوڑ آنا
ہے۔ ناک سیدھے سیدھے یا بازو گھما کر پکڑو' پکڑنی تو ناک ہی ہوتی ہے۔ وہ چند دنوں یا
ں سے زیادہ کہیں نہیں ٹکتی تھی۔ ایک دو ہفتے شرافت محنت سے کام کرتی' پاک دامنی کا
نگ رچاتی۔ پھر آہستہ آہستہ مالک' منیجر یا سپروائیزر' جو بھی اس کے مطلب کا ہوتا اس سے
لات بڑھاتی اور کھا پی' چوس چاٹ کر پھر کبھی نئی جگہ نکل جاتی۔ کوئی کاٹھ کا الو مل جاتا تو بلیک
بھی کر لیتی۔ یہ سب کچھ ہونے کے باوجود اس میں کچھ نمایاں خوبیاں اور اچھائیاں بھی
۔ اتوار کے دن وہ باقاعدہ سر ڈھانپ کر چرچ جاتی۔ انڈیا کی سمگل شدہ وسکی' بھنے ہوئے
اور آلو کے کرسپ ٹونگتی رہتی۔

گڈو کا بوڑھا ریٹائرڈ باپ جو ریلوے میں لوکوموٹو ڈرائیور تھا' دیسی رم کی ہلکی ہلکی چسکیاں
ا فرنچ موسیقار کلیرن گوز کی دھنیں گنگناتا رہتا۔ ماں مر چکی تھی' شادی شدہ بھائی' ریلوے
بڈ میں مکینک تھا۔ ریلوے کا دو کمروں والا یہ کوارٹر ان کے باپ کی ملازمت کے زمانے
ان کی تحویل میں تھا' چند کوارٹر آگے اس کا بھائی بھی اپنے بیوی بچوں کے ساتھ ایک
رمیں مقیم تھا۔ گڈو دل کی بڑی کھری اور نرم تھی' جس کو دوست کہہ دیتی اس کی خاطر
ا بازی لگانے سے دریغ نہ کرتی۔ درماندہ' پریشان حال' اپنوں بیگانوں کی ٹھکرائی اور ستائی
ڑکیوں کے لئے وہ ایک مسیحا سے کم نہ تھی۔ دامے' درمے' قدمے' سخنے' ہر لحاظ سے ان
نت و مدد کرتی۔۔۔ نگہت کی کہانی اور بپتا سن کر اس کی دوست بن گئی تھی بلکہ اسے نشے
اس نے لگایا تھا۔ تعلقات اور قربت میں اضافہ ہوا تو گڈو نے اسے بھی اس ڈگر پہ چلانا
ا پہ وہ خود چل رہی تھی مگر نگہت اس کے ہتھے نہ چڑھی' اس کے باوجود کہ وہ کئی بار اس

کی مالی مدد کر چکی تھی۔ ایک دن وہ نگہت کے طلب کرنے پہ رقم دیتے ہوئے مشورہ دینے لگی۔

''اگر تم یونہی رہو تو معجزہ ہو گا مگر میرا تجربہ اور مشاہدہ کہتا ہے کہ جن حالات اور جس معاشرے میں تم باعزت زندہ رہنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہی ہو' بہت جلد تم تھک ٹوٹ کر گر پڑو گی۔ اس صورت میں اگر تم اٹھنا بھی چاہو گی تو جو ہاتھ تمہیں سہارا دے کر اٹھائیں گے' وہی ہاتھ تمہیں تمہاری ہی نظروں میں ذلیل بھی کر دیں گے۔۔۔ بے بی! وقت ضائع مت کرو' آزمائی ازمنی۔ بیمار ماں اور معصوم بہنوں کو مصائب کی صلیب سے اتارنے کے لئے اپنی نام نہاد شرم وحیا کا فرسودہ لبادہ اتار دو۔ ضرورت' مجبوری اور زندہ رہنے کے مقصد کے سامنے یہ گھسے پٹے الفاظ کوئی معنی نہیں رکھتے۔ اس طرح تم بوڑھی ماں کی زندگی' بہنوں کا مستقبل اور اپنا وقت بچا سکو گی۔ تم نہ چاہو تو میں تمہیں مجبور بھی نہیں کروں گی اور اگر میرا مشورہ مان لو گی تو عیش و عشرت اور زندگی کے سارے سامان تمہارے قدموں میں ڈھیر ہوں گے۔۔۔ ویسے تم شاید جانتی تو ہو گی کہ یہ کرارے کرارے نوٹ اور وہ سارے روپے جو تم وقتاً فوقتاً مجھ سے لے چکی ہو اور لے رہی ہو' یہ سب کہاں سے آتے ہیں۔ کسی فیکٹری میں مشین چلا کر یا پراندے' آزار بند بنا کر؟۔۔۔ نہیں' یہ ساری میری کمائی ہے' ہتھ محنت سے تو لاہور شہر میں ویگنوں کا کرایہ بھی پورا نہیں پڑتا۔ یہ گھر کا خرچہ' پاپا کے سگار اور رم' بھابی بچوں کے لئے تحائف' کپڑے' جیولری' پرفیوم۔ مری اور بھوربن۔۔۔ بنو! سمجھدار بنو۔۔۔''

اس لمحہ نگہت اس کے دیئے ہوئے نوٹ واپس کر آئی تھی مگر آج کتنے عرصے کے بعد وہ پھر اسی دروازے پہ رکشہ روکے' بیٹھی سوچ رہی تھی۔ بہت عرصہ پہلے گڈو کی کہی ہوئی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ سرکاری یا نیم سرکاری ملازموں کے حلیوں کی طرح ان کی سرکاری رہائش گاہوں کی حالتیں بھی کبھی نہیں بدلتیں۔ تاوقتیکہ وہ ملازمتوں سے ریٹائر یا معطل نہ کر دیئے جائیں۔ لوکو مکینک کی زنگ آلود نیم پلیٹ' شکستہ سے دروازے پہ لگی تھی۔

''آپ نے یہاں اترنا ہے یا رکنا ہے۔۔۔؟'' رکشہ ڈرائیور پوچھنے لگا۔

''ہاں' ذرا رکو۔۔۔''

نگہت نے بمشکل اترتے ہوئے جواب دیا۔۔۔ دروازہ کھٹکھٹانے پہ گڈو ہی دروازے پہ نمودار ہوئی۔ نگہت تو مردانہ شلوار قمیض پہنے' منڈھے ہوئے سر پہ چادر اوڑھے ہوئے تھی۔ دیکھے ملے بھی ایک زمانہ گزر چکا تھا چنانچہ نہ پہچانتے ہوئے پوچھنے لگی۔



''کس سے ملنا ہے۔۔۔؟''

''گڈو! میں نگہت ہوں۔۔۔ رکشے والے کو فارغ کرو' پھر بتاتی ہوں کہ مجھے کس سے ملنا ہے۔''

وہ چھما رتے ہوئے وہیں اسے انگریزی میں گالیاں دینے لگی اور بولی۔

''تم اس وقت۔۔۔ یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے۔۔۔؟''

وہ اسے گھسیٹتی ہوئی اندر لے آئی۔ بوڑھا قیصر جیمس بجھا ہوا سگار انگلیوں میں دبائے صحن میں ایک جھولنے والی کرسی پہ خراٹے لے رہا تھا۔ رکشہ والے کو فارغ کرنے کے بعد انسٹینٹ کافی کے دو بڑے مگ اور بسکٹ سامنے دھر کر دونوں دکھڑوں کی کتاب کھول کر بیٹھ گئیں۔ گڈو آنکھیں پھاڑے ہوئے سنتی جا رہی تھی اور وقفے وقفے سے ''او' مائی گاڈ!'' بھی کرتی جا رہی تھی۔ ساری رات سناتے سناتے زبان' سنتے سنتے کان' جاگتے روتے روتے آنکھیں اور بیٹھے بیٹھے کمر' سب کا برا حال ہو گیا۔ صبح ہوئی تو یہ دونوں ناشتہ کر کے' منہ سر لپیٹے ساندے آ گئیں۔ معلوم ہوا کہ اس کی بہنوں کو اس کا ماموں لے گیا ہے۔ کھڑے کھڑے در و دیوار پہ حسرت کی نظر ڈالی۔ گڈو نے اسے دلاسا دیا کہ چلو اچھا ہوا' بہنیں محفوظ جگہ پہ چلی گئیں۔۔۔ اداس اداس دونوں واپس کوارٹر چلی آئیں۔

☆☆☆

رمضان المبارک' رحمتوں کا مہینہ! شیطان پابہ زنجیر' بلکہ اس دنیا میں ہی جہنم کے شعلوں ں جھلس رہے تھے۔ والٹن میں فوجی بارک کا جہنم' اردگرد پولیس کا زبردست پہرہ' مختلف رکاری' نیم سرکاری حساس اداروں کے ذمہ دار افراد' ڈاکٹر' ایمبولینس گاڑیوں کی خفیہ آمد نت' اردگرد دور دور تک جراثیم کش ادویات اور چونے کا چھڑکاؤ جیسے یہ آفت زدہ علاقہ ۔۔۔ اندھے شیشوں کی ایک گاڑی اس ایریا میں نہایت خاموشی سے داخل ہوئی۔ ڈیلاس ے ڈاکٹروں کا ایک چھ رکنی وفد آیا تھا' ان کے ساتھ کچھ مخصوص آلات اور مشینیں تھیں۔ ب اور بیرک کو مقامی انتظامیہ کی مدد سے ایک اچھے خاصے آپریشن تھیٹر میں تبدیل کر دیا گیا ۔ ان کے پہنچنے کے ایک گھنٹہ بعد ایک متروک ایئرپٹی پہ ایک ٹرانسپورٹ طیارہ لینڈ ہوا' بائل فریزر یونٹ میں دو محفوظ لاشیں اتار کر آپریشن تھیٹر میں پہنچا دی گئیں جہاں پہلے ہی ۔ لاش موتیاں جان کی پڑی ہوئی تھی جو آج صبح ہی چھ بجے ایڑیاں رگڑتے ہوئے واصل ں ہوئی تھی۔ باقی مریض بھی قریب قریب جان کنی کے عالم میں زندگی کی آخری سانسیں یٹ رہے تھے۔ نشہ نہ خوراک' مختلف میڈیکل معائنوں کے عذاب نے انہیں بے حال کر

دیا ہوا تھا۔ ان کے جسموں کے نازک حصے گلنا سڑنا شروع ہو چکے تھے۔ زبانوں پہ چھالے ہونٹ سرخ بوٹی بن کر سوج گئے تھے۔ بات کرنا تو درکنار' ہلنے جلنے سے بھی معذور تھے۔ پولیس ابھی تک ان سے کوئی قابل رفت بیان نہیں لے سکی تھی۔ ان لوگوں میں حساس اور خطرناک قسم کے مریض جن میں حکیم جمالی' ظہوری شاہ' استاد قربان' استاد شفو' رفیق ڈوگر اور مس عاشی بھی شامل تھی' انتہائی نگہداشت کے یونٹ میں تھے۔ اس یونٹ سے ہٹ کر ایک بیرک جو کسی زمانے میں شہری دفاع کے رضاکاروں کی ٹریننگ اور عارضی رہائش کے کام آتی تھی اور جس میں ہوسٹل کی طرح علیحدہ علیحدہ کمرے تھے ان میں شایان' منشی کرم الٰہی' دو ملازم ظہوری شاہ اور حکیم جمالی کے ملازم' استاد شفو کے چیلے چانٹے' گٹی چوک اور شاہی محلے کے چند بدمعاش' موتیاں جان کی دو جوان بہنیں اور بھائی' حاجی رجی بیگم کے چند شاگرد کھسرے اور چند ادھر ادھر کے لوگ کبوتروں کی طرح الگ الگ کمروں میں دبکے پڑے تھے۔ ہر دروازے پہ پہرہ تھا' بات چیت کی ممانعت تھی۔ پولیس باری باری سب سے تفتیش کر رہی تھی' میڈیکل یونٹ والے ان کے مختلف ٹسٹ لے رہے تھے۔ ابھی تک کی رپورٹوں سے ان لوگوں میں کوئی خطرناک علامت نہیں پائی گئی تھی۔ پولیس کی ابھی تک کی تفتیش سے بھی اس خیال کو تقویت پہنچتی تھی کہ یہ سارے لوگ "شامل باجا" ہیں جو مختلف وجوہ کی بنا پر ان کے ساتھ تھے' اصل مہرے وہی ہیں جو مکافات عمل کی بساط پہ الٹے پڑے ہیں۔ یہ سب کچھ اتنا خفیہ تھا کہ گرفتار شدگان کے لواحقین' پریس' یہاں تک نچلی سطح کے پولیس افسران کو بھی خبر نہیں تھی۔ کچھ اخبار والے اپنے خاص ذرائع سے چھوٹی موٹی خبر لے اڑے تھے لیکن اصل معاملے سے عوام اور پریس دونوں بے خبر تھے۔

پولیس شمسہ کی تلاش میں ماری ماری پھر رہی تھی۔ مس عاشی اور ظہوری شاہ کے دفاتر سے برآمدہ ریکارڈ' ویڈیو فلموں اور تصویروں کے البموں میں شمسہ کا وجود موجود تھا۔ شامل تفتیش سبھی افراد نے شمسہ کی نشاندہی کی تھی۔ پولیس کی نظر میں وہ سب سے زیادہ خطرناک مریضہ تھی جو ریکارڈ کے مطابق ہر رات مختلف لوگوں کے لئے بدکاری کا سبب بنتی تھی۔ منشی کرم الٰہی نے بھی نشاندہی کر دی تھی' یہ بات بھی ثابت ہو گئی کہ یہ مرض شمسہ سے ابتدائی زیادتی کی وجہ سے سب لوگوں تک پہنچا ہے۔ اس سارے کھیل میں کئی مردوں کے مقابل صرف تین ہی عورتیں سامنے آتی تھیں۔ موتیاں جان تو جان سے چھوٹ گئی' وہ صرف شہزاد تک محدود رہی۔ مس عاشی بھی شہزاد کی حد تک رہی اور باقی بچی شمسہ! تو اس بیماری کے ساتھ غریب کی جورو والا حساب تھا۔ اس کا دماغی طور پہ ابنارمل اور منشیات کا عادی ہونا بھی منظر عام



پکا تھا۔ ہسپتال' دماغی شفاخانے' رفاعی ادارے' ادھر ادھر ساری جگہیں جہاں کہیں اس کی موجودگی کا شبہ ہو سکتا تھا وہ سب چھان مارے مگر وہ کہیں بھی دستیاب نہ ہو سکی۔ پولیس کے لئے اس کو قابو کرنا بہت ضروری تھا۔ بیانات اور واقعات کی روشنی میں یہ بات تو پولیس جان چکی تھی کہ عامل ظہوری شاہ کے دفتر چھاپے کے وقت شمسہ اوپر فلیٹ میں اپنے تین نگران کھسروں کے ساتھ موجود تھی' چھاپے کی ہڑبونگ کے بعد اسے وہاں سے نکالا گیا۔ مارکیٹ میں متعین سپاہیوں کے بیان کے مطابق دو تین کھسرے ضرور باہر گئے تھے مگر ان میں لڑکی کوئی نہیں تھی۔ اب سوال یہ اٹھتا تھا کہ شمسہ کہاں گئی' وہ تو ذہنی طور پہ معذر تھی' اپنی مدد آپ نہیں کر سکتی۔ وہ کون ہے جس نے اسے وہاں سے نکالا اور وہ اس وقت کہاں ہے؟ اس معمہ کو حل کرنے کے لئے پولیس ہاتھ پاؤں مار رہی تھی۔

شایان کے والدین اپنی تینوں بیٹیوں کے ہمراہ نین تارا کے گھر پڑے ہوئے تھے' بار بار قاسم اور زلفی کو لے بیٹھ جاتے کہ کسی بڑے سے بڑے وکیل سے مشورہ کرو۔ اکلوتا بیٹا تھا' بوڑھی ماں کو کسی کل چین نہیں آتا تھا۔ یہ بچارے پریشان حال' جو بس اور اختیار میں تھا' کر رہے تھے۔ ادھر زلفی خود بڑے عذاب میں مبتلا تھا۔ گھر میں والد صاحب کو جیسے چپ سی لگ گئی تھی۔ کھانا پینا برائے نام رہ گیا۔ کسی سے بات نہیں کرتے تھے' ہر وقت خلاؤں میں گھورتے رہتے۔ مصیبت پہ مصیبت--- بڑی امی مر گئیں' ادھر نگہت ہاتھ میں آئی ہوئی نکل گئی۔ اب پتہ نہیں کہاں اور کس حال میں ہو۔ جان سے پیارا بھائی دوست شایان بھی گرفتار--- اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اوپر سے رمضان کا مہینہ۔ پیلا ہلک رنگ' جیسے کسی نے جسم کا سارا لہو نچوڑ لیا ہو---

اگلے روز شام کی نماز کے بعد اچانک زلفی کے دماغ میں جیسے بجلی کا ایک کوندا لپکا' باباجی کا خیال آیا۔ شایان کے والد صاحب کو لے کر وہ پان والی دکان پہ آیا۔ باباجی کا پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ مسجد میں ہیں۔ مسجد میں پہنچے تو وہ سامنے ہی بیٹھے ہوئے نظر آ گئے۔ سلام کر کے دونوں پاس بیٹھ گئے۔

"فرمایئے' کیسے آنا ہوا---؟" انہوں نے بڑی شفقت اور اپنائیت سے پوچھا۔

"باباجی! میرا نام ذوالفقار ہے۔ یہ میرے پھوپھا ہیں' شایان صاحب کے والد۔ وہ آپ سے ایک دو بار مل چکا ہے--- بس! آپ کی زیارت اور دعا کے لئے حاضر ہوئے ہیں۔ ہم بہت پریشان ہیں---"

"آپ صبر سے کام لیں' اللہ بہتر کرنے والا ہے--- تراویح کے بعد آپ سے بات ہو

گی۔"

نماز ختم ہوئی تو وہ انہیں ایک کونے میں لے کر بیٹھ گئے--- شایان کے والد سسکیوں سے رونے لگے۔ وہ ان کے کندھے پہ شفقت بھرا ہاتھ رکھتے ہوئے فرمانے لگے۔

"وہ شکم بندی، فکر مندی، شب بیداری اور آہ وزاری--- چاند کی دید پہ ہی عید ہوتی ہے۔ سینوں سے سینے ملتے ہیں، خوشیوں کے پھول کھلتے ہیں--- جایئے، اللہ بہتر کرے گا۔"

زلفی نے مزید کچھ کہنا چاہا۔

"بس، آپ تشریف لے جائیں---" انہوں نے جیسے قطعیت سے کہا۔

★★★

گڈو نے نگہت کے آتے ہی اپنی تمام مصروفیات وقتی طور پر ختم کر دی تھیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بنیادی تعلیم ہی یہی تھی کہ دکھیوں، بیماروں، لاچاروں اور مجبوروں کی دا رسی کی جائے۔ اپنی زندگی میں وہ انہی بے کس، ٹھکرائے ہوئے، دھتکارے ہوئے لوگوں کے درمیان رہے اور بلا تکلف و تردد، امتیاز واحتیاط ان کے رستے ہوئے ناسوروں پہ دست مسیحا رکھتے رہے اور انہی کی خاطر مصلوب ہو گئے۔ آج بھی دنیا میں دکھی انسانیت کی خدمت کے لئے جتنے شفاخانے، انسانی بہبود کے ادارے مسیحی قوم نے بنائے ہیں اتنے تمام اقوام عالم کے غ مسیحی مذاہب نے نہیں بنائے۔ دنیا کے نقشے پہ ایسی کوئی جگہ آپ کو دکھائی نہیں دے گی جہا ان کے بے لوث خدمت گار، بلا تخصیص وامتیاز مذہب و نسل، رنگ و زبان انسانیت کی خدمت میں جتے ہوئے نظر نہ آئیں۔ یہ یسوع مسیح کی تعلیمات کا ہی اثر ہے کہ انسانوں علاوہ اللہ کی باقی مخلوق چاہے وہ بظاہر حقیر سے حقیر جانور ہی کیوں نہ ہو، اہم جاندار جان کر ان دل وجان سے خدمت اور حفاظت کرتے ہیں۔ ان کی بہبود کے لئے بڑے بڑے ادارے ٹرسٹ، ہوسٹل اور ہسپتال بنا رکھے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے کام جنہیں دوسرے لوگ حقیر گر اور نجس خیال کرتے ہوئے اپنے ہاتھ سے کرنے میں عار محسوس کرتے ہیں، ان کے لئے یہ کا بھی انسانیت کی خدمت کا ایک حصہ ہیں جنہیں بلا جھجک وخفت سر انجام دینے میں ان ماتھے پہ بل تک نہیں آتا۔

نگہت کے مرض کی سنگینی کا گڈو کو اندازہ ہو گیا تھا۔ اس کی زبانی اور اخبارات کی وساطت سے اسے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ پولیس اس کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ اسی احساس کے پیش نظر اس نے اس کی حفاظت اور علاج کا پروگرام بڑی احتیاط اور انتہا راز داری سے ترتیب دیا تھا۔ گو اس میں بڑا رسک تھا، وہ خود بھی پھنس سکتی تھی مگر کیا کیا جائے کہ ایسے چیلنج قسم



خطرات میں اس کی کھوپڑی الٹی ہو جاتی تھی۔ وہ کسی کو مصیبت میں دیکھ ہی نہیں سکتی تھی اور نگہت تو اس کی جان، اس کی دوست، اس کی ہمراز تھی۔ راز داری اور احتیاط کے پیش نظر کسی اور کو تو کیا، اپنے ڈیڈی اور بھائی بھابی تک کو اس نے ہوا نہ لگنے دی، خود ہی جی جان سے اس کی تیمارداری اور علاج پہ جت گئی۔ باباجی کے سمجھ میں نہ آنے والے عجیب وغریب علاج پہ اسے تامل تو ضرور تھا مگر نگہت کے یقین اور اصرار کو دیکھتے ہوئے بادل نخواستہ تیار ہو گئی۔ تمباکو کی آمیزش سے دس سیر پانی پکایا گیا، ہدایت کے مطابق وقفے وقفے سے پلانا شروع کر دیا۔ ادھر نیم کے پتے اور اس کے مونڈے ہوئے بال جلا کر راکھ کئے، روئی کے پھاہے پہ چھڑک کر اسے استعمال کراتی رہی۔ ہر آدھ گھنٹے بعد بدبو، سڑاند، پیپ--- نگہت کڑوا عجیب سی بدبو والا بدمزہ پانی پی پی کر پیلی پھٹک ہو رہی تھی البتہ راکھ کا استعمال قدرے سکون پیدا کرتا۔ سولہ پہر، سولہ صدیوں پہ پھیل گئے تھے۔ نیند نہ آرام، جھولنے والی کرسی پہ نیم دراز نگہت بے سدھ پڑی تھی اور وسکی سپ کرتی ہوئی گڈو اسٹول پہ اکڑوں بیٹھی، پاؤں سے اس کی کرسی کو جھولا دے رہی تھی۔

چوتھے روز کے چمکتے ہوئے سورج نے گڈ کے آنگن میں اجالا کیا تو نگہت کسی معصوم بچے کی مانند بڑے سکون سے کرسی کے بیک پہ ٹیک لگائے سو رہی تھی۔ گڈو جو اڑتالیس گھنٹوں سے جاگ رہی تھی، اسے میٹھی میٹھی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ راکھ باقی تھی، پانی ختم ہو چکا تھا۔ گڈو آہستہ سے اٹھی۔ پتلی سی اونی چادر اس کے گھٹنوں پہ پھیلا کر ماتھا چوما اور صوفے پہ دراز ہو گئی--- دوپہر سے ذرا پہلے نگہت بیدار ہوئی، سامنے صوفے پہ گڈو سو رہی تھی لبوں پہ میٹھی سی نرم مسکراہٹ لئے جیسے کوئی سہانا خواب دیکھ رہی ہو۔ کرسی کی بیک پہ سر ٹکائے وہ کافی دیر تک اپنی مسیحا کو دیکھتی رہی۔ اسے محسوس ہوا کہ اب اس کی تکلیف میں وہ شدت نہیں رہی جو پہلے تھی، کمزوری اور نقاہت ابھی تک باقی تھی لیکن قدرے سکون اور آرام محسوس کرتے ہوئے وہ اٹھ بیٹھی۔ آہستہ آہستہ سرک کر وہ باتھ روم میں چلی گئی تبھی باہر کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا تو ہڑبڑا کر گڈو اٹھی۔ ادھر ادھر دیکھا، نگہت کی کرسی خالی تھی۔ باتھ روم میں پانی کے چھپاکوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔

"نگہت! طبیعت ٹھیک ہے نا---؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں، میں آ رہی ہوں---" نگہت نے جواب دیا۔

دروازے پہ اس کا ڈیڈی تھا، کھانے پینے کا سامان اور اخبار لے کر آیا تھا۔ یہ چیزیں گڈو کو تھما کر، وہیں سے چلا گیا۔ اخبار میں آج پہلی بار نمایاں طور پر اس کیس کے بارے میں تفصیلات

لکھی تھیں۔ گڈو اخبار لے کر بیٹھ گئی۔ پھر اچانک اٹھ کر کھڑی ہو گئی جیسے صوفے پہ لگے کسی
طاقتور اسپرنگ نے اسے اچھال دیا ہو مگر وہ اسپرنگ نہیں تھا بلکہ نگہت کی تصویر تھی۔ یہ تصویر
پولیس نے شاید ظہوری شاہ یا حکیم جمالی کی کسی البم سے حاصل کی تھی' قدرے دھندلی لیکن
واضح۔ پولیس نے عوام کے وسیع تر مفاد کے پیش نظر' اس لڑکی کو تلاش کرنے یا اس کے
بارے میں کسی قسم کی کوئی اطلاع فراہم کرنے کے لئے اپیل کی تھی۔ اطلاع بہم پہنچانے والوں
کے لئے انعام' رازداری اور تعاون کے علاوہ مکمل حفاظت کی ضمانت دی گئی تھی۔ خبر اور
تصویر دیکھ کر گڈو بھی حیرت کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ اتنے میں نگہت بھی غسل خانے سے فارغ
ہو کر اس کے سر پہ آ کھڑی ہوئی' گڈو نے اخبار لپیٹ کر گود میں رکھ لیا۔

"اخبار پڑھ رہی ہو--- کوئی خاص خبر؟"

"پہلے یہ بتاؤ' تمہاری صحت کیسی ہے---؟" وہ اسے آرام کرسی پہ بٹھاتے ہوئے پوچھنے
لگی۔

"بہت بہتر---"

"یہ تو بہت بڑی خوشخبری ہے' تھینکس گاڈ!"

"زبردست بھوک لگی ہے' فوراً کچھ کھلاؤ---"

وہ اخبار سمیت باورچی خانے میں جانے لگی تو نگہت نے کہا۔

"یہ اخبار تو مجھے دیتی جاؤ---"

"نہیں--- پہلے کچھ کھا پی لو' پھر---"

کھانے کے بعد گڈو کہنے لگی۔

"دیکھو' نگہت؟ گاڈ نے تمہیں صحت دی اور تمہارے یقین نے تمہیں نئی زندگی
دی---"

نگہت مسکراتے ہوئے کہنے لگی۔ "اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے اور گڈو! تمہارا احسان---!"

"میں بیچ میں کدھر سے آ گئی---؟" گڈو بولی۔

نگہت اس کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے بولی۔ "تم بہت ہی گریٹ ہو گڈو! بہت ہی
گریٹ---"

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے--- کافی کا مگ سامنے رکھ کر گڈو نے اخبار اس کی جھولی
میں پھینک دیا۔ اپنی تصویر دیکھ کر حیرت اور خوف سے نگہت کی آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ
لرزنے لگی' مہین سی آواز میں پوچھنے لگی۔



"اب کیا ہو گا گڈو---؟"

گڈو اخبار پرے ہٹاتی ہوئی تسلی دینے لگی۔ "ڈونٹ وری' بے بی! کچھ بھی نہیں ہو گا بلکہ
ہمارے لئے اور ایزی ہو گیا ہے---"

"---ایزی ہو گیا ہے یا قیامت ٹوٹ پڑی ہے؟--- یہ اخبار صرف ایک ہی نہیں چھپا'
ھوں لوگ یہ سب کچھ پڑھ چکے ہوں گے۔ ان میں میرا باپ' ماموں' بہنیں' بھائی اور شاید
یان بھی ہو گا۔ لوگ نفرت سے میرا ذکر کر رہے ہوں گے' مجھ پہ لعنتیں بھیج رہے ہوں گے'
ے تلاش کر رہے ہوں گے۔" وہ رونے لگی۔

گڈو غصے سے کانپتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔ "دیکھو' نگہت! اگر تم نے اس موقع پہ یہی کچھ
رنا ہے اور بے وقوفی سے بنا بنایا کام بگاڑنا ہے تو تمہارا میرا راستہ الگ ہے کیونکہ تم اس طرح
ل اور بے وقوفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے ساتھ مجھے بھی مرواؤ گی--- سنو! اگر قسمت
ی ذلت اور مرنا لکھا ہے تو میں تمہارے ساتھ مروں گی لیکن مجھے تمہاری کسی حماقت کی
ے ایسا ہوتا ہوا نظر آیا تو میں خود اپنے ہاتھوں سے تمہارا گلا دبا دوں گی---"

نگہت آنسو پونچھتے ہوئے کہنے لگی۔ "میرا گلا دبا ہی دو تو بہتر ہے لیکن ایک بات کا جواب
- جو کچھ میں نے کہا ہے' وہ کیا غلط ہے--- اگر کسی کو پتہ چل جائے کہ میں تمہارے پاس
ل تو--- تو تمہارا یا میرا حشر کیا ہو گا؟"

گڈو نے گھوم کر ایک بھرپور تھپڑ اس کے دائیں گال پہ جڑ دیا' زناٹے کی بازگشت دیر تک
وٹے سے کمرے اور نگہت کے کانوں میں گونجتی رہی۔ وہ دانت پیستے ہوئے اسے سمجھانے
ا۔ "--- نہ تم یہاں موجود ہو' نہ تمہارا نام نگہت یا شمسہ ہے اور نہ ہی تم وہ مریضہ ہو جس
ی تلاش میں پولیس نے یہ اپیل شائع کروائی ہے--- سمجھیں؟"

گڈو سر تھام کر صوفے پہ ڈھیر ہو گئی' نگہت گال پہ ہاتھ رکھے ماضی میں اتر گئی--- پہلا
ڑ' اس کی ماں نے ٹھیک اسی جگہ جڑا تھا۔ ایک روز نشے میں دھت وہ گھر آئی تھی' شاید اسی
ارہ نشے کی ایسی کیفیت اور ضرورت سے آشنا ہوئی تھی۔ ماں نے دو ہتھڑ پیٹتے ہوئے اسے
ائیں دی تھیں۔ اپنی بے چارگی' حالات' بڑھاپے اور بیماری کا رونا رویا تھا۔ ماں کے دکھ'
ت کی درماندگی اور تھپڑ کی چوٹ کو سہلاتے ہوئے وہ باہر نکل گئی تھی اور یہ سب کچھ
لانے کے لئے اسے پھر نشے کی ضرورت محسوس ہوئی تھی۔ اسی دن وہ ایک بار پھر ایک' دو
ا کیں اکٹھی نگل گئی تھی۔ دکھ' درد' چوٹ' سب کچھ بھول گئی اور ایسا بھولی کہ اپنا آپ ہی
ل گئی۔ کچھ بھی تو یاد نہ رہا--- ذہن کی سوئی پھر آگے بڑھی' دوسرا تھپڑ بھی یاد آ گیا جو ریس

کورس پارک میں جھیل کنارے ٹیلے پہ شوکت نے مارا تھا۔ عجیب سا مرد تھا یا مرد تھا ہی نہیں۔ پرس پھینک گیا' بدن کو ہاتھ تک نہیں لگایا اور تھپڑ لگا کر چلا گیا--- تیسرا تھپڑ اور چھت اچانک منہ سے بھائی جان نکل جانے پہ شایان نے لگایا تھا اور آج چوتھا تھپڑ گڈو نے جمایا۔ ہلکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پہ پھیل گئی۔

"آئی ایم سوری' نگہت! مجھے معاف کردو' مجھے ایسے نہیں کرنا چاہئے تھا---"

گڈو اپنے ہاتھ کو زور سے کرسی کی ہتھی پہ مارتے ہوئے گڈو معذرت کرنے لگی تو نگہت نے اس کا ہاتھ پکڑ کر چومنا شروع کردیا۔

"نہیں' گڈو! معذرت کی ضرورت نہیں۔ تمہیں ایسا کرنے کا پورا پورا حق ہے' معافی تو مجھے مانگنی چاہئے--- میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ آئندہ میری زبان سے کبھی کوئی ایسی بات نہیں نکلے گی جس سے تمہاری دل شکنی ہو--- وعدہ!"

گڈو بڑے گمبھیر لہجے میں کہنے لگی۔ "سنو! جب نگہت گھر سے نکلی تھی' آدھی مر چکی تھی اور جب آدھی نگہت' شمسہ کے روپ میں وہاں سے نکلی تو پوری مر چکی تھی۔ اب تم نیا نام' نئی شخصیت' نئی زندگی اور نیا مقصد لے کر جیئو گی--- ماضی ختم ہو چکا' تمہیں اب کوئی نہیں جانتا۔ آج سے تم جان ہو' جان پیٹر' تم عیسائی ہو--- بال ہمیشہ مونڈھ کر رکھو' کرسچین چھوکروں کی طرح جین جیکٹ اور گلے میں صلیب پہنو۔ سگریٹ اور بیئر پیؤ' روزانہ چہرے اور بازوؤں کی شیو کرو۔ کراٹے اور موٹر بائیک سیکھو---"

"مگر میرا جسم--- شکل--- آواز؟" نگہت نے پریشان ہو اٹھی۔

"یہ سب کچھ بدل جائے گا گڈو سرگوشی کے انداز میں کہنے لگی--- میں تمہیں آج ہی لے کر کراچی جا رہی ہوں۔ وہاں میری ایک دوست ہے۔ تم اسے دیکھ کر یقین نہیں کرو گی کہ وہ بھی کبھی ایک لڑکی تھی مگر حالات' طبیعت اور مجبوری نے اسے لڑکا بننے پہ مجبور کر دیا--- لڑکوں کی طرح ورزش کرتی ہے' لڑائیاں اور جھگڑے اس کا روزمرہ کا معمول ہیں۔ اونچے ہوٹلوں میں کال گرلز سپلائر ہے۔ وہ تمہیں چند دنوں میں ایک خونخوار لڑکے میں تبدیل کر دے گی' ایسا کہ تم خود بھی اپنے آپ کو پہچان نہ پاؤ گی۔ یوں بھی اب تمہارا یہاں مزید رہنا خطرے سے خالی نہیں--- کراچی بہت بڑا شہر ہے' اس کے دامن میں بڑی وسعت اور گنجائش ہے وہاں ہمیں کوئی نہیں پہچان پائے گا اور نہ ہی کوئی تکلیف پریشانی ہو گی---

"آج میری تصویر چھپی ہے' ممکن ہے کہ ریلوے اسٹیشن اور ہوائی اڈے پہ میری نگرانی ہو رہی ہو؟" نگہت نے اپنا خدشہ بیان کیا۔



"تم اس کی فکر نہ کرو' میں تمہارے ساتھ ہوں--- وہ تمہاری پرانی تصویر ہے۔" وہ اخبار کھول کر' اسے اس کی تصویر دکھانے لگی۔ "دیکھو' شیشے کے سامنے کھڑی ہو کر اس تصویر اور اپنی موجودہ شکل کا موازنہ کرو۔ بیمار رہنے سے تمہاری صورت بہت بدل گئی ہے۔ تمہارے سر کے مونڈے ہوئے بال--- اور جب تم جین جیکٹ پہن کر چشمہ لگا کر چیونگم چباؤ گی تو کون تمہیں پہچانے گا؟" گڈو نے اسے تسلی دی۔

گڈو کے بھائی کی پینٹ شرٹ اور لیدر جیکٹ اسے بالکل فٹ آئی تھی۔ لانگ شوز' گلے میں لاکٹ۔ چہرے پہ آنکھوں کے نیچے ہلکے سے براؤن شیڈ لگائے' ہاتھ میں سگریٹ لئے اسی رات' آخری فلائٹ سے وہ دونوں کراچی جا رہی تھیں۔

★★★

عروس البلاد' کراچی! مصنوعی روشنیوں اور حقیقی اندھیروں کا شہر۔ جس کا یک رنگی موسم سب موسموں کا منافقانہ رنگ ہے۔ برق رفتار' خود غرض' بے مروت! دس آدمی اکٹھے کرو تو دس مختلف زبانیں اور لہجہ' دس مختلف لباس۔ نرگسی کوفتے ہوں یا چکن کری' سب میں مچھلی کی بساند۔ گاؤ زبان کی بوٹیاں نکال دو تو خشکا' نہ نکالو تو بریانی۔ چنے' ماش کی ربڑی میں اوجڑی ابال دو تو حلیم اور نہ ڈالو تو بگھاری دال تڑکا۔ مختلف مذاہب' زبانوں' ثقافتوں اور کثافتوں کا عجوبہ۔ سیاسی' سماجی' لسانی اور انسانی مسائل کی دلدل اور دہشت' وحشت' افراتفری' بے چینی کی آماجگاہ!

ایئرپورٹ پہ ماڈرن سے دو لڑکے اور ایک خوبصورت مگر ادھیڑ عمر کی عورت ان کے استقبال کے لئے موجود تھے۔ گلے ملے' پیاری پیاری گالیوں کے تبادلے ہوئے اور وہیں کھڑے کھڑے تعارف ہوا۔

"یہ ٹینا ٹوٹو' میری پیاری سہیلی--- یہ جوزف' پاپ سنگر اور میوزیشن--- اور یہ ریڈ روز---" پھر وہ نگہت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بتانے لگی۔ "یہ میرا فرینڈ' جان--- پیٹر جان!"

ہائے ہائے کی ہاؤ' ہو کے بعد وہ لوگ ٹاپ فلور پر ریسٹوران میں آ گئے۔ کافی سامنے رکھ کر شکوے شکایات کی پٹاری کھول کر بیٹھ گئے۔ قہقہوں' گالیوں اور جی بھر کر باتوں کے بعد وہ لوگ اٹھے اور چند منٹوں کے بعد ٹینا ٹوٹو کی پرانی فوکسی پیر الٰہی بخش کالونی کی جانب اڑی جا رہی تھی۔ اترے ہوئے شیشوں سے نم دار ہوا کے جھونکوں سے محظوظ ہوتے ہوئے گڈو کہنے لگی۔

"ٹوٹو! یہ تیری اولڈ فوکسی تو ابھی تک خوب چل رہی ہے۔۔۔؟"

"ہاں، یار! کبھی کبھی اَڑی کرتی ہے مگر پھر خود ہی ٹھیک ہو جاتی ہے، بڑی مُوڈی ہے۔" وہ سگریٹ کا دھواں اڑاتے ہوئے مزید بتانے لگی۔ "پرانی کار اور پرانی عورت وفاداری نہیں، کاٹھی کی بھی مضبوط ہوتی ہے۔۔۔ دیکھ لو، بیس سال پرانی ہے مگر کاٹھی اک دم مضبوط۔ سٹرانگ!"

"تیری طرح۔۔۔" ریڈ روز بولا۔

"روزی! یو شٹ اپ۔۔۔" ٹوٹو نے اسے پیار سے جھاڑ پلائی۔

جان، یعنی نگہت نے پہلی بار غور سے ریڈ روز کی جانب دیکھا جو ٹوٹو کے ساتھ والی سیٹ پہ بیٹھا ہوا تھا۔ سانڈ کی مانند موٹی سی گردن، چوڑی چھاتی جس پہ ڈائمنڈ جڑی سونے کی صلیب جھول رہی تھی۔ پھڑکتی مچھلیوں والے مضبوط بازو، کاؤ بوائے کٹ بال۔۔۔ اچھا تو یہ وہ چیزیں جن کا تعارف گڈو نے لاہور کروایا تھا، اس نے سوچا۔

★★★



یہ ہٹا کٹا غنڈہ دکھائی دینے والا کبھی ایک معصوم سی اینگلو انڈین لڑکی روزی تھی جس کا باپ بھی کسی زمانے میں این ڈبلیو ریلوے، لاہور ریجن کا انجن ڈرائیور تھا۔ بچپن میں گڈو اور روزی ایک سکول اور کلاس میں پڑھتی تھیں۔ روزی کا باپ ریلوے کے ایک حادثے میں مارا گیا۔ ریلوے سے ایک موٹی رقم اور پنشن حاصل کرنے کے بعد اس کی نوعمر بیوہ کچھ عرصہ تو لاہور میں ہی رہی اور پھر ایک شیئر بروکر کے عشق میں مبتلا ہو کر کراچی شفٹ ہو گئی۔ روزی نے نین نقش اور قد کاٹھ نکال لیا تھا۔ یہاں بھی وہ ایک مشن اسکول میں داخل کرا دی گئی۔ ماں کی ڈھلتی اور روزی کی کڑی دھوپ کی مانند چڑھتی ہوئی جوانی نے سوتیلے شرابی اور عیاش باپ کی آنکھوں میں چکاچوند سی پیدا کر دی۔ وہ اب اپنی بیوی سے زیادہ اس کی بیٹی پہ مہربان رہنے لگا۔ کپڑے، گفٹ، سیر سپاٹے، سینما، ہر وقت اسے خوش رکھنے کی کوشش میں رہتا۔ روزی کی ماں خوش اور مطمئن تھی کہ یتیم بچی کو باپ کا پیار مل گیا ہے۔۔۔ وقت دھیرے دھیرے آگے کی طرف سرکتا رہا۔ کلی کے غنچہ بننے کے انتظار میں اس نے بڑا لمبا عرصہ صبر کیا تھا۔ اس سے پیشتر کہ آتشِ ہوس اس کو جلا کر راکھ کر دیتی، اس نے ایک رات اس پر گرفت کر لی۔۔۔

★★★

وہ کرسمس کی رات تھی۔ ہاکس بے کے ساحل پہ جشن بپا ہوا تھا۔ سینکڑوں لڑکیاں لڑکے، بڈھے جوان پینے پلانے اور ناچنے گانے میں مگن تھے۔ کسی کو کسی کا ہوش، کسی رشتے ناطے کا احساس، یا کسی چھوٹے بڑے کا امتیاز نہ تھا لیکن وہ اتنا بھی بے ہوش نہیں تھا کہ قیمتی لمحوں کو وقتی بدمستی میں ضائع کر دیتا۔ موقع پاتے ہی وہ روزی کو دبوچ کر سمندر کنارے ایک ٹیلے کی اوٹ میں لے گیا۔ روزی بھی اتنی مدہوش اور معصوم نہ تھی کہ وہ اس کے ارادے کو نہ سمجھ سکتی۔ چیخی چلائی، مچلی تڑپی مگر اس خرابۂ ہنگام میں اس معصوم چڑیا کی چوں چوں سننے کی کسے فرصت تھی جبکہ چڑیا کی ماں بھی چند قدم پرے ایک فائیو سٹار ہوٹل کے ہیڈ بٹلر کے ساتھ داد

عیش دے رہی تھی۔ پاپ میوزک کے شور میں نوعمر روزی کی ایک ایک کرکے ساری سسکیاں دم توڑ کر رہ گئیں۔ شیئر بروکر نے سنبھال کر رکھے ہوئے اس چھوٹے سے شیئر سرٹیفکیٹ کو اچھے خاصے منافع پہ کیش کر لیا تھا۔۔۔۔ سمندر کنارے جوار بھاٹا اترا۔ الاؤ ٹھنڈے' بوتلیں ختم اور سرور ٹوٹنے لگے تو روزی کے غصے میں بھی تبدیلی آئی' سوچ اور انداز فکر بھی بدل گیا۔

اس نئی صبح وہ جیسے ایک نئے انسان میں تبدیل ہو چکی تھی۔ رشتوں' ناطوں' پیار' محبت' شفقت پہ سے اس کا ایمان اُٹھ گیا۔ وہ اپنی آنکھوں سے اپنی ماں کی مصروفیات' شغل شوق بھی دیکھتی رہتی اور سوتیلے باپ کو بھی جان چکی تھی۔ کچا پکا ذہن' کاپیاں کتابیں لکھنے پڑھنے کی عمر۔ ماں باپ سمجھتے ہیں کہ ان کے بچے ابھی معصوم' ناسمجھ ہیں مگر نہیں۔ ہر بچہ جو آنکھ' کان اور دماغ رکھتا ہے وہ ہر اچھی بری بات کو مکمل سمجھتا ہے مگر وہ اس کا اظہار نہیں کر سکتا' ضرورت محسوس نہیں کرتا یا وہ کرنا نہیں چاہتا یا پھر وہ اپنی ذات کو برت نہیں سکتا۔ بچہ چلتا تو اپنے پاؤں پہ ہے مگر پھر بھی وہ کسی کی انگلی پکڑ کر چلنا زیادہ محفوظ تصور کرتا ہے۔ روزی نے اس حادثے کے بعد ان دونوں کی انگلیاں چھوڑ دی تھیں' خود اپنے قدموں پہ چلنے کا فیصلہ کیا۔ گھر میں رمی' برج' فلاش' بیئر' وسکی تو روزمرہ کے معمولات تھے۔ اتوار کو چرچ' ریس کلب' آؤٹنگ جس میں وہ خود شامل نہیں ہوتی تھی۔

چند دنوں بعد نئے سال کے روز وہ سر درد میں مبتلا تھی۔ وائی ایم سی اے کلب میں ہیپی نیوائیر کا ہنگامہ تھا۔ سر درد کی وجہ سے پاس پڑوس کی سہیلیوں کے ساتھ گھر پہ ہی تھی۔ رات ٹھیک ساڑھے بارہ اس کا سوتیلا باپ' شمپین کی بوتل اور کھانے پینے کا سامان لے کر گھر آیا' آتے ہی "ہیپی نیوائیر روزی" کہتے ہوئے بتایا کہ تمہاری ممی اپنے فرینڈز کے ساتھ ڈرنک کر رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ چلو' بے بی کے ساتھ نیوائیر سیلبریٹ کرتے ہیں۔۔۔۔ اس کی سہیلیوں کو بھی ایک ایک جام پلایا' برگر کھلائے۔ کچھ دیر بعد وہ چلی گئیں تو اس نے میوزک آن کر دیا' جیب سے کوارٹر سکاچ نکالی۔ ایک ڈبل نیٹ پیگ روزی کے لبوں سے لگا دیا۔ دوسرے پیگ کے بعد روزی خود ہی بہک گئی۔

☆☆☆

آدھی رات کہیں اس کی ممی' ایک نوجوان چھوکرے کی بانہوں میں جھولتی' لڑکھڑاتی اندر داخل ہوئی۔ یہ دونوں بے خبر' نشے میں ڈوبے ہوئے غالیچے پہ پڑے ہوئے تھے۔ قے کی غلاظت' الٹے سیدھے گلاس' برگروں کے ٹکڑے' غبارے' آرائشی جھنڈیاں جابجا بکھری پڑی تھیں۔ ممی ایک عجیب سی بے نیازی سے ان کی جانب دیکھتے ہوئے بیڈ روم میں گھس گئی۔۔۔



حجاب' ضرورت' خوف اور صبر بہت بڑے اعزاز یا آزار ہیں۔ ان کے توازن یا عدم توازن سے انسان ولی اللہ ہو سکتا ہے یا شیطان الرجیم۔۔۔۔ دونوں حالتوں میں پاؤں تلے تنی تار' ہاتھوں میں تھامے بڑا سالٹھ' توازن پہ قابو' دھیان اور اعتماد کا عمل دخل ہوتا ہے۔ کسی اِک وجہ سے غیر متوازن ہو کر کوئی نیچے گر جائے تو ہر چیز اس کے لئے بیکار اور غیر اہم ہو جاتی ہے۔ اس حادثے کے بعد روزی بھی جیسے سیدھی تار سے پھسل کر نیچے جال میں گر چکی تھی۔ شیئر بروکر سوتیلے باپ کے حساب سے اب اس کی بیوی یلو یعنی زرد شیئر سرٹیفکیٹ بن کر رہ گئی جس کا بھاؤ دن بہ دن گرتا چلا جا رہا تھا' جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ محض کاغذ کا بے کار ٹکڑا بن کر رہ جاتا ہے۔ جسے تجربہ کار بروکر اونے پونے نکال دیتے ہیں۔ اصل چیز تو روزی تھی' فریش ریڈ روز! جس کا بھاؤ ہر آنے والے دن اوپر ہی اوپر جا رہا تھا۔۔۔۔ ایک دوسرے کے کانے لوگ' اندھے بن جاتے ہیں۔ سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی کچھ نہیں دیکھتے' ایک دوسرے کے معاملات میں دخل اندازی نہیں کرتے۔

اب ریڈ روز کھلُ کھلا کر گھر سے باہر اونچی سوسائٹی' ہوٹلوں اور کلبوں میں اپنے شباب کی خوشبو سے ضرورت مندوں کو مسحور کرنے لگی۔ نام نہاد ممی ڈیڈی پرانا گھر چھوڑ کر طارق روڈ کے کشادہ آراستہ فلیٹ میں اٹھ آئے تھے' پرانی گاڑی کی جگہ نئی گاڑی آ گئی۔ انہی دنوں گڈو بھی ان کے بلانے پہ کراچی آ گئی تھی۔ یہاں ان کے ٹھاٹ اور عیش و عشرت کی زندگی دیکھ کر س کی آنکھیں کھل گئیں۔ لاہور کی عسرت زدہ زندگی اور گھٹن کے مقابلے میں کراچی اس کے لئے ایک جنت سے کم نہیں تھا۔ کہاں بوسیدہ' تنگ' سیلن مارا پرانا ریلوے کا کوارٹر' دقیانوسی ناپڑھ غریب لوگ' ہزار بارہ سو کی نوکری پہ بھی سو سو کیڑے' دق کا مارا مدقوق باپ اور کہاں یہ راچی کے لاکھوں کروڑوں پتی لوگ' بڑے بڑے بنگلے' کاریں' کلب' عیش و عشرت' آزاد یال دوست' رومان پرور کھلی فضائیں۔ پہلی زندگی پہ چار حرف بھیج کر وہ روزی کے ساتھ مل روزی کمانے پہ جٹ گئی مگر برا ہو وقت کا کہ روزی کے شیئر بروکر ڈیڈی نے ایک خاصی ی رقم ریس میں ہار دی' ساتھ ہی سٹے میں ایک اوچھا ہاتھ جو پڑا' نتیجے میں وہ چند ہی دنوں میں کھوں کے نیچے لگ گیا۔ ریس' سٹے' شیئرز کے بزنس میں تو ایسا لگا ہی رہتا ہے۔ ریڈ روز اور ڈو کو آگے بڑھا کر ایک عیاش سیٹھ سے ایک موٹی رقم حاصل کر کے پھر کاروباری سنبھالا لینا ا مگر وہ جو کہتے ہیں کہ ڈھلوان سے لڑھکنے والا لڑھکتا ہی چلا جاتا ہے' یہ رقم بھی وہ سٹے کے ے ہی جھٹکے میں خاک کر بیٹھا۔ اسی روز' رات کے کسی پہر سوتے میں ہی اسکا ہارٹ فیل ہو بلہ کم خس جہاں پاک۔۔۔۔ کرائے کا فلیٹ خالی کر کے ماں بیٹی دونوں روپوش ہو گئیں' گڈو

لاہور بھاگ آئی۔ جمع پونجی ٹھکانے لگی تو ماں بیٹی نے پھر ہاتھ پاؤں مارنے شروع کئے۔ ماں نے اس عمر میں کیا ہاتھ پاؤں مارنے تھے' روزی ہی دال دلیا چلا رہی تھی مگر جن کے منہ اٹالین پیزا اور چائنیز چکن ڈرم سٹک لگ چکے ہوں وہ باسی سڑی حلیم کھانے سے رہے۔ انہی دنوں ایک بلڈنگ کنسٹرکشن کمپنی کا مالک ریڈ روز کی آندھی جیسی جوانی کے جنگل میں اپنا سیدھا راستہ کھو بیٹھا' گھر کی نیک بی بی کو طلاق تھما کر اس چنڈال سے شادی کر کے گھر ڈال لیا۔ کچھ عرصہ تو وہ اس کی خرانٹ ماں کو برداشت کرتا رہا اور آخر ایک دن دھکے مار باہر کر دیا۔ روزی چیختی چلاتی رہی کچھ پیش نہ گئی۔ وہ آدمی ذرا ہتھ چھٹ بھی واقع ہوا تھا۔ یہ جیسے تیسے اس سے گزارہ کرتی رہی۔ جس دن اس کے ہاں پہلی بچی پیدا ہوئی اسی دن اس کی ممی' ناظم آباد کی ایک تنگ و تاریک کھولی میں ایڑیاں رگڑتی ہوئی مر گئی۔ اس ظالم نے اسے ماں کی آخری رسومات میں بھی شریک ہونے نہ دیا اور اسی دن اس نے فیصلہ کیا کہ وہ بہت جلد اس پنجرے سے رہائی حاصل کرے گی' ویسے بھی بازار میں منہ ماری کرنے کا عادی ٹک کر گھر کی ہانڈی نہیں کھا سکتا۔ ایک قیامت یہ ٹوٹی کہ بچی کی پیدائش کے بعد اس کا جسم اور پیٹ پھول کر کپا ہو گئے' چہرے پہ چھائیاں اور سیاہیاں کھنڈ گئیں۔ بہتیرا علاج معالجہ ہوا لیکن کوئی مثبت نتیجہ بر آمد نہ ہوا۔ ساری جاذبیت اور جسمانی کشش آہستہ آہستہ غارت ہوتی جا رہی تھی۔ روزی نے پھر بھی اسے پریشان کرنے اور اس سے پیچھا چھڑانے کی خاطر جان بوجھ کر اپنے پرانے لچھن پھر سے چالو کر دیئے۔ ٹیلی فون بھی کھڑکنے لگے' مشکوک لوگ بھی آس پاس دکھائی دینے لگے۔ وہ تنگ آ کر آئے دن اس کی دھلائی کرنے لگا۔ اچانک ایک دن اسے آفس میں ایک گمنام ٹیلی فون آیا' خدا جانے کسی نے کیا کہا کہ غصے کے عالم میں مکا مار کر ٹیبل کا شیشہ چکنا چور کر دیا۔ اسی غصے کے عالم میں گھر آیا اور کھڑے کھڑے بچی سمیت گھر سے نکال دیا۔ بعد میں روزی نے ہی انکشاف کیا کہ یہ ٹیلی فون اسی نے کروایا تھا کہ یہ بچی اس کی نہیں ہے' اس کا باپ کوئی کرسچین ہے جو ریس کورس میں جوکی ہے---

وہ بچی سمیت' اپنے جیسی ایک دوست کے ہاں اٹھ آئی جو ایک بہت بڑے نیم سرکاری کلب میں پبلک ریلیشن آفیسر تھی۔ یہاں آ کر اس نے نئے سرے سے حالات کا جائزہ لیا' اسی کے صلاح مشورے سے ایک ہیلتھ سنٹر میں جسم درست کرنے کے لئے داخل ہو گئی۔ چھ مہینے کی مشقت کے بعد وزن قدرے کم ہوا مگر جسمانی حالت اور بھدے پن میں کوئی نمایاں فرق ظاہر نہ ہوا۔ اسی دوران اس نے اپنے بال بھی بوائے کٹ کروا لئے تھے' ایکسرسائز یونیفارم میں وہ لڑکی کی بجائے ایک سینڈو نظر آتی۔ جو لوگ کبھی اس کے دیوانے تھے' اب نظر اٹھا کر بھی



نہیں دیکھتے تھے۔ عورت کی اس سے زیادہ توہین اور کیا ہو سکتی ہے کہ کوئی مرد اسے نظر بھر کر دیکھنے کے قابل بھی نہ سمجھے۔ یہ احساس اسے دن رات کاٹتا رہتا۔ ہیلتھ سنٹر میں وہ فارغ اوقات میں دوسری لڑکیوں کو ایکسرسائز بھی کروا دیا کرتی تھی' کافی عرصہ یہاں گزارنے کے بعد وہ اچھی تجربہ کار ہو چکی تھی۔ ایک دن سنٹر کی پارسی مالکہ نے اسے آفر دی کہ تم اگر چاہو تو یہاں کوچ کی حیثیت سے ملازمت کر سکتی ہو' تنخواہ اور دیگر مراعات بھی پر کشش تھیں۔ اس نے حالات کی یہ ستم ظریفی بھی خنداں پیشانی سے قبول کر لی' وہیں اسے اوپر رہائش کے علاوہ موٹر بائیک بھی مل گئی۔ ورزش کراتے کراتے اس کے اندر کی عورت جانے کہاں غائب ہو گئی۔ مسل پٹھے' گردن شانے فولاد کی مانند تن گئے۔ غصے اور ذہنی تناؤ کی حالت میں خود پہروں ورزش کیا کرتی' پسینے کی ندیاں کھل جاتیں اور دیکھنے والیاں عش عش کر اٹھتیں۔ اس کے کسرتی' بنے ہوئے جسم کو حسرت بھری نظروں سے دیکھتیں۔ یہ تو اس کی ایک اضطرابی کیفیت تھی اور اس حقیقت کے خلاف ایک اضطراری رد عمل تھا کہ اب وہ سنہری چڑیا اڑ چکی جس کے پیچھے کئی شکاری حرص وجاہت اور مال و زر کے رو پہلی جال لئے تعاقب میں رہتے تھے۔ اب تو یہ وہ شکرا بن چکی تھی جو خود ہی اگر کسی جال میں پھنسنا چاہے تو شکاری جال چھوڑ کر بھاگ لے۔ اس نے اپنے تئیں تہیہ کر لیا کہ اب وہ ایک خونخوار مرد کے روپ میں ان مردوں سے انتقام لے گی جنہوں نے اسے اس حال تک پہنچایا تھا۔ اسے اس حال تک لانے والا اس کا سوتیلا باپ تو واصل جہنم ہو چکا تھا مگر اس جیسے تو کئی اس کے اردگرد موجود تھے مگر عورت چاہے لاکھ کوشش کرے' جو بھی بھیس بدلے' اپنی نسائیت اور عورت پن کی فطری خواہش کا گلا نہیں دبا سکتی۔ اسے یہاں بھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا' دو ایک دھانسو قسم کے معقول سے دوستوں سے روزی نے راہ و رسم بڑھانے کی کوشش کی۔ انہیں مالی اعانت کا اشارا بھی دیا مگر وہ ایسے بدکے کہ دیکھتے ہی راستہ کاٹ جاتے۔ اس تلخ تجربے کے بعد اس نے مردوں پہ لعنت بھیج کر اپنے من کو مار لیا۔ بچی بھی اب بڑی ہو رہی تھی۔ ہنی' ایرانی بلی جیسی نیلی نیلی آنکھیں اور نرم روئی سی ملائم جلد لئے بالکل کنٹرکشن کمپنی کے مالک پہ گئی تھی۔

دو سال اسی ہیلتھ سنٹر میں پلک جھپکتے گزر گئے۔

تنخواہ کے علاوہ دیگر مراعات میں اضافہ ہو چکا تھا۔ پارسن مالکہ نے اس کی کارکردگی اور دیانت پہ اطمینان محسوس کرتے ہوئے اسے مکمل ذمہ داری سونپ دی تھی مگر یہ تو اپنا ہیلتھ سنٹر کھولنے کا ارادہ کر چکی تھی۔ اگلے تین مہینے اس نے جان توڑ محنت کی۔

☆☆☆

ٹینا جسے ٹوٹو کا نام بھی اسی نے دیا تھا' اس کی شاگرد تھی۔ کراچی کی ایک ممتاز صنعت کار فیملی سے تعلق رکھتی تھی۔ پڑھی لکھی' بزنس ایڈمنسٹریشن میں ڈگری ہولڈر' روشن خیال اور آزادانہ زندگی بسر کرنے کی شوقین۔۔۔۔ دوستیاں پالنا' سیر سپاٹے' میوزک پارٹیوں کا جنون۔۔۔ پارہ صفت' صاف گو اور خطرناک حد تک بیباک تھی۔ والدین سے تو شروع سے ہی نہیں بنتی تھی۔ بڑے جتنوں سے ایک شریف کاروباری خاندان میں بیاہی گئی۔ خاوند کینیڈا میں سیٹل تھا۔ شادی کے بعد بڑی مشکل سے ایک سال خاوند کے ساتھ گزارا۔ وہ بے چارہ سیدھا سادا کاروباری آدمی تھا' ٹوٹو کے الفاظ میں مٹی کا مادھو اور یہ تو پارے کی بنی ہوئی تھی۔ ہر وقت مضطرب و بے قرار' تھرل اور ایڈونچر کی متلاشی اور حد یہ کہ ماں بننے کا رسک تک نہ لیا۔ وہ کہتی کہ اُلّو ہی کافی ہے' اُلّو کا پٹھا کہاں سنبھالوں گی۔ پھر اس اُلّو سے جان چھڑا کر واپس بھاگ آئی۔ اب یہ طلاق کا مطالبہ کرتی' نہ وہ ضرورت محسوس کرتا۔ کبھی کبھی دونوں ایک دوسرے کو ٹیلی فون کھڑکا لیتے۔ جو مانگتی' وہ اس کے بینک اکاؤنٹ میں ڈال دیتا۔ اس کے عیش ہی عیش تھے۔ سجا سجایا آراستہ تین کمروں کا ویسٹ اوپن فلیٹ ملا ہوا تھا' مختلف حیلوں بہانوں سے ممی ڈیڈی سے بھی روپیہ پیسہ جھاڑ لیتی' اس طرح کافی لمبا بینک بیلنس اکٹھا کر لیا ہوا تھا۔ اسی ٹوٹو نے ریڈ روز کو شراکت میں اپنا ہیلتھ سنٹر کھولنے کا مشورہ دیا تھا۔ سرمایہ اس نے فراہم کیا' سارا بزنس اور انتظام روزی نے سنبھالا اور دونوں ففٹی ففٹی کی پارٹنر بن گئیں۔ خوب کاروبار جمایا۔ ماڈرن اپ ٹو ڈیٹ قسم کے آلات لگائے۔ سونا باتھ' ہاٹ روم' مساج روم' بنفشی شعاعوں کا غسل' کافی روم' اسنیک بار۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اچھے اچھے گھرانوں سے خوبصورت لڑکیاں' عورتیں اپنی اعضائی ورزش اور باڈی شیپ کے لئے آنے لگیں۔ کاروباری نقطہ نظر سے یہ ایک منفعت بخش بزنس تھا جس سے ان دونوں کے دن پھر گئے لیکن پس پردہ ان کا اصل کاروبار تو بڑے بڑے ہوٹلوں' موٹلوں' کلبوں' پرائیویٹ گیسٹ ہاؤسز کو ان کی پسند اور ضرورت کے مطابق کال گرلز مہیا کرنا تھا۔ لڑائی جھگڑے بھی ہوتے۔ ریڈ روز کا اپنا گینگ بھی تھا جس میں بڑے بڑے ماڈرن بدمعاش' گماشتے اور ایجنٹ تھے جو کال گرلز کی نگہداشت اور حفاظت کرتے تھے۔

یہ سب کچھ معلوم ہونے کے بعد نگہت یعنی جان کی آنکھیں کھل گئیں۔۔۔۔ گڈو نے تفصیل کے ساتھ نگہت کی ساری کہانی سنائی تو ریڈ روز نے اسے گلے سے لگا لیا۔ دونوں ایک کٹھالی کے ڈھلے ہوئے کھوٹے سکے تھے۔ دونوں ہی زمانے اور اپنوں کی ستائی ہوئی تھیں' دونوں نے ہی دنیا اور عیاش مردوں لئے اپنے اپنے سینوں میں انتقام کی آگ بھڑکائی ہوئی



تھی اور دونوں ہی خلاف فطرت زندگی کی راہوں پہ گامزن تھیں۔ جان کو اپنے مرض سے چھٹکارا مل گیا تھا۔ پھر بھی روز نے اپنے ایک ڈاکٹر سے اس کا مکمل چیک اپ کروایا جس نے اس کے کلیئر ہونے کی رپورٹ دی۔

☆☆☆

ملک بھر میں نگہت کی تصویر اور تلاش کی اپیل مسلسل شائع ہو رہی تھی۔ حساس اداروں نے دریاؤں اور کنوؤں کے علاوہ کوئی ایسی جگہ نہ چھوڑی جہاں اسے تلاش نہ کیا ہو۔ انہی دنوں سیلاب کی آفت ٹوٹ پڑی۔ ہزاروں انسان اور مویشی ہلاک ہو گئے' ملک میں ایمرجنسی نافذ کر دی گئی تھی اور انہی دنوں ایک خبر اور تصویر چھپی۔ پولیس کو ہنجروال کے قریب ایک جوان لڑکی کی مسخ حالت میں لاش ملی۔ نیلی رنگت' پھولی ہوئی' کئی روز سیلاب کے پانی میں کسی جھاڑی میں الجھی رہی۔ کئی جگہ جسم سے گوشت جدا ہو گیا تھا' چہرے کا بہت سا حصہ سلامت تھا مگر ناقابل شناخت تھا۔ چہرے کے بگڑے ہوئے خدوخال' کپڑوں اور بچی کھچی دیگر اشیاء سے باور کر لیا گیا کہ یہ وہی لڑکی شمسہ ہے۔ دراصل پولیس اس کیس میں اپنی ناکامی کو کسی طرح سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ آدھی ادھوری تصویروں اور دیگر جسمانی اعضاء کے ذریعے بی کرم الٰہی' نواب بی بی' مس عاشی اور دوسرے گرفتار شدگان سے رسمی شناخت کروائی گئی۔ پیچھا چھڑانے کی غرض سے سب ہی نے اس کے شمسہ ہونے کی تصدیق کر دی۔ اس طرح پولیس نے اپنی جان چھڑوائی' اپیل شائع ہونا بند ہو گئی۔

کراچی والی پرانی لاشوں کے دو پوسٹ مارٹم اور ہوئے۔ اب لاشیں چہرے کے علاوہ کسی پھٹی پرانی بوریوں کی مانند تھیں۔ موتیاں جان کی لاش کا بھی قریب قریب یہی حشر تھا۔ ابھی یہ سلسلہ جاری تھا کہ حکیم جمالی اور استاد شفو اکیڈمی والا بھی یکے بعد دیگرے لڑھک گئے۔ کون جانے کہ واقعی اس بیماری سے مرے ہیں' دہشت یا پھر "اتّ خدا داویر" کا نتیجہ تھا۔ گویا اب یہ مکافات عمل کا سلسلہ چل نکلا تھا' باقی ماندہ بھی لائین میں لگے ہوئے تھے۔ پولیس اور طبی ماہرین کا خیال تھا کہ اب یہ باقی ماندہ بستر بھی جلد خالی ہونے والے ہیں۔ امریکن طبی ماہرین اور ملکی ڈاکٹروں نے دو ڈھائی ہفتوں میں مختلف نتائج اخذ کرنے کے بعد جو رپورٹ تیار کی اور حساس اداروں کی تفتیشی کارروائیوں کے مطابق بھی اس خطرناک بیماری کو کنٹرول کر لیا گیا جو متاثرین موجود تھے اور اپنے انجام کو پہنچ رہے تھے' باقی لوگ یا جو شبے میں حراست میں لئے گئے تھے ان میں اس بیماری کے کوئی آثار نہیں تھے۔ مزید چند روز نگرانی میں رہنے کے [illegible] سے تین روز قبل تمام لوگ چھوڑ دیئے گئے جن میں حاجی رجی بیگم اور اس کے شاگرد'

استاد شفو کی اکیڈمی کے ملازم، بلڈنگ کے چوکیدار، خاکروب، شاہان کے تینوں ملازم جن میں منشی کرم الٰہی بھی شامل تھا۔ شاہان کو بھی انہوں نے بلانے پر حاضر ہونے کی شرط پر چھوڑ دیا۔ مرنے والوں کی نعشیں ورثا کے حوالے نہیں کی تھیں۔ محکمے نے اپنے مخصوص اور خفیہ طریقے سے انہیں ٹھکانے لگایا۔ جس عجلت اور ایمرجنسی میں یہ کارروائی ہوئی، اسی انداز سے یہ سارا سلسلہ بھی ختم ہو گیا کیونکہ دیکھا دیکھی یہ خبیث جہنم واصل ہوتے گئے، ایک بھی باقی نہ بچا۔ حکیم جمالی کے دفتر ڈیرے کے علاوہ عامل ظہوری شاہ کے آستانے اور فلیٹ کا سارا سامان فرنیچر وغیرہ پولیس لے گئی۔ فلیٹ اور دفتر کا قبضہ منشی کرم الٰہی نے لے لیا۔ حاجی رجی بیگم اپنے شاگرد پیشہ ہیجڑوں اور بھائی شمشاد ڈانس ماسٹر کے ساتھ کہیں روپوش ہو گئے۔ باوا میاں ہنگا ثانی کے مزار پہ گدھا ریڑھی والوں نے گدھے باندھنا شروع کر دیئے۔ خس کم جہاں پاک۔۔۔

★★★

شاہان گھر آیا تو سب کی جان میں جان آئی۔ صدقے کے بکرے ذبح کئے گئے، اللہ کا شکر ادا کیا گیا۔ اتنی مصیبت اور پریشانی دیکھنے کے بعد بھی وہ مردانہ لباس میں بڑا پرعزم اور پرسکون دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے آتے ہی ماں کے پاؤں پکڑ لئے۔ حجام کو گھر بلوا کر سر کے بال کٹوا دیئے گئے۔ وہ خاموشی سے ماں کی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسو دیکھ رہا تھا۔۔۔ ماں جی، باباجی، ماں جی۔۔۔ جیسے دونوں چہرے ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو رہے تھے۔ کانوں میں باباجی کی دھیمی سی آواز رس گھول رہی تھی، ایک ایک لفظ صاف سنائی دے رہا تھا۔

"ماننا بڑی مہانتا ہے۔ ماننا، ماں سے شروع ہوتا ہے۔ ماں چکی ہوتی ہے۔ جو گھر کی چکی کا مان جان لے، اس کا داتا گھر میں موجود۔۔۔ گھر کی چکی کا کھاؤ، پُن کماؤ۔۔۔"

اچانک اس کے منہ سے نکلا۔ "ماں۔۔۔"

"میں صدقے، میں واری۔۔۔" ماں کے منہ سے بیساختہ نکلا۔

دونوں ماں بیٹا، اک دوجے کے سینے سے لگے آنسو بہا رہے تھے۔ نین تارا، قاسم، زلفی، سب گھر والوں کی آنکھیں بھر آئیں۔ ماموں اور والد شکرانے کے نفل پڑھنے مسجد کی طرف نکل گئے۔ کچھ دیر بعد موقع پاتے ہی وہ نین کے کمرے میں آیا۔ نین تارا بڑی خوش تھی، چہکتے ہوئے کہنے لگی۔

"تمہیں دونوں گھروں میں آنا مبارک۔۔۔؟"

"میں کچھ سمجھا نہیں۔۔۔" وہ دماغ پہ زور دیتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"بھئی، سیدھی بات ہے۔ اس گھر میں اور اپنی ماں جی کے گھر میں، یعنی دل میں۔۔۔ تم



نے آج پھوپھو جی کا کہا مان کر ان کا مان بڑھا دیا ہے، جی بڑا خوش ہوا۔ تم نے دیکھا، سب ہی کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔۔۔ شاہان! جو ماں کو خوش رکھتا ہے اسے کبھی کوئی دکھ نہیں چھوتا، وہ سدا سکھی رہتا ہے۔ آج کے مبارک دن مجھ سے وعدہ کرو کہ تم کبھی اپنی ماں سے دور نہیں رہو گے، کبھی ان کا دل نہیں دکھاؤ گے اور کبھی ان کا کہا نہیں ٹالو گے۔۔۔"

وہ اسے غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "اچھا" منظور۔ غیر مشروط طور پہ منظور۔۔۔ مگر اس موضوع سے ہٹ کر تم بھی میری وہ بات مانو گی جس کا کئی بار میں پہلے بھی اشارہ کر چکا ہوں۔"

وہ اس کے اشارے کو سمجھتے ہوئے پلنگ کی پٹی پہ بیٹھ گئی، تھوڑی دیر بعد بڑے اعتماد سے پوچھنے لگی۔

"تم ایسا کیوں چاہتے ہو، کس حیثیت سے مجھے مجبور کرتے ہو۔۔۔ پھوپھی زاد بھائی کی حیثیت سے، ایک انسان ہونے کے ناطے یا کوئی اور وجہ۔۔۔؟"

"میں ایک بھائی اور ادنیٰ سا انسان ہونے کی حیثیت سے تمہاری بھلائی اور بہتری کے لئے ایسا چاہتا ہوں۔۔۔"

"نین اسے گھورتی ہوئی بولی۔ یہ وقت اس موضوع پہ کھل کر بات چیت کرنے کا نہیں لیکن ایک بات ضرور کہنا چاہوں گی۔ تمہارے پاس کیا گارنٹی ہے کہ تمہاری بات مان لینے میں میری بہتری اور بھلائی ہے؟۔۔۔ یقیناً" تمہارے پاس کوئی گارنٹی نہیں، تم صرف ایسا سوچ سکتے ہو یا گمان کر سکتے ہو۔۔۔ ویسے میں بھی اپنی بھلائی بہتری کے بارے میں اپنی ایک رائے رکھتی ہوں، کوئی فیصلہ کرنے کی اہلیت رکھتی ہوں۔ تم عورت کی نفسیات اور اس کی الٹی کھوپڑی کے بارے میں شاید کچھ زیادہ نہیں جانتے (عورت صرف جسم، جاذبیت اور خواہشات کو پورا کرنے کی مشین کا نام نہیں۔ وہ چاہت، عزم اور صبر و حیا کا نام ہے۔ اسی طرح مرد بھی طاقت، وجاہت، دولت اور اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت رکھنے والے کسی کمپیوٹر کو نہیں کہتے۔ مرد وہ ہے، جو مخلص، مخیر، باتدبیر، رزق حلال کمانے والا، صاحب الرائے اور غیرت مند ہو)۔۔۔ شاہان! میری چاہت تم ہو، میں ہر حال میں تمہارے ساتھ مرنے جینے کا عزم کر چکی ہوں۔ میں بے وفا یا بے حیا نہیں ہوں کہ تمہیں چھوڑ کر کسی اور کے متعلق سوچوں۔ میں بڑی ثابت قدم اور صبر کرنے والی ہوں۔۔۔"

"نین۔۔۔!" شاہان نے بات پکڑنا چاہی۔

"۔۔۔ صرف چند الفاظ اور، پیشگی معذرت کے ساتھ نین تارا اسی ٹمپو میں کہنے لگی۔

"تم صرف تھوڑی سی غیرت پیدا کر لو۔ میں ان سخت الفاظ کے لئے پھر معافی چاہتی ہوں،

باقی کسی چیز کی کمی نہیں اور نہ ہی مجھے تمہارے سوا کچھ اور چاہئے۔ لاکھوں میاں بیوی ایسے موجود ہیں جو صحت مند ہونے کے باوجود اولاد جیسی نعمت سے محروم ہیں' کچھ بیماریاں اور حادثے بھی ایسے ہو گزرتے ہیں کہ میاں بیوی دونوں میں سے کوئی ایک نااہل ہو جاتا ہے تو کیا وہ بیویاں اپنے مردوں کو چھوڑ دیتی ہیں یا مرد اپنی بیویوں کی کہیں اور شادی کرانے کے متعلق سوچتے ہیں؟--- وفا' حیا' صبر اور راضی بہ مشیت بھی اجلا سچ ہیں--- جاؤ' واپس اپنے گھر اور ماں باپ کو خوش رکھو۔ تم مرد پیدا ہوئے تھے' اپنی اس تکلیف کے باوجود بھی تم مرد ہو۔ اپنی بیمار سوچ سے پیچھا چھڑاؤ اور صرف یہی بات لے کر ماں باپ' خاندان' خود کو اور مجھے ذلیل و رسوا نہ کرو۔ جو کچھ تم پہ اور ہم سب پہ بیت چکا ہے' مجھے یقین ہے کہ تمہاری آنکھیں کھولنے کے لئے کافی ہو گا--- میں یہاں تمہاری امانت ہوں۔ جب بھی اپنی امانت لینے آؤ گے' مجھے تیار پاؤ گے---"

وہ اسے گھورتے ہوئے مزید کہنے لگی۔

"زلفی اچھا لڑکا ہے' تمہارا پیارا دوست اور میرا پیارا بھائی ہے--- جاؤ' ان کے گھر بھی جاؤ۔ اس نے تمہاری خاطر بڑی تگ و دو کی ہے' شکریہ بھی ادا کرو اور اسے تسلی دلاسا بھی دو۔ وہ سارے گھر والے بہت پریشان ہیں---"

وہاں سے نکل کر شایان بڑے کمرے میں آیا۔ زلفی اور قاسم بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ زلفی شاید اسی کی راہ دیکھ رہا تھا' کچھ لمحوں بعد وہ اسے لے کر اپنے گھر بیٹھک میں آ بیٹھا اور اخباروں کا پلندہ اس کے سامنے دھرتے ہوئے کہنے لگا۔

"یہ دیکھو---" وہ نگہت کی تصویریں دکھانے لگا۔ تصویروں میں اس کی گلی سڑی ادھوری لاش کی تصویریں بھی تھیں جسے نگہت سمجھ لیا گیا تھا۔ "شایان! ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے۔ گھر گھر' گلی گلی لوگ تصویر دکھا کر اور ایک دوسرے کو اخباروں کی خبریں پڑھ کر سنا رہے ہیں' اسی وجہ سے محلے میں ہم اچھوت بن کر رہ گئے۔ پاس پڑوس والوں نے بھی آنا جانا' علیک سلیک چھوڑ دی ہے۔ جب پہلے دن اخبار میں تصویر چھپی تھی تو میں نے نگہت کو پہچان لیا تھا' والد صاحب اور گھر والوں سے چھپاتا رہا لیکن دوسرے روز ہی نگہت کے ماموں ممانی' چند رشتہ دار خواتین کے ساتھ یہاں پہنچ گئے۔ پہلے تو گلی محلے میں ہمارے خلاف باتیں کرتے رہے' پھر ہمارے گھر آ کر واویلا کرنے لگے۔ اس کی بربادی اور والدہ کی موت کا ذمہ دار والد صاحب کو ٹھہرانے لگے۔ والد صاحب کی طبیعت پہلے ہی خراب تھی' اس نئی افتاد سے انہیں دورے پڑنے لگے۔ بڑی مشکل سے ان لوگوں سے جان چھڑائی۔ یہ تین ہفتے جس



اذیت اور پریشانی سے ہم نے گزارے ہیں' ہم ہی جانتے ہیں--- اوپر سے تمہاری پریشانی اور بھاگ دوڑ' تمہارے والدین اور ماموں ممانی' نینی کی حالت۔ منہ روزہ---"

"اب والد صاحب کی طبیعت کیسی ہے---؟"

"والدہ کی موت کے بعد انہیں چپ تو لگ ہی گئی تھی' نگہت کی موت اور بدنامی نے انہیں بالکل ہی نڈھال کر دیا ہے۔ کھانا پینا ختم ہو گیا ہے' ایک آدھ ہلکا سا دورہ بھی پڑ چکا ہے۔ ڈاکٹروں نے کسی گہرے صدمے کا اثر بتایا ہے--- میری تو مت ماری گئی ہے' خدا جانے کیا ہونے والا ہے---"

"گھبراؤ نہیں' دوست! اللہ بہتر کرے گا۔ میں اب تمہارے قدموں میں واپس آ گیا ہوں۔ جو سر پڑے گی' اکٹھے جھیلیں گے۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہمت مرداں مدد خدا---"

زلفی اس کے منہ کی طرف دیکھنے لگا' بولا۔ "سچ پوچھو' شایان! تم یہ کہتے ہوئے مجھے بہت ہی بھلے لگے ہو۔ میں تم میں ایک خوشگوار سی تبدیلی محسوس کر رہا ہوں' یوں لگتا ہے جیسے تمہارے اندر سے ایک حوصلہ مند اور حوصلہ بڑھانے والا مرد باہر نکل آیا ہے۔ مجھے اسی مرد کی ضرورت ہے' تم میرے ساتھ ہو تو میں بڑے سے بڑے طوفان سے بھی ٹکرا جاؤں گا---"

پھر وہ نگہت کی ایک تصویر دکھاتے ہوئے بتانے لگا۔

"پولیس کا دعویٰ ہے کہ سیلاب میں مرنے والی نگہت ہے' یہ دیکھو لاش کی تصویر--- لیکن میرا دل گواہی دیتا ہے کہ یہ نگہت نہیں۔ پولیس نے اپنی جان چھڑائی ہے اور کیس داخل دفتر کر دیا ہے--- تمہارا کیا خیال ہے؟"

"یقین نہ کرنے کی کوئی ٹھوس وجہ بھی تو نہیں' ہم محض قیاس آرائی ہی کر سکتے ہیں---"

دوسرے کمرے سے زلفی کے والد کے چیخنے اور رونے کی آوازیں آنے لگیں۔ دونوں بھاگے بھاگے اندر گئے۔ انہیں پھر دورہ پڑ چکا تھا۔ شایان ان کی حالت دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ' پیلی رنگت' آنکھوں کے نیچے گہرے گہرے سیاہ حلقے' بجھا بجھا سا چہرہ' لرزیدہ جسم--- فوراً ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ آدھ گھنٹے بعد وہ انجکشن لے کر سو رہے تھے۔

★★★

اخبارات کا پلندہ اٹھائے شایان' ماموں کے گھر آ گیا۔ افطاری کے بعد وہ نین تارا کے کمرے میں اخبار کھول کر بیٹھ گیا' پڑھتا جا رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ دماغ سن ہو رہا تھا۔ حکیم جمالی'

ظہوری شاہ' استاد شفو' استاد قربان' حاجی رجی بیگم' مس عاشی' ایک ایک چہرہ سامنے تھا۔ جیتے بستے لوگ! آج جن کی خاک کی بھی خبر نہیں کہ کہیں ہے بھی یا اڑا دی گئی۔ قہقہے اڑاتے' موج میلہ کرتے' وقت کے سینے پر مونگ دلتے لوگ! وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ سب کچھ اتنی جلدی ہو جائے گا--- اسے جھرجھری سی آ گئی۔ اسی تردد وملال میں تراویح کا وقت آن لگا۔

آج ستائیسویں شب تھی۔ رحمتوں برکتوں کے نزول کی رات' بخشنے بخشانے کی رات' رو رو کر اپنے گناہوں سے توبہ کرنے کی رات--- وہ جلدی جلدی کپڑے تبدیل کر کے زلفی کے ہاں آ گیا' وہ باہر ہی نکل رہا تھا۔

"میں تمہاری طرف ہی آ رہا تھا---" زلفی بولا۔

"---اور میں تمہارے پاس' تمہارے قدموں میں پہنچ گیا---" شایان نے جواب دیا۔

گاڑی سٹارٹ کر کے گلی کے موڑ پہ پہنچے تو سامنے خراماں خراماں منشی کرم الٰہی آتے دکھائی دیئے' شایان کے لبوں پہ مسکراہٹ سی پھیل گئی۔ گاڑی روکی' پاس بٹھایا۔

"چاچا! بتاؤ بھلا! ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

"پترا وہیں' جہاں تمہیں اس وقت جانا چاہئے---" اس نے جواب دیا۔

☆☆☆

داتا دربار!--- عام طور پر ہی یہاں اتنا رش ہوتا ہے کہ زائرین اور عقیدت مند ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے رہتے ہیں تاکہ کہیں ایک دوسرے سے بچھڑ نہ جائیں اور رمضان شریف کے بابرکت مہینے میں تو یہ عالم ہوتا ہے کہ قدم جمانے کے لئے پاؤں تلے زمین نہیں ملتی۔ انسانوں کا سیلاب' ریلوں کی صورت میں آہستہ آہستہ سرکتا رہتا ہے۔ عالموں' فاضلوں' صوفیوں درویشوں' ملنگوں' عقیدت مندوں کے پرے کے پرے بیٹھے دکھائی دیتے ہیں۔ اعتکاف میں بیٹھنے والے سینکڑوں خوش نصیب دالانوں' حجروں میں گوشہ نشین ہوتے ہیں۔ افطاری پہ طرح طرح کے کھانے' مشروبات' پھل' مٹھائیاں' انواع اقسام کی نعمتیں موجود ہوتی ہیں۔ پہروں پہلے نمازی اپنی جگہ محفوظ کر لیتے ہیں مگر ستائیسویں شب تو خدا کی خدائی جانے کہاں سے آ جاتی ہے ساری رات محفل شبینہ' درود وصلوٰۃ' ورد قرآن کی مجلس گرم رہتی ہے۔ دعائیں' گریہ زاریاں' التجائیں' ہر شخص عجز وانکسار کی تصویر بنا اپنے گناہوں پہ نادم شرمسار آنسوؤں کے دانہ دانہ موتی رولتا ہے۔ ایک عجیب سا روح کو بھگو دینے والا ماحول ہوتا ہے اور وہ غفور الرحیم ہے' اپنے گناہوں پہ نادم ہونے والوں کو معاف فرما دیتا ہے۔ وہ خوش ہوتا ہے کہ میرے بندے مجھ سے رحمت مانگ رہے ہیں۔ پھر وہ سچے دل سے توبہ کرنے والوں



کو آئندہ کے لئے گناہوں سے بچنے کی توفیق بھی عطا کر دیتا ہے۔ گنج بخش کا صدقہ! جو بھی جائز طلب لے کر آتا ہے' بامراد اور مطمئن ہو کر جاتا ہے۔

یہ تینوں بھی صحن کے درمیان ہجوم میں پھنسے بیٹھے تھے۔ ایک ساتھ مگر اندر سے علیحدہ علیحدہ' کسی کو کسی کا ہوش نہیں' تینوں اپنی اپنی چکی چلانے میں مگن تھے۔ اپنی اپنی لائن پہ' اپنی اپنی کال پہ اپنی اپنی سن سنائی کر رہے تھے۔ آنسو' آہیں' سسکیاں' لرزتے ہونٹ' عرق آلود پیشانیاں' لرزاں ترساں چہرے' جھکے سر---

پاس ہی مردان کے کوئی صاحب طریقت بزرگ ایک بڑے حلقے کے درمیان بیٹھے لا الٰہ الا اللہ کا ورد کروا رہے تھے۔ عجب وارفتگی کا عالم تھا۔ ذکر میں شامل حضرات زخمی کبوتروں کی مانند پھڑک رہے تھے۔ ذکر کی لے اور تواتر و تاثر کچھ ایسا وجد انگیز تھا کہ آس پاس بیٹھے ہوئے لوگوں کے دل خود بخود لا الٰہ الا اللہ کہتے ہوئے شامل حال ہونے پہ مجبور تھے۔ گرداب کی لہروں کی مانند حلقہ پھیلتا چلا جا رہا تھا۔ یہ بھی جب اس سرمستی کی زد میں آئے تو ان کے قلب اور لب بھی جاری ہو گئے۔ یہ جہری ذکر مزاجاً" جلالی کیفیتوں کا حامل ہوتا ہے۔ ذاکر کی اپنی باطنی بالیدگی اور ظرف وزہد پہ بھی منحصر ہوتا ہے کہ استغراق اور وجد وحال کے کس مقام پہ اس کا قلب حق سبحانہ وتعالیٰ کی جمالی لطافتوں سے لطف اندوز ہوتا ہے' سہم کر پھڑکنے اور تڑپنے لگتا ہے---

شایان بھی زخمی کبوتر کی مانند تڑپنے پھڑکنے لگا۔ کسی کو کسی کی کیا خبر' کیسا ہوش؟ گریباں چاک' منہ سے کف... دو زانوں ہاتھ جمائے' دائیں بائیں اس والہانہ انداز میں جسم اور سر پٹک رہا تھا کہ بقائمی ہوش وحواس انسان ایسا کرنے کا تصور تک نہیں کر سکتا۔ اس سے پیشتر کہ یہ حالت وارفتگی میں ریزہ ریزہ ہو کر کہیں گم ہو جاتا' دو مشفق بازوؤں نے اسے اپنے پرسکون حصار میں لے کر سینے سے چمٹا لیا جیسے اک مدت کے بعد دو بچھڑے ہوئے ملے ہوں۔ شایان بڑے سکون سے باباجی کی گود میں سر رکھے جیسے سو رہا تھا۔

کچھ دیر بعد مجلس برخاست ہو گئی' باباجی ان تینوں کے ساتھ برآمدے میں آ گئے۔ یہاں ان کا وقتی طور پر ہی قیام تھا۔ ان سے عقیدت رکھنے والے بھی وہاں موجود تھے۔ اپنے پہلو میں بٹھا کر ٹھنڈے مشروب سے ان کی تواضع کی' مزاج پوچھے۔ پھر باباجی نے زلفی کو ایک سفید رومال پانی سے تر کر کے لانے کو کہا۔ اپنے ہاتھ سے شایان کے چہرے' چھاتی پہ گیلے رومال سے ٹکور کی۔ ہوش وحواس قدرے بحال ہوئے تو شایان نے عالم وارفتگی میں چیخ ماری اور پھر باباجی سے لپٹ گیا--- کافی دیر تک باباجی اس کا سینہ سہلاتے رہے' تر رومال سے چہرہ اور ماتھا پونچھتے رہے۔ پندرہ منٹ بعد شایان گود میں پڑا کسی معصوم بچے کی مانند مسکرا رہا تھا' سر پہ ہاتھ

پھیرتے ہوئے پوچھنے لگے۔

"بیٹا! لاالٰہ الا اللہ پڑھ رہے تھے۔۔۔؟"

"جی۔۔۔ سب ہی پڑھ رہے تھے۔" اس نے بڑے معصومیت سے جواب دیا۔

"ہاں' یہ محض پڑھنا ہے۔ سمجھ کر' جان اور مان کر پڑھنا اور بات ہے۔۔۔" وہ پھر مسکراتے ہوئے پوچھنے لگے۔ "اچھا بتاؤ کہ اگر کوئی عربی یا اردو سیکھنا چاہے تو اسے سب سے پہلے کیا کرنا چاہئے؟"

"جی' ظاہر ہے کہ اسے پہلے یسرنا القرآن یا اردو کا قاعدہ شروع کرائیں گے۔۔۔"

"صحیح۔۔۔ یعنی الف سے شروع کرنا چاہئے' لام سے نہیں۔ تو بیٹا! تمہیں بھی پہلے الف' اللہ ہو سے ابتدا کرنی چاہئے۔ الف صیغہ اثبات ہے۔ اسم اللہ' احد ہے۔ اکبر و اعلیٰ' اول و آخر ہے۔ انسان فرشتوں' جنوں اور تمام مخلوقات سے اسی لئے اشرف ہے کہ اسے علم الاسماء سکھایا گیا اور علم الاسماء کی ابتدا الف سے ہوئی۔۔۔ غور کرو' القرآن کے اول تا آخر کا نچوڑ الفاتحہ ہے' سورۃ الحمد بھی الف سے شروع ہوتی ہے' قرآن بھی الف سے شروع ہوتا ہے۔۔۔ الف ل م' یعنی الف سے اللہ کو مانو پہچانو۔ پھر "ل" کی لیلۃ الاسرا کو جانو' پھر "م" محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مانو۔۔۔ لا صیغہ نفی ہے' کسی مبتدی یعنی نو آموز کا اس کی جلالی کیفیت سے دوچار ہونا عین ممکن ہے۔ پھر بغیر سوچے سنبھلے کسی مجلس یا عمل وذکر کی محفل میں شامل ہونا ابتدا میں مناسب نہیں۔ کسی الف آگاہ کو امام پکڑو' الف کا آموختہ یاد کرو اور الف سے اُم۔ یعنی ماں کے آگے انگلی اٹھانا' آگ اٹھانا ہے۔ ادب افضل اور انکار ابتری ہے۔۔۔ جاؤ' وضو کرو۔"

باباجی کی باتیں بڑی گمبھیر اور تہہ دار تھیں۔ دو چار پہلی ملاقاتوں میں بھی اسی طرح کی باتیں ہوئی تھیں۔ عام باتوں سے مختلف' کچھ تو سمجھ میں آتیں اور کچھ عقل و فہم سے بالا بالا کہیں دل اور روح کی گہرائیوں میں اتر کر بیٹھ جاتیں۔ پھر آہستہ آہستہ کھلتے ہوئے اشاروں اور معنوں کے بلبلے' رنگ اور خوشبو کی پچکاریاں چھوڑنے لگتیں' خیالات اور سوچ کا روپ دھار کر کہیں لاشعور میں مستور ہو جاتیں۔ بعد میں شعور انہیں وقت اور ضرورت کے مطابق عملی طور پر ظہور میں لاتا رہتا۔۔۔ باباجی کی باتوں میں بھیگے ہوئے وہ غسل خانے کی جانب بڑھ گئے واپس پلٹے تو تلاش بسیار کے باوجود وہ کہیں نظر نہ آئے۔

☆☆☆

عید! کا دن خوشیوں' پھیکی... س اداس سا گذر گیا۔ زلفی کے گھر اس دن بھی ڈھنگ سے چولہا نہ جلا۔ گھر میں اداسی' بے چینی اور کرب نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ بدنامی' رسوائی



رمندگی کی وجہ سے نہ کہیں آنا جانا ہوا اور نہ ہی کوئی عزیز و اقارب ادھر آیا۔ کچھ بھی تھا' ہت تھی تو اسی کا خون' باپ کی بیٹی!

ادھر بوڑھے بیمار باپ کا خون شاید جوش مار گیا۔۔۔ اپنی کوتاہیوں کا احساس اسے ڈس گیا ، ایسی رسوائی اور بیٹی' ایسے اذیت ناک انجام کے بارے میں کبھی سوچا تک نہ تھا۔ احساس م و غفلت نے اسے بے حال رکھا تھا' چپ اور خاموشی ٹوٹی تو دھاڑیں مار کر رونے لگتا۔ اروں سے سر ٹکراتا' چیختا چلاتا کہ میری بچیاں مجھ سے ملواؤ۔ میں ان کا مجرم ہوں' میں ان ے معافی مانگوں گا۔ میں ہی اپنی بیٹی نکہت کا قاتل ہوں' میں نے ہی اس کی ماں کو مارا ہے۔ مجھے نے لے جاؤ۔۔۔ اس کی اضطرابی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔ باپ کی ذہنی اور جسمانی ت دیکھ کر زلفی کو یقین ہو چلا تھا کہ عنقریب اس گھر میں کوئی اور قیامت ٹوٹنے والی ہے۔ ان سب کچھ دیکھ اور محسوس کر رہا تھا' کسی لمحے اس نے زلفی کو اکیلا نہیں چھوڑا تھا۔ قاسم گھر والے بھی ان کے دکھ درد میں دل و جان سے ان کا ساتھ دے رہے تھے' درمیان میں ں کی دیوار ضرور تھی مگر گھر دونوں ایک ہی تھے۔ شایان کی تین بہنیں بھی آئی ہوئی تھیں ین تارا کے ساتھ زلفی کے گھر کو سنبھالے ہوئے تھیں۔ شایان کی بہن شگفتہ جو میٹرک بعد کالج میں داخل ہو چکی تھی' زلفی کی امی کے سر پہ ٹھنڈے پانی کی پٹیاں لگا رہی تھی۔ دو ے وہ بخار میں مبتلا' چارپائی پہ پڑی ہوئی تھی اور دو روز سے شگفتہ بھی ادھر ان کے ساتھ ائی سے لگی بیٹھی تھی۔ نین تارا اور شایان کی بہن فرخ نے گھر کے دیگر کام پکڑے ہوئے ۔ زلفی' قاسم' شایان' والد کے گرد بیٹھے انہیں سنبھالنے کی کوشش کر رہے تھے۔۔۔

عید کا دن' محرم کے دسویں کی طرح گزر گیا۔ شام کے وقت کچھ واقف کار' محلے دار اظہار دی یا تماشا لگانے کے لئے آ گئے۔ شایان کے والد اور ماموں بھی پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ کے والد نیم بیہوشی کی حالت میں بے سدھ سے پڑے تھے۔ اچانک ان کی ناک سے پتلی ن کی لکیر نمودار ہو کر ان کی مونچھوں میں جذب ہو گئی' سر زور سے جھٹکا اور آنکھیں دیں۔ زلفی نے فوراً" ان کا سر تھام کر گود میں رکھا۔ "میاں جی' میاں جی" کہتے ہوئے لگا۔ قاسم فوراً" ٹیلی فون کی جانب لپکا۔ عید کا دن' ڈاکٹر کہاں سے ملتا۔ فوراً" اٹھا کر گاڑی ٹایا مگر میاں جی' شاید راستے میں ہی اپنا راستہ تبدیل کر کے کسی لمبے سفر پہ نکل گئے ۔ انسان بھی کیا چیز ہے۔ اچھے دنوں میں خون' خوشی اور دولت کی ترنگ اور زعم میں العنان اور نمرود بن کر زیر دست انسانوں کی قسمتوں کے فیصلے کرتا ہے مگر اس وقت وہ جانتا کہ اس کی قسمت کا فیصلہ قادر مطلق نے ایک حقیر سے مچھر کو مقرر کر کے کر دیا ہے۔

ٹکرچی کرچی ضمیر کے شیشے کی ایک چھوٹی سی کرچی دماغ کی نس پھاڑ گئی تھی' کرے ایک ا
بھگتیں سب--- مکافاتِ عمل نے ایک پل کی مہلت بھی تو نہ دی۔ کچھ کہا' نہ کچھ سنا۔ پاؤ
جوتا' نہ سر پکڑی۔ دماغ میں فتور وغرور کا گندا لہو ناک کی نالی سے بڑا بول بولنے والے منہ
گٹر میں گر کر جم گیا---

یکے بعد دیگرے تین ناگہانی اموات۔ رُسوائیوں' پریشانیوں اور مصیبتوں نے ان دونو
گھرانوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ مسلسل بے آرامی' شب بیداریاں' ذہنی تکدّر۔ ایک دوسر
سے بیزار' چلتے پھرتے مرُدے--- مرُے پہ سو درے۔

مرنے پرسے پہ سب رشتہ دار اکٹھے ہوئے۔ نگہت کے ماموں اور دونوں بہنیں بھ
آئیں' باپ کی میت سے لپٹ کر دل کھول کر روئیں۔ ماں بھی گئی' باپ بھی مرگیا۔ پھر گ
شکوے اور طرح طرح کی باتیں--- رشتہ دار تو پہلے ہی طلاق کی وجہ سے مخالف اور بدظ
تھے۔ زلفی کے والد کی موت کو قدرت کا فیصلہ اور اس کے کئے کا نتیجہ قرار دے کر ان ک
زخموں پہ نمک چھڑکتے رہے۔ زلفی نے ایک لفظ تک منہ سے نہ نکالا' وہ انہیں کسی حد تک
اپنی دل کی بھڑاس نکالنے میں حق بجانب سمجھتا تھا۔ بہنوں سے بہت اچھی طرح پیش آیا' اپ
والد مرحوم کی جانب سے ان سے معافی طلب کی اور درخواست کی کہ مرنے والے کو معاف کر
دیں۔ اس طرح حسن اخلاق اور موقع مصلحت سے کام لے کر کسی حد تک ان کی شکر رنجی اور
تلخی کو دور کیا۔

اس ابتلا کے دوران شایان کی سوچ اور فعل وفکر میں ایک نمایاں تبدیلی ظہور پذیر ہو چکی
تھی' شاید قدرت نے اسے تماشا بننے سے روکنے کی خاطر یہ سارا تماشا دکھایا تھا۔ نہ وہ لوگ
رہے' نہ وہ مجلس اور محفلیں رہیں۔ صبحیں' شامیں اور نہ وہ رت خرابے رہے۔ جہاں انداز
بدلے وہاں اطوار میں بھی خاصی تبدیلی آئی۔ تلخیٔ اوقات اور خرابۂ حالات نے اس کی
نرگسیت کھرچ کھرچ کر اس کے رگ وپے سے نکال دی۔ پانچ وقت پابندی سے نماز پڑھنے لگا'
سنجیدہ باوقار گفتگو سے چار آدمیوں میں بیٹھا معتبر اور ذمہ دار دکھائی دیتا تھا۔ نین تارا نے ا
غیرت کہہ کر اسے جھنجھوڑا تو تھا مگر باباجی کی شفقت اور بروقت رہنمائی نے اسے اندر سے بھ
گرفت میں لے لیا تھا۔ اس کا قلب آپو آپ ہی "اللہ ہُو" کے آہنگ پہ دھڑکتا رہتا۔ اتن
جوکھم جھیلنے اور مسلسل جان توڑ پریشانیوں کے باوجود اس کے چہرے بُشرے پہ ایک پُرنور
طمانیت جھلکتی تھی جیسے کسی لمبے سفر کے مسافر کے چہرے پہ منزل کے قریب پہنچ کر اطمینان کا
احساس جھلکتا ہے۔ اس نے زلفی سے دوستی' بھائی بندی کا حق نبھا دیا تھا۔ ادھر شایان کی بہن



شگفتہ نے اندرون خانہ اپنی بے لوث خدمت' دل جوئی اور سلیقہ مندی سے ان مصیبت زدوں
کو حوصلے کا سہارا دیا ہوا تھا۔

چالیسویں کے بعد شایان کے والدین اور چھوٹی بہن فرح واپس چلے گئے' شایان اور شگفتہ
یہیں رہے۔ زلفی نے شایان کو اور شگفتہ کو زلفی کی ماں نے جانے نہیں دیا تھا۔

★★★

گڈو اور جان' کراچی میں خوب دعوتیں اڑا رہے تھے۔ کراچی تو ہے ہی سیر سپاٹوں'
ڈائننگ' پکنک اور دھوم میں اڑانے کا شہر!--- جان کو ریڈ روز کی تحویل میں دے کر وہ قدرے
مطمئن ہو گئی تھی اور مکمل اطمینان تو تب ہوا جب اخباروں کے مطابق پولیس نے اسے مردہ
دریافت کر لیا تھا۔ وہ خوب ہنسی' کسی نامعلوم مردہ لڑکی کی تصویریں دکھا دکھا کر جان کی خوب
مدد کرتی رہی۔ یہ امر بھی طمانیت بخش تھا کہ شبے میں حراست میں لئے گئے افراد کو بھی مکمل
ضمانتہ اور اطمینان کے بعد کلیر کر دیا گیا ہے۔ اس خوشی میں مس ٹوٹو نے سب دوستوں کو ایک
فائیو سٹار ہوٹل میں دعوت دی تھی---

ریڈ روز نے چند ہفتوں میں جان کی کایا ہی پلٹ دی تھی۔ اپنے خاص ڈاکٹر کے پرائیویٹ
کلینک میں اس کی پلاسٹک سرجری کروادی تھی' ریڈ روز خود بھی اپنے اس باکمال دوست کی
مہارت کا نمونہ تھی۔ یہ ڈاکٹر امریکہ کا تربیت یافتہ تھا۔ ایک مصور کی طرح وہ خستہ حال' کٹی
پھٹی سوختہ صورتوں' جسموں اور اعضا کو نئی تازگی' نئی صورت اور خوبصورت انداز دے کر گویا
نیم تراشتا تھا۔ خوبصورت لڑکیوں کا شوقین بھی تھا۔ اس کی یہ ضرورتیں ریڈ روز پوری کرتی
تھی اور وہ اس کے کام آتا تھا' جان کے سلسلے میں اس نے کمال کر دیا۔ مختلف آپریشن'
ایکسرسائز' عجیب وغریب انداز ونوع' سوئی ٹانکوں کی جگہ لیزر سٹچنگ اسی نے یہاں متعارف
کروائی تھی۔ آپریشن کے نشانات تک باقی نہیں رہتے' نہ دکھائی دیتے ہیں۔ لیزر ہیٹنگ
تکنیک سے کھال کے نیچے بالوں کی جڑوں کو تلف کرنا یا مخصوص جگہ پہ بالوں کی افزائش کرنا بھی
اس کا کمال تھا۔ وہ امریکہ' فرانس اور انگلینڈ میں بے شمار تھیٹر اور اوپیرا ہاؤسز کے فنکاروں کے
کامیاب آپریشن کر چکا تھا۔ یہ فنکار مرد ہوتے ہیں لیکن کھیل کی روایتی ضرورت کے مطابق وہ
عورتوں کے کردار ادا کرتے ہیں' انہیں وجوہ کی بنا پر وہ اپنے اعضا کی پلاسٹک سرجری کرواتے
ہیں۔ آواز کے علاوہ انہیں پہچاننا ناممکن اگر نہیں تو مشکل ضرور ہوتا ہے۔ پیرس' لندن'
نیویارک کے بڑے بڑے اوپیرا ہاؤس انہی فنکاروں کے دم قدم سے ہیں۔ اسٹیج پہ ناچنے گانے
والی خوبصورت نازک اندام لڑکیوں کو تماشائی دیکھ دیکھ کر لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ان پہ مرمٹتے

ہیں، انہیں تحفے اور گلدستے بھیجتے ہیں، آٹو گراف لیتے ہیں۔ ایسے لوگوں میں بہت ہی کم شاید اس حقیقت سے آشنا ہوتے ہیں کہ یہ فنکار اصل میں مکمل مرد ہیں، بال بچے دار ہیں۔

نگہت یعنی جان کی پلاسٹک سرجری مکمل ہونے کے بعد ریڈ روز نے اسے اپنے ہیلتھ سنٹر میں ہی ٹریننگ پہ لگادیا۔ یہ فل ٹائم جاب تھا، خود ایکسر سائز کرنا اور سٹوڈنٹ کو بھی کروانا۔ ٹوٹو بھی اس کی ٹیچر تھی۔ اس نے اس کے لہجے، اٹھنے بیٹھنے، چلنے کے ڈھنگ کو تبدیل کیا، انگریزی میں بات چیت کرنا سکھائی جبکہ ریڈ روز اسے ایک خونخوار نڈر فائٹر بنا رہا تھا۔ جوڈو کراٹے سکھائی، کمانڈو ایکشن سکھائے۔ اسے منشیات کے بارے میں بتایا کہ کبھی گھٹیا نشہ مت کرو۔ دیسی شراب، بھنگ چرس، حشیش، کش، ہیروئن، یہ گھٹیا لوگوں کی دلچسپیاں ہیں۔ یہ نشے انسان کے خیالات اور اطوار میں سفلہ پن اور بزدلی پیدا کرتے ہیں، اعلیٰ سوسائٹی میں یہ پسندیدہ نہیں ہیں۔ ہمیشہ سکاچ وسکی شیمپین اور اعلیٰ امپورٹڈ سگریٹ یا سگار پیو۔ چائے گھٹیا لوگوں کا مشروب ہے، وائٹ بھی نہیں بلکہ بلیک کافی پیو وِد آؤٹ شوگر۔ منہ میں ہمیشہ چیونگم رکھو۔ گلے میں لاکٹ، بازوؤں میں بریسلٹ اور ہمیشہ لانگ شوز پہنو۔ پولیس سے پھڈا مت ڈالو، مک مکا کر کے جان بچاؤ۔ بدمعاشوں، غنڈوں سے کبھی مت ڈرو۔ چاقو گھونپنے اور فائر کرنے میں ہمیشہ پہل کرو ورنہ مارے جاؤ گے۔ بات پکی کرو، وعدہ خلافی اور دھوکہ مت دو۔ جو احسان کرے اسے کبھی فراموش مت کرو۔ اس کے اعتماد کو دھوکہ نہ دو۔۔۔۔

جان نے بھی جی جان سے سب کچھ سیکھا۔ ٹریننگ کے دوران اس نے کسی مرحلے پہ بھی اپنے محسنوں کو مایوس ہونے کا موقع نہیں دیا بلکہ وہ ان کی توقعات سے بہت آگے بڑھ کر ہونہار اور قابل بھروسہ ثابت ہوا۔

ٹوٹو کے ایک بہت ہی کلوز فرینڈ کی آڈیو البم ریلیز ہوئی تو ایک فائیو سٹار ہوٹل میں پارٹی ارینج تھی، پاپ میوزک اور ڈانس کا پروگرام بھی تھا۔ گلیمر کی دنیا کی ساری کریم مدعو تھی۔ اسٹیج، تھیٹر، کیٹ واک فیشن شو، میوزیشن، سنگر، ماڈل، ہر شو بزنس کے شعبہ کے لوگ آئے ہوئے تھے۔ ایک سے ایک حسین سوبر الٹرا لڑکیاں، اونچی سوسائٹی کے لوگ جن کا لہجہ، لباس، سوچ، انداز، کھانا پینا، ملنا ملانا، ہر چیز عام لوگوں سے الگ تھلگ ہوتی ہے۔ ان کی تہذیب بھی ان کی ثقافت اور روایات بھی علیحدہ۔ اس ملک میں رہتے ہوئے بھی ان کی اخلاقی کتابیں الگ، ان کی سماجی قدریں علیحدہ، ان کی مذہبی سوچیں جداگانہ۔ ان میں اور ہم عامیوں میں وہی فرق ہے جو کسی گاؤں میں چرخی والے کھلے کنوئیں کے پانی اور فرانس سے منگوائے ہوئے منرل واٹر میں ہے۔



یہ پہلا فنکشن تھا جس میں جان کو بصد خاص اہتمام لے جایا گیا۔ بلیک ڈنر سوٹ، میچنگ کالر بو، اٹالین بلیک سنیک لیدر شوز، سپورٹس کٹ بال، کان میں بلیک اسٹون رنگ ٹاپس، انگلی میں گولڈن ڈریس رنگ۔۔۔۔ استقبال کرنے والوں میں وہ بھی ریڈ روز اور ٹوٹو کے ساتھ کھڑا تھا۔ کون جانے یہ مسکرا مسکرا کر استقبال کرتا ہوا سمارٹ سانو جوان ایک یتیم و بیسر آفت زدہ مفلوک الحال لڑکی ہے جس کی ماں ایڑیاں رگڑتے رگڑتے اس دنیا سے چلی گئی، جس کے بہن اور بھائی اس کی تلاش میں خاک چھانتے پھر رہے ہیں۔ جو چند مہینے پہلے بڑے ذلیل قسم کے لوگوں میں چوہیا کی طرح پھنسی ہوئی تھی، جو ان گنت لوگوں کی ہوس کا نشانہ بنی اور جس کا اصلی نام نگہت تھا، نقلی نام شمسہ اور فرضی نام جان ہے۔ جو کرسچین نہیں، مسلمان ہے۔ جس کی پیدائش پہ اس کے ماں باپ نے کہا تھا کہ ہمارے گھر اللہ کی رحمت آئی ہے۔ جو اپنی نسائیت کا گلا گھونٹنے پہ مجبور ہوئی، جو خلاف فطرت زندگی بسر کرنے پہ بوجہ آمادہ ہوئی، جس کو کچھ خبر نہیں کہ اس کا انت کہاں ہے اور یہ بادسموم کے جھکڑ اسے کس قعر مذلت میں لے جا کر پٹخیں گے؟۔۔۔ ایسی پارٹیاں، ریڈ روز اور ٹوٹو اکثر دیا کرتے تھے، ہوتے تو یہ پرائیویٹ اور سوشل فنکشن تھے مگر درپردہ ان کا اہتمام اور سارا بندوبست ہوٹل انتظامیہ ہی کرتی تھی۔ یہ لوگ صرف سامنے رہ کر ایسے پروگراموں کو سوشل یا پرائیویٹ گیدرنگ کی شکل دیتے تھے۔ اعلیٰ طبقے کے عیاش دولت مند، وہ غیر ملکی سیاح یا کاروباری لوگ جو دوسرے ملکوں کی اوباش عورتوں سے ملنا اپنے وزٹ کا ایک ضروری جزو سمجھتے ہیں۔ مقامی لوگ، ہوٹل میں ٹھہرنے والے متمول مہمان، بڑی بڑی کمپنیوں کے ایگزیکٹو، ریپ جو محض ایک آدھ شب کے لئے ٹھہرتے ہیں اور جن کی وزٹ ٹمپریری سیکرٹری کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ ایسے فنکشن ہوٹل کے لونگ ایریا میں کھلے لان یا موسم کے مطابق کسی بڑے ہال میں ترتیب دیئے جاتے تھے۔ ایسے لوگوں سے ریڈ روز اور ٹوٹو کی باقاعدہ ملازم تربیت یافتہ لڑکیاں بڑی خوبصورت پلاننگ کے تحت متعارف کرائی جاتیں جو خود کو پڑھی لکھی، آزاد خیال، کسی مخلص دوست کی متلاشی اور بڑے گھرانوں کی لاڈلی بیٹیاں ظاہر کر کے مقابل کو اپنے سحر میں پھانس لیتیں۔ پھر ہوٹل کی شاندار کاروں کی سیر، قیمتی شرابوں، مہنگے کھانوں، ہوٹل گفٹ شاپس سے بھاری خریداری کرواتیں۔ شب بسری کے لئے عام کمروں کی بجائے ایگزیکٹو سوئٹس کے لئے فضا ہموار کرتیں۔ اس طرح جہاں ہوٹل والوں کو فائدہ پہنچتا وہیں ان کے بھی پوبارہ ہوتے۔ خود بھی نقدی اور تحائف کی شکل میں معاوضہ لیتیں۔ ''پرندے'' کو زیادہ سے زیادہ ہوٹل میں قیام کرنے پہ اصرار کرتیں۔ پرس کے آخری ڈالر، سٹرلنگ، روبل، ین، لیرے، روپے تک ان کے

ساتھ رکھی رہتیں۔ کریڈٹ کارڈ بھی استعمال کروالیتیں۔

ایسی کال گرلز بڑے بڑے ہوٹلوں کی لابی' لانوں' کافی شاپس' ریسٹوران' بوتیک شاپ' سوئمنگ پول' ٹینس لان وغیرہ میں مختلف روپ' سٹائل اور گٹ اپ میں ملیں گی--- ریڈ روز اور ڈیناٹو اس قسم ہوٹلوں میں اپنی ٹرینڈ ملازم کال گرلز سے یہی بزنس کرواتے تھے لیکن یہ کام اتنا منظم اور نیٹ ورک کی سہولتوں سے اتنا ایکوریٹ تھا کہ اس میں نہ تو کوئی قانونی مداخلت کا خدشہ تھا اور نہ کوئی اور پرابلم--- یہ لڑکیاں اپنے شکار کو اتنی خوبصورتی سے گندہ کرتی تھیں کہ وہ بے چارہ خود ہی منہ چھپائے پھرتا۔

اس پارٹی فنکشن میں ریڈ روز نے جان کو عملی طور پر اپنے اس کام کے کچھ نمونے دکھائے' اپنی لڑکیوں سے ملوایا۔ ریڈ روز نے اس کے دماغ میں بٹھادیا تھا کہ مرنا بہت آسان اور جینا بہت مشکل ہے۔ بازی ہار جاؤ تو پھر یا تو مرجاؤ اور اگر یہ نہ کرسکو تو پھر ہر صورت میں بازی جیتو چاہے اس کے لئے تمہیں کچھ کرنا یا بننا پڑے۔ اچھائی برائی' نیکی بدی' گناہ ثواب' جھوٹ سچ' دھوکا ایمانداری' زندگی موت' عورت مرد' سب کچھ بکواس ہے۔ ان چکروں اور ہیر پھیر میں مت پھنسو--- تم کس طرح مقصد حاصل کرسکتے ہو' ہمیشہ اس پہ دھیان دو۔ تم نے لڑکی کی حیثیت سے کیا حاصل کیا؟ مردوں نے ہمیں لڑکی ہونے کی سزا دی۔ تمہیں خارش زدہ کتیا بنا کر سڑک پہ پھینک دیا۔ تم اب لڑکی نہیں' مرد ہو میری طرح اور جو ٹیڑھی بات کرے' جو آنکھیں دکھائے' انگلیاں ڈال' ڈیلے نکال اس کی ہتھیلی پہ رکھ دو۔ سگریٹ پیو' شراب پیو' عیش کرو' دولت پیدا کرو۔ بازی جیتو کہ جو جیتا وہی سکندر اور جو ہارا وہ مداری کا بندر!---

★★★

اس پارٹی کے اختتام پہ کل اٹھارہ لڑکیاں کام سے لگی تھیں۔ دس لڑکیاں بطور ٹمپریری سیکرٹری' پانچ پارٹ ٹائم ٹیلی فون اٹینڈنٹ اور تین روم میٹ اسسٹنٹ--- گڈو بھی لاہور کے کسی بزنس مین کی سیکرٹری کی حیثیت سے چوبیس گھنٹوں کے لئے آن جاب تھی۔ یہ لاہور کا ایک سکریپ امپورٹر تھا جس کا ایک آدھ بحری جہاز ہر مہینے کراچی پورٹ پہ لنگرانداز ہوتا تھا۔ لاہور میں ایسے بزنس مین چاہے بھاٹی چوک میں سری پائے کا ناشتہ کرتے ہوں مگر لاہور سے باہر اپنے کاروباری اسٹیٹس کے مطابق کسی فائیوسٹار ہوٹل سے کم کسی جگہ قیام نہیں کرتے۔ ایسے اکثر بزنس مینوں کو پھر ایک دو دنوں کے لئے لیڈی سیکرٹری کی بھی ضرورت ہوتی ہے جو ان کے ٹیلی فون سنے' کاغذات مکمل کرے اور متعلقہ محکموں اداروں سے اپنی پیشہ ورانہ مہارت سے کام لیتے ہوئے جلد سے جلد کام نکال سکے' باقی مسئلہ باس کے ذوق شوق اور ضرورت کے



ابق ہوتا ہے یا پھر لڑکی کی پیشہ ورانہ مہارت اور طریقہ واردات پہ ہوتا ہے کہ وہ کس طرح ربلند پرواز کو زیر دام لاتی ہے۔

گڈو چوبیس گھنٹوں کے لئے آن جاب تھی مگر لاہوری باس نے کمال فیاضی سے کام لیتے ئے یا مجبوراً" اسے آٹھ گھنٹے بعد ہی فارغ کردیا۔ گڈو کی پکنک کال پہ جان اکیلا ہی اسے ے ہوٹل پہنچ گیا۔ لابی میں داخل ہوتے ہی جان نے گڈو کو دیکھ لیا۔ وہ اپنے لاہوری باس کے تھ گفٹ شاپ میں کھڑی کچھ دیکھ رہی تھی۔ وہ بھی ذرا پرے ایک صوفے پہ بیٹھ کر اس کے غ ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ اتنے میں ایک سمارٹ سا نوجوان گڈو کے باس کے پاس آیا اور ائل تھا کر ذرا ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ جان کے دماغ میں اک دم فلڈ لائٹ کی چکاچوند سی کیفیت ا ہو گئی' یہ تو وہی ریس کورس پارک میں تھپڑ والا شوکت ہے۔ غور سے دیکھا تو قدرے ا ہوا لگا۔ بھرا بھرا سا جسم مگر پہلے سے کہیں زیادہ سمارٹ--- بالکل وہی تھا۔ اس کا مطلب تھا وہ اس لاہوری باس کا ملازم ہے۔ لاشعوری طور پر جان نے منہ دوسری جانب پھیر لیا یہ چ کر کہ وہ اسے کہیں پہچان نہ لے۔ اوپر سے بہروپ کچھ بھی ہو' تھی تو وہ ایک لڑکی!--- جب اسے اپنی حماقت کا احساس ہوا تو وہ ہلکے سے مسکراتے ہوئے پھر اس کی جانب دیکھنے لگا روہ' وہاں نہیں تھا۔ گڈو ابھی تک وہیں کھڑی کچھ دیکھ رہی تھی۔ اس کا لاہوری باس باہر لان گارڈن چیئر پہ بیٹھا موبائل فون پہ کسی سے لاہوری زبان اور انداز میں جھگڑ رہا تھا۔ جان نے ادھر ادھر ہر طرف دیکھا' وہ نظر نہ آیا۔ وہ سوچنے لگا کہ چلو اچھا ہوا' مل کر بھی کیا لینا دینا تھا۔ اس ے اسے اپنے دماغ سے جھٹکنا چاہا مگر وہ تو جیسے چمٹ گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ ماضی کے کسی ویں میں اتر جاتی' گڈو نے اسے دیکھ لیا اور وہ اس کے پاس چلی آئی۔

"ہیلو جان---!" وہ اس کے پاس بیٹھتے ہوئے کہنے لگی۔ "آئی ایم سوری' تم شاید کافی ے یہاں بیٹھے میرا انتظار کر رہے ہو--- دراصل میرے باس کا مزید ایک رات یہاں نے کا پروگرام بن رہا ہے۔ اسے ایک ٹیلی فون کال کا انتظار ہے اسی لئے ابھی تک کوئی فیصلہ ں ہو پا رہا۔ تم یہیں بیٹھو' وہ ٹیلی فون لائن پہ ہے---"

"کوئی موٹی مرغی ہے---؟" جان نے آنکھ مارتے ہوئے آہستہ سے پوچھا۔

"ہاں--- مگر مرغی نہیں' لڑنے والا مرغا ہے---"

"اکیلا ہے یا---؟"

"اس کا ایک میل سیکرٹری بھی ساتھ ہے' وہ گلف صدر میں ٹھہرا ہے---"

"یہاں ساتھ کیوں نہیں' سیکرٹری کو تو ساتھ ہونا چاہئے---؟"

"جان! بڑے لوگ جب اپنے اسٹیشن سے باہر کسی بڑے ہوٹل میں ٹھہرتے ہیں تو ان کے سیکرٹری بدل جاتے ہیں' خاص طور پر میل سیکرٹری کے لئے تو قطعی باس کے ساتھ رہنے کی گنجائش نہیں ہوتی---"

جان واپس آگیا کیونکہ گڈو مزید ایک رات کے لئے آن جاب تھی۔

★★★

رات نو بجے کے قریب گلف ہوٹل میں شوکت کے کمرے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔

"مسٹر شوکت بول رہے ہیں---؟" استفسار کیا گیا۔

جی' میں بول رہا ہوں--- فرمایئے؟" جواب ملا۔

"مجھے پہچانا---؟"

"نہیں--- اگر آپ اپنے تعارف کی زحمت گوارہ فرمالیں تو میرے لئے آسانی ہو جائے گی۔"

"مجھے آپ کا تھپڑ ابھی تک یاد ہے اور آپ میری آواز بھی نہیں پہچان سکے؟"

اُدھر کافی دیر خاموشی رہی۔

"آپ سن رہے ہیں یا---؟"

"تم کہاں سے بول رہی ہو اور تمہیں میری یہاں موجودگی کا علم کیسے ہوا---؟" لہجے میں حیرت نمایاں تھی۔

"میں اپنے ذاتی منہ سے بول رہی ہوں' باقی رہی بات کہ مجھے تمہاری یہاں موجودگی کا علم کیسے ہوا تو میں نے تمہیں آج ہوٹل میں دیکھا تھا--- ظاہر ہے' میں کراچی میں ہی ہوں۔"

"تم مجھے وہاں کیوں نہیں ملیں--- کیا تم یہاں آ سکتی ہو یا مجھے کہو تو میں پہنچ جاتا ہوں؟--- سنو! میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔ اپنی زیادتی کی معافی مانگنا چاہتا ہوں' تم سے بہت سی باتیں کرنا ہے۔ تم نہیں جانتیں کہ میں تمہیں کب سے تلاش کر رہا ہوں--- تم کہاں تھیں؟"

"رکو' رکو۔ ذرا چھری کے نیچے دم لو--- سنو! میں اس وقت تمہارے کسی سوال کا جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ تم مجھے صرف لاہور کا اپنا کنٹیکٹ نمبر اور ایڈریس لکھوا دو تو مہربانی ہوگی' فوراً"---"

اس نے اپنا ٹیلی فون نمبر اور پتہ لکھوایا اور اس کے بعد ادھر سے ٹیلی فون بند ہو گیا۔



وقت کا ایک ہاتھ اگر زخم لگاتا ہے تو دوسرا دستِ شفا بھی ہوتا ہے۔ وقت بڑے بڑے ...رے گھاؤ دھیرے دھیرے مندمل کر دیتا ہے۔ ناقۂ وقت آہستہ آہستہ بڑی مست خرامی سے' ...ائب و محال کے بڑے بڑے لق ودق صحراؤں سے سرکتا ہوا' دکھ واندوہ کی بادِ سموم سے بچتا ...ا صبرِ و استقامت کی حدی خوانیوں میں مست الست امیدوں' مسرتوں اور کامرانیوں کے ...تان کی جانب رواں دواں رہتا ہے--- بہن کا بچھڑنا' باپ کی ناگہانی موت زلفی کے لئے ...ے بڑے حادثے تھے۔ انسان جہاں کچھ گنواتا ہے۔ یقیناً" وہاں سے کچھ پاتا بھی ہے' یہی ...رت کا اصول ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو یہ دنیا بہت جلد انسانوں سے خالی ہو جائے۔ انسانی دماغ ...ا چھوٹی چھوٹی جزئیات تادیر محفوظ رکھتا ہے وہاں بڑی بڑی باتیں سرے سے ہی نکال پھینکتا ...ے۔ وہ یہ خود ہی فیصلہ کرتا ہے کہ کیا نکالنا ہے' کیا سنبھالنا ہے۔ اس طرح نسیان بھی بہت بڑی ...ت ہے۔ کسی چیز کو بھول جانا' دماغ سے نکال دینا انسان کے لئے بڑی آسانیاں پیدا کر دیتا ...ے۔ کچھ بھول جانا' کچھ یاد کر لینا' اسی طرح ہی زندگی اپنے بہاؤ پہ کسی ندی کی طرح بہتی رہتی ...ے۔ چھوڑ جانا' کچھ لے کر آگے بڑھتے رہنا--- شایان کی رفاقت اور دوستی اس کے لئے کسی ...ت غیر مترقبہ سے کم نہ تھی۔ ہولے ہولے زلفی زندگی کی چہل پہل' جدوجہد اور ہمہ ہمیوں ...جانب واپس لوٹ رہا تھا' جاڑے کی دھوپ کی مانند روزمرہ کی زندگی کی ضرورتیں ذمہ ...یاں' اس کی ٹھٹھری ہوئی سوچیں' کپکپاتی اداسیاں اور یخ بستہ اعتماد' جیسے نرم نرم تمازت ...بحال ہو رہا تھا۔ شوروم' ورکشاپ میں باقاعدگی سے جانے لگا۔ پھر جمعرات ... شایان کا ...پکڑ کر بیٹھ گیا۔

"بھائی مجھے کچھ کرنے بھی دو گے یا اپنی گرہ میں سونٹھ کی گانٹھ کی طرح باندھ رکھو ---؟"

"مطلب---؟" شایان نے بڑے بڑے دیدے نکال کر پوچھا۔

"مطلب یہ کہ گھر جاؤ۔ امی' ابو' بہنیں راہ تک رہے ہوں گے۔ شگفتہ کئی ہفتوں سے یہاں پہ ہے' اداس ہو گئی ہو گی---"

"تو صاف صاف کہو کہ تم مجھ سے اب تنگ آ گئے ہو--- بھائی' سیدھی طرح کہو کہ میں دفع ہو جاؤں' دوسروں کے کندھوں پہ بندوق رکھ کر کیوں فائر کر رہے ہو---؟"

"ہاں' ہاں--- اور کس طرح کہوں؟--- جاؤ بھائی! تم جاؤ گے تو میں بھی کسی جانب دھیان دے سکوں گا۔ تمہاری موجودگی میں تمہارے سوا کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا---"

شایان اسے گھورتے ہوئے پوچھنے لگا۔ "تم یقین سے کہتے ہو کہ میرے بعد تم سب کچھ ٹھیک ٹھاک سنبھال لو گے' اداس یا پریشان نہیں ہو گے؟"

"نہیں بھائی! کہہ جو دیا' نہیں---" اس کی آنکھوں میں آنسو تھے' اٹھ کر شایان کو سینے سے لگا لیا۔ "ظالم! تیرے بغیر تو میں جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ تو نہ ہوتا تو مجھے جینے کا حوصلہ کون دیتا' کون مجھے سنبھالتا؟--- مصیبتوں کی اس آندھی میں تو نے ہی تو میرا ہاتھ تھام رکھا تھا ورنہ میں زندگی سے بچھڑ کر کبھی کا کہیں خس و خاشاک کی مانند اڑ گیا ہوتا---" پھر وہ الگ ہو کر آنسو پونچھتے ہوئے بولا۔ "شایان! بہت دن ہو گئے۔ کتنا بڑا کلیجہ ہے تمہارے امی ابو کا' محض میری دلجوئی کی خاطر تمہاری جدائی برداشت کر رہے ہیں--- بابا! تم اب ان کے پاس جاؤ' ان کی خوب خدمت کرو--- میں خود کل تمہیں چھوڑنے جاؤں گا۔"

"تمہاری خواہش اور حکم یہی ہے تو ٹھیک ہے لیکن میں باباجی سے ملے اور ان کی اجازت کے بغیر نہیں جاؤں گا--- داتا دربار والی ملاقات کے بعد ان کا کہیں سراغ ہی نہیں ملا' پان کی دکان پہ بھی نظر نہیں آتے۔ کہاں تلاش کریں انہیں---؟"

"چلو' آج دکان پہ چلتے ہیں۔ ممکن ہے' وہیں سے ان کا کوئی اتا پتہ مل جائے---"

وہ اسی وقت اٹھ کر پان والی دوکان پر گئے تو وہاں سے معلوم ہوا کہ وہ تو ملک سے باہر گئے ہوئے ہیں۔

جمعہ کے دن صبح صبح زلفی' اس کی والدہ' شایان' شگفتہ اور قاسم شیخوپورہ روانہ ہو گئے۔ گھر والوں کے لئے گویا عید کا چاند آج ہی نظر آیا تھا۔ ماں تو دیکھتے ہی خوشی سے بیہوش ہو گئی' بوڑھے باپ نے ہچکیاں لیتے ہوئے اپنے بیٹے کو سینے سے چمٹا لیا۔ دونوں شادی شدہ بہنیں بھی اتفاق سے آئی ہوئی تھیں' بھائی کو دیکھ کر بہنوں کی آنکھوں کے بند بھی کھل گئے۔ عجیب سماں تھا۔ قاسم اور زلفی بھی ضبط نہ کر سکے۔ فوری طور دو کالے بکرے صدقہ کئے گئے۔ پاس پڑوس' عزیز و اقارب' جسے جسے خبر ملی وہ دوڑا چلا آیا۔ ماں باپ کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ گویا شایان کا



نیا جنم ہوا تھا۔ پھولوں سے لاد کر دولہے کی طرح سجا بنا کر بٹھایا۔ شام کو تنبو قناتیں' دریاں کرسیاں لگ گئیں۔ بالکل شادی جیسی دعوت تھی۔ زلفی اور قاسم کی پذیرائی بھی اسی طرح ہوئی۔ بہت عرصے بعد ان حرماں نصیبوں کو خوشی نصیب ہوئی تھی۔ زلفی کی والدہ ان کے لئے بہت سے تحائف لے کر آئی تھیں۔ شایان اور خاص طور پر شگفتہ کی طبیعت' سگھڑ پنے اور اخلاق ہمدردی کی بہت تعریف کی اور اس کڑے وقت میں ساتھ دینے پر شکریہ ادا کیا۔ شایان کے گھر والوں اور خاص طور پر بہنوں نے زلفی' اس کی والدہ کی خاطر مدارت میں کوئی کمی نہ چھوڑی۔

دوسرے روز زلفی کاروباری مصروفیت کی وجہ سے پھر آنے کا وعدہ کر کے واپس چلا آیا مگر اس کی والدہ اور قاسم کو انہوں نے اصرار کر کے روک لیا۔ زلفی کی امی کو تو جیسے شگفتہ نے اپنی محبت' خدمت اور اخلاق سے دیوانہ کر دیا ہوا تھا۔ اٹھتے بیٹھتے' میٹھی نظروں سے اسے تکتے ہوئے تعریفیں کرتے نہ رکتیں اور وہ بھی "خالہ جی' خالہ جی" کہتی رہتی۔ ان کی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کا خیال رکھتی جیسے وہ پیدا ہی ان کی خدمت اور عزت کرنے کے لئے ہوئی ہو۔ شگفتہ کی بہنیں' والدین ان کے آپس کے پیار اور گہری دلچسپی کو محسوس کر رہے تھے اور شایان سے بھی یہ سب کچھ چھپا ہوا نہ تھا--- یونہی ایک روز سب سے بڑی بہن نے شایان سے کہا۔

"تم کچھ محسوس کر رہے ہو---؟"

"مثلاً---؟" وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"---یہی کہ لاہور والی خالہ' شگفتہ کو بہت چاہتی ہیں۔ ہر وقت اس کی تعریفیں کرتی رہتی ہیں' ایک لمحہ بھی اسے ادھر ادھر ہونے نہیں دیتیں۔ مجھے تو دال میں کچھ "کالا" دکھائی دیتا ہے---"

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "باجی! شگفتہ نے ان کی بڑی خدمت کی ہے۔ خالہ کی جو حالت تھی وہ تم نے نہیں دیکھی' یوں سمجھو کہ تین موتیں چند دنوں میں ہو گئیں۔ اچھا بھلا خاوند چند دنوں میں بیٹھے بٹھائے رخصت ہو گیا۔ یہ نین تارا اور شگفتہ ہی تھیں جنہوں نے انہیں سنبھالا ورنہ ہمیں تو ان کی جان کے لالے پڑ گئے تھے۔ ابھی ان کا زخم تازہ ہے' اسی وجہ سے شگفتہ ان کی دلجوئی میں لگی رہتی ہے---"

"تم ٹھیک کہتے ہو' میرے بھولے بھائی! اور میں بھی ٹھیک کہتی ہوں۔ عورت' عورت کی نظر کو پہچانتی ہے--- تم دیکھنا کہ بہت جلد خالہ' شگفتہ کا رشتہ مانگیں گی---" وہ بڑے مفکرانہ انداز میں ہتھیلی پہ اپنی بھاری سی ٹھوڑی ٹکاتے ہوئے مزید بولی۔ "ایک بات سمجھ میں

نہیں آئی۔ پہلے تو زلفی' نین تارا کے لئے اپنی دلچسپی دکھا رہے تھے' یہاں تک سنا تھا کہ وہ اگر شادی کرے گا تو اس سے' ورنہ وہ ساری عمر کنوارہ رہنے کا عزم کئے ہوئے ہے مگر اب تو پانسا پلٹا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔"

"بال کی کھال نکالنے والی' میری باجی! ممکن ہے کہ کبھی زلفی نے ایسا سوچا ہو اور ایسے کہا بھی ہو مگر حقیقت یہ نہیں ہے۔ وہ تو اب اسے اپنی بہن سے زیادہ مان دیتا ہے' نین تارا بھی اسے اپنا بڑا بھائی سمجھتی ہے۔ نین اگر ارادے کی کچی ہوتی تو شاید یہ کام ہو بھی جاتا مگر میرے لاکھ سمجھانے کے باوجود وہ اپنے فیصلے اور ارادے پہ قائم ہے۔ وہ ہر حالت میں مجھ سے شادی کی خواہاں ہے' زلفی بھی اسے میری منگیتر سمجھتا ہے---"

"پھر خالہ یہاں سے شگفتہ کا ہاتھ لئے بغیر نہیں جائیں گی--- ویسے تمہارا کیا خیال ہے' زلفی کیسا لڑکا ہے۔ اس کا گھرانا' عادت' طبیعت--- تم تو کافی عرصے سے اس کے ساتھ ہو' ہر بات جانتے ہو گے؟"

شایان' پریشان سا ہو گیا اور بولا۔ "یہ سب باتیں تم مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہو' امی ابو سے کرو--- زلفی میرا بھائی ہے۔ دوست ہے' جان سے پیارا ہے۔ اس کو شاید مجھ سے بہتر کوئی نہیں جانتا۔ میں ایمانداری سے محسوس کرتا ہوں کہ میں جو آج اس حالت و صورت میں یہاں موجود ہوں تو یہ سب باباجی' زلفی اور قاسم کی وجہ سے ہے۔"

"یہ باباجی کون ہیں' کچھ تھوڑا بہت میں نے بھی ان کے بارے میں سنا ہے--- ہیں کون' کہاں رہتے ہیں---؟"

"میں خود بھی کچھ نہیں جانتا کہ وہ کون ہیں' کہاں رہتے ہیں اور کیا ہیں لیکن جو بھی ہیں' خوب ہیں۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ جیسے وہ مجھے' مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔ ان سے کچھ بھی چھپا ہوا نہیں ہے مگر وہ خود چھپے ہوئے ہیں۔ ان کی شخصیت--- ان کی باتیں اور آنکھیں--- اک اتھاہ' بیکراں سمندر کی مانند ہیں جن کی گہرائی کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ صرف خوشبو کی لہر کی طرح انہیں محسوس کیا جا سکتا ہے مگر کسی بھی طرح گرفت میں نہیں لایا جا سکتا--- وہ زندگی اور توانائی عطا کرتی ہوئی کرن کی مانند ہیں جیسے دیکھا اور محسوس کیا جا سکتا ہے' پکڑا نہیں جا سکتا--- وہ کہاں ملیں گے--- کب ملیں گے' کیسے ملیں گے' اس کے بارے میں بھی کچھ کہا نہیں جا سکتا---" شایان باباجی کا ذکر کرتے ہوئے کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو گیا تھا۔ وہ بھول ہی گیا کہ اس کے سامنے اسی کی بڑی باجی بیٹھی ہوئی ہے۔ جو بڑی بڑی آنکھیں اس کے چہرے پہ گاڑے اس کی باتیں سن رہی تھی۔



زلفی آنے والی جمعرات' دوپہر کے کھانے سے قبل ہی شیخوپورہ پہنچ چکا تھا۔ وہ اپنی امی کو لینے' شایان اور قاسم کی خیر خیریت معلوم کرنے آیا تھا۔ صحت طبیعت بھی ٹھیک تھی' موڈ بھی خوشگوار تھا اور کچھ سامان بھی ساتھ تھا جو شایان کے لاہور کے فلیٹ میں پڑا ہوا تھا۔ کنو' مالٹے' بڑے بڑے قندھاری انار اور شایان کے لئے انبالہ سویٹ والوں سے چم چم اور برفی بھی وہ لے کر آیا تھا۔ شایان میں ایک خوشگوار تبدیلی محسوس کر کے زلفی بڑا خوش ہوا۔ صحت بھی ٹھیک ہو گئی تھی۔ گھر میں ماں' باپ اور بہنوں' عزیزوں کی خوشیاں' کھانا پینا' فراغت' محبت پیار' ان چیزوں نے شایان کے اندر سے ایک نیا شایان نکال دیا تھا--- جمعرات کا دن باتوں' ملاقاتوں' خوش گپیوں میں گزر گیا۔ جمعہ سیر و تفریح کی نذر ہوا۔ شایان کے پرانے دوستوں سے ملاقاتیں رہیں۔ جمعہ کی نماز کے بعد شام کے قریب زلفی نے ڈرتے ڈرتے امی سے واپس چلنے کے لئے کہا تو شایان نے اپنی بہن کو آواز دی کہ میرا سامان بھی باندھو۔

"تم کہاں جا رہے ہو---؟" زلفی نے اس سے پوچھا۔

"جہاں تم جا رہے ہو' میں بھی وہیں جاؤں گا---" شایان نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "یہ سات دن میں نے بڑے صبر سے گزارے ہیں اور کل اگر تم یہاں نہ آتے تو میں آج خود ہی تمہارے پاس لاہور پہنچ جاتا۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا---"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم نہیں چاہتے' میں کچھ کام وام کروں--- بھائی! تم یہاں اپنے گھر' والدین اور بہنوں کے پاس رہو گے جو تمہیں دیکھ دیکھ کر جیتی ہیں--- ویسے بھی لاہور تمہیں راس نہیں آیا---" زلفی نے بڑی آہستگی سے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"تمہیں راس آیا ہے---؟" شایان نے جیسے دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا۔

"پیارے بھیا---!" وہ اسے بچوں کی مانند پچکارتے ہوئے سمجھانے لگا۔ "سمجھنے کی کوشش کرو۔ جو کہتا ہوں' اس پہ عمل کرو--- گھر میں جوان بہنیں ہیں' زمانہ بڑا خراب

ہے---" یہ کہتے کہتے وہ روہانسا ہوگیا۔ "جن بیٹیوں کے باپ اور بہنوں کے بھائی اپنی ذمہ داریوں کو نہیں سمجھتے ان کا حشر نگہت' میرے میاں جی یا میرے جیسا ہوتا ہے---" بے اختیار اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ شایان بھی اس کے سینے سے لگا رو رہا تھا۔ وہ پھر بولا۔

"دیکھو' شایان! اپنے لئے جینا بھی جینا ہوتا ہے مگر دوسروں کے لئے جینا اصل جینا ہوتا ہے۔ تم اب والدین اور اپنی بہنوں کی خوشیوں کے لئے جیئو گے--- مجھے دیکھو' مجھ بدنصیب کو دیکھو جس کا باپ محض اس لئے مرگیا کہ ان کا ضمیر زندہ ہو گیا تھا۔ وہ اپنے ضمیر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ نہیں سکے۔ اپنی ندامت' غیرذمہ داری' بے انصافی کے احساس نے انہیں ایک ناپسندیدہ موت سے ہمکنار کر دیا۔ مرتے وقت وہ کس ذہنی اذیت میں مبتلا تھے' اس کا اندازہ کوئی نہیں کر سکتا۔ ان کی آنکھ ایسی جھکی کہ پھر اٹھنے کے قابل نہ رہی۔ انہوں نے مجھ سے آنکھ ملائی' نہ اپنی بیوی سے جنہوں نے میری شکل میں اولاد نرینہ کا تحفہ دیا تھا حالانکہ زندگی میں ایک لمحہ ایسا بھی آیا تھا جب میرے والد صاحب بڑے مسرور تھے کہ انہوں نے نئی شادی والا فیصلہ درست کیا تھا--- اور میرا خیال ہے' والد صاحب نے اپنے آپ سے بھی آنکھ نہیں ملائی۔ زبان پہ چُپ کی مُہر لگ گئی' ایک لفظ کسی سے نہیں کہا اور مر گئے--- مجھے یقین ہے کہ ان کی موت پہ کسی کو صدمہ نہیں پہنچا ہوگا اور یہ کہنا بھی ایک تلخ سچ ہوگا کہ ان میں ہم سب لوگ بھی شامل ہیں--- ادھر میری مرنے والی بڑی امی کے صبر کا نتیجہ دیکھو کہ ان کی موت پہ اپنے تو اپنے' غیروں نے بھی آنسو بہائے۔ نگہت کے انجام پہ ہر کسی کو افسوس ہوا اور میں نگہت کے لئے آج بھی پریشان ہوں' مجھے یقین ہے کہ وہ زندہ ہے اور ایک دن ضرور ملے گی۔ میں اس سے ضرور ملنا چاہتا ہوں تاکہ اپنے والد صاحب کی کوتاہیوں کی معافی مانگ سکوں۔ اپنی دوسری دونوں بہنوں کو اپنے پاس لانا چاہتا ہوں' وہ میرا خون ہیں اور میں ہر قیمت پہ اپنے خون کی حفاظت کروں گا۔ میں اپنے مرحوم باپ کی غلطیوں کو دہراؤں گا نہیں بلکہ ان کا ازالہ کرنے کی کوشش کروں گا۔

شایان! تم مجھ سے وعدہ کرو کہ تم کبھی اپنے والدین اور بہنوں سے دور نہیں رہو گے۔ میں تمہارا دوست ہوں' بھائی ہوں۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں تمہیں کبھی اکیلا نہیں چھوڑوں گا اور جب بلاؤ گے' آؤں گا مگر تم اپنے والدین اور بہنوں کی آنکھوں کا اجالا بن کر اسی گھر میں رہو گے---"

ادھر یہ برسات برس رہی تھی اور اُدھر واقعی شایان کی بڑی بہن کی پیشین گوئی درست نکلی۔ واپسی سے تھوڑی دیر پہلے زلفی کی امی نے اپنی تیسری انگلی سے ایک نازک سی طلائی



انگوٹھی اتار کر شگفتہ کی انگلی میں پہنا دی۔ شایان کی ماں نے کچھ کہنا چاہا تو جواب دیا۔

"بہن! اور کوئی مطلب نہ نکالئے گا۔ یہ میں نے اپنی بیٹی کو بطور نشانی پہنائی ہے' انگوٹھی دیکھا کرے گی تو اپنی غم زدہ خالہ کو یاد کر لیا کرے گی--- ویسے انشاءاللہ ہم بہت جلد آئیں گے اور اسی کی ممانی' ماموں کو بھی ساتھ لائیں گے کیونکہ میں اب اس کے بغیر رہ نہیں سکتی---"

بڑی باجی' شایان کی جانب دیکھتے ہوئے مسکرا رہی تھی۔

★★★

گڈو تو جان کے ساتھ کراچی گئی تھی ورنہ اس کا اپنا ارادہ وہاں جانے یا وہاں سیٹ ہونے کا نہیں تھا' وہ اپنے پاپا کو اس عمر میں تنہا چھوڑنا نہیں چاہتی تھی اور ویسے بھی اسے کراچی سرے سے ہی پسند نہیں تھا۔ وہ تو خالص لاہورن' پنجابن تھی۔ لاہور کی ریتوں رسموں' میلوں ٹھیلوں اور ہنگاموں کی دیوانی! یہاں پنجاب میں اسے اپنے گرد سب اپنے جیسے لگتے تھے۔ ایک بولی ٹھولی' رنگ پہناوا' کھانا پینا' نہریں دریا' باغ تھیٹر اور خاص کر اوجڑی' سری پائے' بونگ اور نلوں والے نان کلچے--- کراچی میں اسے کوئی بھی اپنے جیسا نہیں لگتا تھا۔ ایک وجہ اور بھی تھی۔ اس کا پورا خاندان یہیں تھا۔ سب انگریزوں کے زمانے کے ریلوے ملازم تھے۔ ماں مر چکی تھی--- بوڑھا باپ معدے کے السر کا پرانا مریض! پینے پلانے' ریس اور میوزک کا شوقین۔ اتوار کے علاوہ سارا ہفتہ گھر بند رہتا۔ درجن بھر بیئر کی بوتلیں' دو پیکٹ سگار' آدھی بوتل رم اس کا لگا بندھا ہفتہ وار راشن تھا البتہ اتوار کے دن صبح ہی صبح سردی ہو یا گرمی' پرانا تھری پیس سوٹ' ہیٹ نکٹائی بڑے اہتمام سے پہنتا اور چرچ جاتا۔ چرچ میں سب سے اگلے بنچوں پہ اپنی مخصوص سیٹ پہ بیٹھ کر بڑے خشوع سے عبادت میں حصہ لیتا۔ پھر وہیں سے اپنے ایک دو پرانے فرینڈز کے ساتھ لارنس گارڈن کی سیر کو جاتا' ریس کورس چلا جاتا جہاں بہت سے پرانے سائیس اور جاکی اس کے منتظر ہوتے۔ موضوع سخن پرانے مرے کھپے مشہور گھوڑے' ان کی فتوحات' نسلیں' آباؤ اجداد ہوتے۔ مشہور ڈربی ریسوں کے قصے ہوتے۔ پھر سو پچاس کی ہار جیت کر کے موڈ ہوتا تو کسی سینما ہال میں گھس جاتا' انگلش فلم دیکھتا اور رات گئے واپس پلٹتا تو پھر گڈو کو فلم کی سٹوری اور ڈائیلاگ سنا سنا کر بور کرتا۔ اگر وہ باہر ہوتی تو بیئر کا سلسلہ شروع کر دیتا' اس کو کچھ غرض نہیں تھی گڈو آدھی آدھی بلکہ اکثر رات بھر کہاں رہتی ہے اور کیا کرتی ہے۔ اس کا یہ سگار' شراب کا راشن پانی کہاں سے آتا ہے۔ چشم پوشی ہی وقت کا تقاضا تھا مگر اب گڈو کی غیر حاضری میں وہ بے انتہا چڑچڑا ہو گیا تھا' راشن میں تعطل پیدا ہو گیا تھا۔ بیٹا اپنے مسائل میں الجھا رہتا اور وہ سارا دن کوارٹر کے اندر یا باہر کھڑا محلے داروں کو

انگریزی میں گالیاں بکتا رہتا۔ ویک اینڈ پہ گڈو نے بھائی کو خیر خیریت معلوم کرنے کے لئے ٹیلی فون کیا تو اس نے پاپا کی کیفیت بیان کر دی اور واپس لوٹنے کو کہا۔ گڈو اب جان کی جانب سے مطمئن ہو گئی تھی۔ وہ اس کو ریڈ روز اور ٹوٹو کے حوالے کر کے پہلی فرصت میں لاہور آ گئی۔

☆☆☆

جان کو کراچی نے جی جان سے گلے لگا لیا تھا۔ اس کے گرد اتنی دلچسپیاں، ہنگامے، مصروفیات اور محبتیں تھیں کہ وہ لاہور کو بھول ہی گیا۔ ماضی کے متعلق سوچنے کی فرصت ہی نہیں تھی۔ ماں کی موت، بہنیں، شایان، زلفی، سب داستان پارینہ بن چکے تھے۔ چوبیس گھنٹے وہ ریڈ روز اور ٹوٹو کے ہمراہ رہتا۔ اپنے ہیلتھ سنٹر میں ٹریننگ اور کوچنگ کے علاوہ اور بھی کئی کام اس کے سپرد تھے جن میں سب سے اہم اور ذمہ داری کا کام کال گرلز کو ان اور آؤٹ کرنا تھا۔ ان لڑکیوں کا کوڈ ورڈ "برڈ" تھا۔ بکنگ کے مطابق یہ ہوٹلوں، کلبوں یا جس جگہ بھی ضرورت ہو، وہاں پہنچاتا اور پھر وقت پہ ان کو وہاں سے اٹھاتا۔ پورا ان، آؤٹ کا ذمہ دار یہی تھا۔ ریڈ روز نے اس کو پورا ٹرینڈ کر دیا تھا۔ ریڈ روز نے اس کا ٹسٹ لینے کے لئے مصنوعی پھڈے بھی کروائے، جعلی پولیس والوں کو اس کے پیچھے لگوایا، کئی دو نمبر باس سے اس کا پھڈا ڈلوا دیا۔ چاقو چلانا، چین، بلٹ فائٹنگ، باکسنگ، جوڈو اور کراٹے، بہت کم عرصے میں یہ ایک خونخوار عفریت کی شکل میں کراچی میں متعارف ہو گیا۔ بائیں آنکھ کے اوپر زخم کا نشان، ٹھوڑی پہ کٹ، آنکھوں میں نڈری اور وحشت، سگریٹ، شراب۔

ایک دوپہر وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ کھلی جیپ میں ہوا کے دوش پہ سوار ایئر پورٹ روڈ پہ جا رہا تھا۔ ریلوے کراسنگ ہالٹ کے پاس ایک نئی ٹیوٹا الٹی ہوئی نظر آئی، منی بس نے اسے بری طرح رگید دیا تھا۔ پولیس والے بھی کھڑے تھے۔ یہ بھی قریب آ کر رکا، کار کے مسافر ابھی تک اندر پھنسے ہوئے تھے۔ مدد کی غرض سے یہ بھی سارے نیچے اتر آئے۔ بڑی مشکل سے گاڑی سیدھی کی۔ دروازے پچک کر جام ہو گئے تھے، فرنٹ سکرین توڑ کر تینوں آدمیوں کو باہر نکالا۔ جان کے سامنے بیہوش حالت میں شوکت پڑا ہوا تھا۔ گاڑی پرائیویٹ ہائیر کمپنی کی تھی۔ ڈرائیور کے علاوہ دوسرا شخص شوکت کا لاہوری باس تھا جسے وہ ہوٹل میں گڈو کے ساتھ دیکھ چکا تھا۔ ڈرائیور بری طرح زخمی تھا، شاید اس کی ٹانگ بھی ٹوٹ گئی تھی۔ باس قدرے ہوش میں جبکہ شوکت مکمل بے ہوش تھا۔ یہ اسی دن لاہور سے کراچی آئے تھے۔ ایمبولینس آئی تو یہ انہیں لے کر ہسپتال آ گیا۔۔۔ ٹیلی فون پہ اس نے ریڈ روز کو پیغام دیا کہ میرا ایک دوست حادثے کا شکار ہو گیا ہے، میں اسے لے کر ہسپتال جا رہا ہوں۔۔۔ شوکت کو سر اور سینے پہ



چوٹیں آئی تھیں، لاہوری باس کے ناک اور جبڑے کی حالت خراب تھی۔ ہسپتال میں اس نے سارے کام خود کروائے۔ ایکسرے میں معمولی فریکچر کا نشان تھا۔ معمول کی ڈریسنگ اور ٹریٹ منٹ کے بعد جب شوکت کچھ ہوش و حواس میں آیا تو ایک اجنبی کو پاس بیٹھے دیکھا۔ جان نے اسے بتایا کہ ایکسیڈینٹ کے بعد وہ ہی انہیں لے کر یہاں آیا ہے۔ شوکت نے اس کی انسان دوستی اور ہمدردی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس کا تعارف چاہا۔ جان کو اس حلیئے میں وہ بالکل پہچان نہیں پایا تھا۔۔۔ جان نے اسے ٹالتے ہوئے کہا۔

"دوست! تعارف کی ضرورت نہیں، انسان ہونے کی ناطے یہ اس کا فرض تھا۔۔۔"

شوکت نے بے حد اصرار کیا لیکن جان نے مسکراتے ہوئے اسے ٹال دیا۔ آخر شوکت نے اپنا تعارف کرایا، لاہور کا پتہ اور ٹیلی فون نمبر لکھوایا اور درخواست کی کہ کبھی لاہور آئیں تو اسے میزبانی کا شرف بخشیں۔ جان نے وعدہ کیا کہ وہ ضرور لاہور آ کر اسے ملے گا۔ اس کے بعد شام کو پھر آنے کا کہہ کر وہ چلا آیا، واپس پہنچ کر اس نے ساری بات ریڈ روز کو بتائی کہ وہ کس طرح شوکت کو جانتا ہے، شوکت کے تھپڑ کا بھی ذکر کیا۔ اس کے کردار، اخلاق اور ہمدردی کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ وہ اپنی بہنوں کو دس ہزار روپے شوکت کی معرفت بھیجنا چاہتا ہے۔

ریڈ روز اور ٹوٹو نے اسے روپے دے کر بخوشی اجازت دی کہ وہ ضرور اپنی بہنوں سے رابطہ کرے اور روپے بھیجے بلکہ پھولوں کا دستہ اور کچھ کھانے پینے کا سامان بھی دیا کہ شام کو ہسپتال جا کر شوکت سے ملے۔ شام کو وہ ہسپتال گیا تو معلوم ہوا کہ اس کا باس شام کی فلائیٹ سے لاہور چلا گیا ہے، وہ ایک دو روز یہاں رکے گا اور کل تک وہ ہسپتال سے فارغ ہو جائے گا۔ جان نے اسے بصد اصرار کھلایا پلایا، ہر طرح سے اسے خوش رکھنے کی کوشش کی۔ دس ہزار روپے اور ایڈریس دے کر کہا کہ یہ روپے لاہور پہنچ کر اس نام اور پتے پر بھیج دیں، ساتھ ہی تاکید کی کہ وہ اپنا پتہ وغیرہ تحریر نہ کرے۔

☆☆☆

نگہت کی والدہ کے مرنے کے بعد، اس کی دونوں بہنوں کو اس کے ماموں اپنے ساتھ لے گئے تھے، رفعت اٹھارویں برس میں تھی اور فرحت اس سے ایک برس چھوٹی تھی۔ ان کے ماموں غلہ منڈی میں آڑھتی تھے۔ معمولی پڑھے لکھے متوسط طبقے کے شریف لوگ تھے، ایسے لوگ جو اپنی ناک رکھنے کے لئے اپنی گردن کٹوانے سے دریغ نہیں کرتے۔ نگہت کے والد نے دوسری شادی کر کے گویا ان کی ناک کاٹ دی تھی۔ نگہت کا باپ، ان کا بہنوئی ہونے کے علاوہ قریبی رشتہ دار بھی تھا۔ اس کے باوجود مرنا جینا ختم کر دیا ہوا تھا۔ نگہت کی مرنے والی ماں بھی

اپنے بھائیوں کی طرح چھوٹے ناک والی نہیں تھی۔ اس غیرت والی نے بھی طلاق کے بعد بھائیوں کے دروازے پہ پڑنے سے انکار کر دیا تھا' نہ ہی نگہت کے باپ سے کسی مالی اعانت کی طلب گار ہوئی تھی اور نہ شکایت کے لئے منہ کھولا تھا بلکہ اس کا مکان خالی کر کے ہر وہ چیز جس کا تعلق اس کے خاوند سے تھا' اتار پھینک کر بچیوں کو انگلی لگائے' شہر بدر ہو کر کرائے کے مکان میں اٹھ آئی تھی لیکن آج وہی لڑکیاں جو ننھی ننھی یہاں سے گئی تھیں' جوان ہو کر واپس ماموں کے گھر پہ آپڑی تھیں اور ماموں اپنی ناک کی خاطر انہیں سہارا اور آسرا دینے پر مجبور تھا۔ اس ماموں کے دو جوان بیٹے بھی گھر میں موجود تھے' میٹرک مڈل تک پڑھے ہوئے اور باپ کے ساتھ آڑھت کی دکان پہ بیٹھتے تھے۔ اپنے خون کے ناطے یا جوش و محبت میں انسان وقتی مصلحت کے تحت جذباتی فیصلے تو کر لیتا ہے مگر اسی شدت اور خلوص سے انہیں نبھانا بڑا مشکل پڑ جاتا ہے۔ شاید ماموں بن کر یہی سوچا ہو کہ بہن کی لڑکیاں ہیں' گھر میں ہی نبٹ جائیں گی مگر وہ یہ بھول گیا کہ گھر میں اس کی ایک بیوی بھی ہے' جو اس کے بیٹوں کی ماں ہے' اس کی کوئی اپنی خواہش اور سوچ بھی ہو سکتی ہے۔ جس دن سے یہ لڑکیاں گھر میں آئی تھیں' اسی دن سے وہ ہتھے سے اکھڑی ہوئی تھی۔ اشاروں کنائیوں میں کئی بار سمجھا چکی تھی کہ وہ اپنے بیٹوں کی شادیاں اپنی بہن کے گھر کرے گی۔ ان لڑکیوں کا کہیں بندوبست کرو' گھر میں جوان بیٹے ہیں۔ وہ بھی اس کے اشارے سمجھ رہا تھا' اسی ادھیڑبن میں تھا کہ کسی دن آرام تسلی سے وہ اپنی بیوی کو سمجھائے گا--- بیوی نے ایک دن پھر اسے خبردار کیا۔

"میں کئی دنوں سے کہہ رہی ہوں کہ ان کا کہیں بندوبست کرو مگر تم اِدھر سے سن کر اُدھر نکال دیتے ہو--- مجھے لگتا ہے' تم اس گھر میں بھی کوئی تماشا لگوانا چاہتے ہو۔ پہلے کیا کچھ نہیں ہو چکا جو اور کوئی کسر باقی رہ گئی ہے۔ بوڑھے ہونے کو آئے مگر عقل نہ آئی' یہ تک نہ سوچا کہ گھر میں جوان بیٹے ہیں۔ میں ان لڑکیوں کو کہاں لے جا کر رکھوں گا---؟"

وہ جھنجلا کر اسے ڈانٹنے لگا۔ "خوامخواہ کوئی مسئلہ کھڑا مت کرو--- ہماری بھانجیاں ہیں' بے آسرا اور یتیم--- ہم سر پہ ہاتھ نہیں رکھیں گے تو اور کون رکھے گا؟--- گھر میں جہاں پانچ کھاتے ہیں' وہ بیچاریاں بھی اگر دو لقمے کھا لیں گی تو کیا ہمارے رزق میں کمی آجائے گی؟"

"بات روٹی کپڑے کی نہیں--- برا نہ ماننا' مجھے ان کے لچھن کچھ اچھے دکھائی نہیں دیتے---"

"کیا بک رہی ہو---؟" وہ مزید جھنجلا گیا۔

"--- بک نہیں رہی' صحیح کہہ رہی ہوں--- مجھے پہلے بھی شک تھا مگر آج تو میں نے



خود رفعت کو مسعود کے کمرے میں اشارے کرتے ہوئے دیکھا ہے--- اور سنو! مجھے شک ہی نہیں بلکہ یقین ہے کہ وہ چھپ چھپ کر باتھ روم میں سگریٹ بھی پھونکتی ہے' دوسری بھی ہر وقت کوٹھے پہ چڑھی رہتی ہے۔ اگر غلطی کر کے انہیں یہاں لے ہی آئے ہو تو فوراً" کہیں لڑکے تلاش کر کے ان کو یہاں سے رخصت کرو۔ پہلے ہی ہماری بہت ڈگڈگی بج چکی ہے' اپنے گھر میں مزید تماشا نہیں لگوانا چاہتی۔ تم تو مرد ہو' صبح گئے تو شام کو لوٹے۔ گھر میں تو میں رہتی ہوں۔ جو کچھ میں دیکھتی ہوں' تم نہیں دیکھتے--- اچھا برا سمجھا دیا ہے' اب تم ذمہ دار ہو۔"

وہ اپنی بیوی کی فطرت کو جانتا تھا' بات کا بتنگڑ بنانا اس کے بائیں ہاتھ کا کمال تھا مگر اس کے باوجود وہ اندر سے ہل سا گیا اور خاموشی سے نظریں جھکائے باہر نکل گیا۔

دوسرے روز ڈاکیا ایک رجسٹرڈ لفافہ لے کر آگیا۔ ماموں کے نام تھا' مسعود نے دستخط کر کے وصول کر لیا۔ کسی نامعلوم نے دس ہزار روپے کا ڈرافٹ رفعت کے نام بھیجا تھا۔ نہ کوئی واضح پتہ' نہ کوئی خط۔ مسعود کی ماں کی تو آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ رات خاوند آیا تو لفافہ سامنے رکھ دیا۔

"لو' یہ بھی دیکھ لو--- میں نہ کہتی تھی کہ ان کے طور طریقے اچھے نہیں ہیں۔ خدا جانے' کس واقف کار نے یہ ڈھیر سارے روپے بھیجے ہیں---؟"

وہ سوچ میں پڑ گیا' کچھ دیر بعد بڑبڑایا۔ "ہو سکتا ہے' ذلفی نے بھیجے ہوں---"

وہ ہاتھ نچاتے ہوئے بولی۔ "ذلفی بھی تو اسی مرنے والے کا بیٹا ہے جس نے جیتے جی تو کبھی دس پیسے نہ دیئے' اب قبر میں جا کر دس ہزار بھجوائے گا؟--- شوم کا بیٹا۔ اتنا سخی نہیں ہو سکتا---"

ابھی یہ دس ہزار روپوں اور بھیجنے والے کا مسئلہ حل نہیں ہوا تھا کہ کچھ دنوں بعد ٹوبے کا ایک معزز آدمی جو لاہور میں ایک مشہور وکیل کا منشی تھا' شام کے وقت اس کے پاس آگیا۔ اس منشی کا ایک بھائی یہاں غلہ منڈی میں آڑھتی تھا جس سے نگہت کے ماموں کے بھی کاروباری تعلقات تھے' اسی حوالے سے وہ یہاں پہنچا تھا۔ بات چیت کے دوران اس نے انکشاف کیا کہ کچھ دن پہلے ذوالفقار نامی ایک نوجوان اس کے وکیل صاحب کے پاس کسی قانونی مشورے کے لئے آیا تھا۔ وہ اپنی سوتیلی دو بالغ کنواری بہنوں کو ان کے ماموں سے حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس سے تمام معلومات حاصل کرنے کے بعد وکیل صاحب نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ وہ خون کے رشتے سے ان کا بڑا بھائی ہونے کی حیثیت سے انہیں حاصل کرنے کا حق رکھتا ہے بشرطیکہ وہ لڑکیاں بھی ایسا چاہیں۔ پھر جب اس نوجوان نے ٹوبہ ٹیک سنگھ

اور آپ کا نام لیا تو میں ٹھٹکا۔ میں آج ادھر بھائی صاحب سے ملنے آیا تو آپ کی دکان پہ نظر پڑتے ہی مجھے وہ نوجوان یاد آگیا' خیال گزرا کہ چلو آپ سے ملتا چلوں اور اس نوجوان کے ارادے سے آپ کو آگاہ بھی کر دوں۔۔۔ رات کو اس نے بیوی سے ذکر کیا تو بیوی نے مشورہ دیا۔

"اللہ کے بندے! فوراً" انہیں ان کے بھائی زلفی کے سپرد کر کے سردردی' مزید رسوائیوں اور پریشانیوں سے بچو۔ خون تو ان کا ہی ہے۔ ہم لاکھ سینے سے لگائیں' وارث تو وہی ہیں۔ ہم یہاں رکھ بھی لیں لیکن آخر ایک ان انہیں بیاہ کر رخصت تو کرنا ہی پڑے گا۔ جب تمہاری بہن ہی نہیں رہی' نہ ہی کبھی اس نے ہماری سنی تھی تو اس کی اولاد پہ ہمارا کیا دعویٰ ہو سکتا ہے۔۔۔ میری مانو تو ان کو' ان کے حوالے کر دو۔ وہ بیاہیں' نہ بیاہیں۔ ہماری بلا سے۔۔۔"

وہ گہری سوچ میں اتر گیا۔۔۔ کہتی ٹھیک ہی ہے۔ آج کل اپنی اولاد پہ کوئی حق دعویٰ نہیں تو دوسرے کی اولاد کو کوئی کہاں تک چھامارتا پھرے؟ سگی بہن نے اپنی مرضی کی' یہ بھی اس کی اولاد ہیں۔ کہیں ماں کی طرح یہ بھی ناک نہ کٹوا دیں۔۔۔ مگر یہ سب کچھ اتنا آسان بھی نہیں تھا' خود ان کا ہاتھ پکڑ کر وہاں لے کر جانے سے تو رہا کہ آخر ناک' عزت برادری بھی تو کوئی چیز ہے۔ اسی شش و پنج' سوچ بچار میں تین چار ہفتے پر لگا کر اڑ گئے۔

ایک دن پانچ ہزار کا ڈرافٹ پھر آگیا' لاہور ہی سے بھیجا گیا تھا۔ زلفی کم از کم اتنی رقم بھیجنے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ پھر اور کون ہو سکتا ہے؟۔۔۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ دوسرے دن وہ دونوں ڈرافٹ پکڑے اپنے بنک منیجر کے پاس چلا گیا۔ اس بنک سے اس کا پرانا کاروباری لین دین تھا۔ قدرے متردد پا کر منیجر نے پوچھا کہ خیریت تو ہے' میاں جی! کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہیں۔ اس کے کہنے پر ڈرافٹ سامنے رکھتے ہوئے ساری پریشانی کھول کر رکھ دی اور کہا۔

"کوئی شخص دشمنی سے پیسے بھیج رہا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا' کیا کروں۔۔۔ بال بچے دار شریف کاروباری آدمی ہوں' کسی مصیبت میں ہی نہ پھنس جاؤں۔ کچھ آپ ہی مشورہ دیں' کیا کروں؟"

منیجر ڈرافٹس کو غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "میاں جی! پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ اصلی اور قابل ادائیگی ڈرافٹ ہیں۔ آپ جب چاہیں' انہیں کیش کروا سکتے ہیں۔۔۔ ویسے اگر یہ وصول ہی نہ کریں تو یہ سلسلہ از خود بند ہو جائے گا۔"

دوسرے ڈرافٹ کے آنے پہ گھر کی فضا بڑی خراب ہو چکی تھی۔ بچے' بھانجیاں اپنے



اپنے کمروں میں سہمے ہوئے تھے۔ بیوی سر پہ دوپٹہ باندھے' منہ پھلائے چارپائی پہ پڑی تھی۔ اس روز وہ مسجد سے لوٹا تو یہ پاگل ہتھنی کی طرح چنگھاڑی۔

"میں کہتی ہوں' روپے تو وصول کر رہے ہو اگر کل کلاں روپے بھیجنے والا ان کو لینے کے لئے آگیا تو کیا کرو گے۔۔۔ محلے دار' رشتے دار گلی کوچے والے اکٹھے ہوں گے' وہ رسیدیں دکھائے گا تو کیا جواب دو گے کہ تم کس مد میں اتنے پیسے وصول کرتے رہے ہو؟۔۔۔ میں تو صبح ہی بچوں کو لے کر اپنے میکے جا رہی ہوں۔ تم یہاں اپنی لاڈلی بھانجیوں کے ساتھ رہو اور کرو وصول رقمیں۔۔۔"

وہ ہاتھ لہرا لہرا کر اس کی مرنے والی بہن کو کوسنے لگی' تبھی رفعت سامنے آ کھڑے ہوئی' ہاتھ جوڑتے ہوئے التجا کرنے لگی۔

"ماموں! خدا کے لئے ممانی کو چپ کرائیں۔ سارا دن یہی کچھ ہوتا رہا ہے' ہمسائے دیواروں سے لگے ہمارا تماشا دیکھ رہے ہیں۔ آپ ہماری وجہ سے اپنے گھر کا سکون برباد نہ کریں۔۔۔" وہ ماموں کے پاؤں پر گر گئی۔ "ہم تو ازل سے ہی بدنصیب ہیں۔ آپ ہمیں لاہور اسی مکان میں چھوڑ آیئے جہاں سے آپ ہمیں لائے تھے۔۔۔"

"ہاں' ہاں۔ وہیں جاؤ جہاں سے اتنے بڑے بڑے ڈرافٹ آتے ہیں۔۔۔" ممانی نے لمبے لمبے بازو پھیلا کر کہا۔

"رفعت! کیا تم جانتی ہو کہ یہ رقم تمہیں کون بھیج رہا ہے؟" ماموں نے آہستہ سے پوچھا۔

"نہیں' ماموں! میں نہیں جانتی۔ مجھے کچھ علم نہیں کہ یہ کون بھیج رہا ہے۔ آپ کے سوا ہمارا ہے بھی کون۔۔۔؟" وہ رونے لگی۔ "ماموں! ممانی نے آج ہمیں بہت ذلیل کیا ہے' مسعود بھائی کے متعلق بہت بُرے بُرے الزام لگائے ہیں اور یہ بھی کہا کہ میں بھی نگہت آپا کی طرح نشہ کرتی ہوں' سگریٹ پیتی ہوں۔۔۔"

ممانی دہاڑی۔ "میں نے تمہیں خود سگریٹ کی ڈبیا ہاتھ میں لئے غسل خانے سے نکلتے دیکھا ہے۔۔۔"

ممانی بھی سچ کہہ رہی تھی۔۔۔ مسعود بھی کمرے سے نکل کر سامنے آگیا اور بولا۔

"میاں جی! آپ کے آنے سے پیشتر میں بہت کچھ سن چکا ہوں' کسی وجہ سے میں خاموش تھا لیکن اب شاید میرے لئے خاموش رہنا ممکن نہیں۔۔۔ دراصل امی جان ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ میں اکثر غسل خانے میں چھپ کر سگریٹ پیتا تھا۔ اس دن میں سگریٹ کی ڈبیا وہیں بھول آیا تھا۔ میرے بعد رفعت بہن غسل خانے گئی اور واپسی پہ پیکٹ اٹھا لائی' اکیلے میں مجھے ڈانٹا

کہ سگریٹ نوشی بری عادت ہے۔ امی نے اس کے ہاتھ میں ڈبیا دیکھ کر یہی سمجھ لیا کہ وہ خود سگریٹ پیتی ہے۔ باجی رفعت اس وقت صحیح بات بتا سکتی تھی مگر اس نے محض مجھے بچانے کی خاطر یہ الزام اپنے سر لے لیا۔ وہ بیچاری تو مجھے منع کرتی ہے۔ میرا بستر درست کرتی ہے' کپڑے استری کرتی ہے مگر امی اسے غلط رنگ دیتی ہیں۔"

"کر دیا نا' جادو--- یہ جادو گرنیاں ہیں' جادو گرنیاں۔ ماموں کو بھی تعویذ پلائے ہوئے ہیں اور اب مسعود کو بھی قابو کر لیا--- ہائے' لوگو! میں برباد ہو گئی۔ کیڑے پڑیں اس کی قبر میں' خود تو مر گئی اور اب مجھے مارنے کے لئے یہ جادو گرنیاں میرے تالو پہ بیٹھا گئی---" ممانی واویلا کرتے ہوئے سینہ کوبی کرنے لگی۔ اتنے میں میاں جی کا چھوٹا بھائی بھی آ گیا' یہ تماشا دیکھا تو آگے بڑھ کر بھابی کو دلاسا دینے لگا۔

"بھابی! خدا کے لئے' خاموش ہو جاؤ۔ گلی محلے والے تماشا دیکھ رہے ہیں' یہ رونا پیٹنا ختم کرو---"

"میرا رونا پیٹنا تو اس وقت ختم ہو گا جب یہ اس گھر سے دفع دفعان ہوں گی---" اس نے کس کر دوپٹہ سر پہ باندھ لیا۔

"آپ خاموش ہو جائیں' میں انہیں اپنے گھر لے جاتا ہوں---"

بھابی کو تسلی دے کر وہ بڑے بھائی کو لئے دالان میں آ گیا' کچھ دیر دونوں بھائی صلاح مشورہ کرتے رہے اور پھر اندر واپس آئے۔

"رفعت' فرحت! تم دونوں تیار ہو جاؤ اور میرے گھر چلو' یہ کِل کِل اسی طرح ختم ہو گی---"

فرحت ہاتھ جوڑتے ہوئے فریاد کرنے لگی۔ "ماموں جی! ہمیں کسی کنویں میں دھکیلنا ہو تو ساتھ لے جائیں ورنہ ہم نہیں جائیں گی--- باپ دیکھا' بھائی اور بہن دیکھے۔ ماں نے بھی ہم بد نصیبوں سے دامن پاک کر لیا۔ بڑے ماموں بھی مجبور--- ہم کرماں ماریوں کو اپنے گھر لے جا کر کیوں ہم سے دوسرا ماموں بھی چھیننا چاہتے ہیں۔ رات کی رات ہم بے منزل مسافروں کو کسی کونے میں جگہ دے دیں' صبح ہم خود ہی کہیں چلی جائیں گی۔ خدا کی وسیع زمین پہ کہیں نہ کہیں تو ہم یتیموں یسروں کے لئے جگہ ہو گی---" اس کے آنسوؤں کی چھاگل اچھل پڑی تھی۔

ان یتیم' بے نواؤں کی آہ و فریاد سے شاید آسمان کا کلیجہ بھی شق ہو گیا تھا۔ اس رات خوب آسمان رویا' بجلی کڑکی' گلیاں اور بازار جل تھل ہو گئے تھے۔ بارش تھی کہ رکنے کا نام ہی نہیں



لیتی تھی۔ ہر ظلم کی کوئی انتہا' ہر صبر کی کوئی حد اور ہر آزمائش اور امتحان کا کوئی نتیجہ ہوتا ہے۔ انسان اچھی' بری اپنی تدبیریں کرتا ہے مگر تقدیر اپنے فیصلے صادر کرتی ہے۔ رات بھر کوئی بھی نہ سویا۔ بھاری بھاری سر' سوجے ہوئے سرخ پپوٹے' نیند کی ٹوٹ سے ٹوٹی ہوئی آنکھیں' اُجڑے اُجڑے اجنبی چہرے--- شاید آنکھوں اور آسمان کا پانی ختم ہو چکا تھا۔ دن کو اُجلی اُجلی سنہری دھوپ نکل آئی تھی۔ ابھی سب جاگ ہی رہے تھے کہ باہر ایک کار آ کر رُکی۔ سادہ سے کپڑوں میں ملبوس ایک ادھیڑ عمر کی خاتون باہر نکلی' اطلاعی گھنٹی پہ مسعود نے دروازہ کھولا۔

"بیٹا! آپ کے والد اور والدہ گھر پہ موجود ہیں---؟" آنے والی نے پوچھا۔

میاں صاحب بھی دروازے پہ آ گئے۔

"کہئے' بہن جی! کس سے ملنا ہے---؟"

"میاں جی! مجھے آپ ہی سے ملنا ہے' اجازت دیں تو اندر آ جاؤں---؟"

"آپ کہاں سے آئی ہیں---؟"

وہ سائیڈ میں کھڑی کار اور اس کے اندر دو آدمیوں کو بیٹھے ہوئے دیکھ کر قدرے پریشانی کے عالم میں پوچھنے لگے۔ وہ ان کی پریشانی اور تردد کو بھانپتے ہوئے بڑی نرمی سے کہنے لگی۔

"میں لاہور سے آئی ہوں اور آپ کی مرحومہ بہن کی جگہ پہ ہوں--- گاڑی میں رفعت' فرحت کے بھائی بیٹھے ہوئے ہیں۔ اگر ایک بھائی کو اپنے بھانجوں اور بہن کا آنا ناگوار گزرا ہو تو میں بغیر کسی خفگی اور ملال کے انہی قدموں سے واپس چلی جاتی ہوں---"

وہ انہیں پہچان چکا تھا۔ چند ثانیے کھڑا سوچتا رہا۔

"آئیے---؟" وہ راستہ چھوڑتا ہوا بولا۔ "---اپنے بچوں کو بھی بلا لیجئے۔"

انہیں بیٹھک میں بٹھا کر' اپنے بھائی کو لے کر وہ بیوی کے کمرے میں آیا۔ لال بھبھوکا چہرہ لئے وہ بخار میں تپ رہی تھی' پاس چارپائی پہ بیٹھتے ہوئے بڑے تحمل اور آہستگی سے کہنے لگا۔

"ہم نے تیری بات مان لی ہے۔ پھر بھی ایک انسان اور تیرا مجازی خدا ہونے کے ناطے ضرور کہوں گا کہ تو بھی اولاد والی ہے' تیرے پاس بھی ممتا کا مان ہے۔ ان یتیم اور بے آسرا بچیوں کے بارے میں اپنا دل صاف کر اور خدا سے معافی مانگ--- تو اگر کسی بھی وجہ سے ان کو اپنے گھر پناہ نہیں دے سکتی تو کم از کم ہنسی خوشی' بھلی دعاؤں کے ساتھ انہیں اپنے گھر سے رخصت تو کر--- وہ لوگ انہیں لینے آئے ہیں۔ جو کچھ بھی ہوا' اسے بھول کر ہمیں ان بچیوں کی بہتری کے لئے سوچنا چاہئے---"

"کون آئے ہیں---؟" وہ آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"بچوں کی ماں اور بھائی۔۔۔"

وہ دوپٹے سے سر ڈھانپتی ہوئی اُٹھ کر بیٹھ گئی' پوچھنے لگی۔ "وہ لے جانے کے لئے تیار ہیں؟"

"اللہ کی بندی! اٹھ تو سہی' انہیں چائے پانی پوچھ۔۔۔" وہ اُسے اُٹھاتے ہوئے بولا۔

"اپنی بھانجیوں سے کہو کہ انہیں چائے پانی پلائیں' میری طبیعت ٹھیک نہیں۔۔۔"

"گھر کی مالک تم ہو' وہ نہیں۔ وہ تو کچھ دیر کی مہمان ہیں۔۔۔ اٹھو' گھر میں دشمن بھی آ جائے تو اس کی عزت کرنی چاہئے۔"

وہ اسے سمجھا کر بھانجیوں کے کمرے میں آیا۔ ان دونوں غریبوں کی حالت بھی ناگفتہ بہ تھی۔ پریشانی' رونا دھونا اور رات بھر کے جگراتے نے ان کے پھول سے چہرے کملا کر رکھ دیئے تھے۔ بڑی محبت سے رفعت کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگا۔

"میری بچیو! تم دونوں میری مرحومہ بہن کی نشانی ہو' مجھے اپنے بچوں سے بھی زیادہ عزیز ہو۔ میں نے تمہاری ماں اور تمہاری خاطر کیا کچھ نہیں کیا مگر کوئی کسی کے نصیب کے لکھے کو نہیں بدل سکتا۔۔۔ تم دونوں کو یہاں اس کے لئے لایا تھا کہ تمہیں ماں باپ کی کمی محسوس نہ ہو' تمہیں اپنی بیٹیاں بنا کر اتنی خوشیاں دوں کہ تم اپنے سارے دکھ بھول جاؤ مگر یہاں بھی میں تمہارے مقدروں سے مار کھا گیا۔۔۔"

رفعت کی آنکھوں کے آبلے پھوٹ پڑے' بولی۔ "ماموں! ہم جانتی ہیں کہ آپ ہم سے کتنا پیار کرتے ہیں اور یہ بھی سمجھتی ہیں کہ آپ کتنے مجبور ہیں۔ آپ ہماری خاطر اپنا گھر خراب نہ کریں' ہم اپنے نصیبوں پہ شاکر ہیں۔۔۔ آپ ہمیں کسی دارالامان میں چھوڑ آئیں۔ اگر اس میں بھی آپ کی عزت میں فرق آتا ہو تو پھر لاہور چھوڑ آئیں اسی پرانے مکان میں' حاجی صاحب ہمیں آسرا دے دیں گے۔۔۔"

"ہاں' اب تمہارے لئے لاہور ہی رہنا بہتر ہے رفعت بیٹی!۔۔۔ لاہور پہ یاد آیا۔ وہاں تمہارا بھائی ذوالفقار اور امی بھی تو رہتی ہیں' ان کے ہاں جانے کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"ماموں! سگے باپ نے ہمارا خیال نہ کیا تو سوتیلی ماں اور بھائی سے کیا امید ہو سکتی ہے؟۔۔۔ ان کے ٹکڑوں پہ پڑنے سے تو موت کہیں بہتر ہے۔"

"بیٹی! انسان خطا کا پتلا ہے' غلطیاں کرنا اس کی فطرت میں شامل ہے لیکن ایک خوبی بھی اس میں موجود ہے کہ جب اسے اپنی غلطی یا گناہ کا احساس ہوتا ہے تو اس پہ نادم ہو کر توبہ پکڑتا ہے۔ پھر یہی انسان معصوم فرشتے کی طرح پاک اور بے ضرر ہو جاتا ہے۔۔۔ ممکن ہے کہ ان



گوں کا ضمیر بھی جاگ گیا ہو' وہ اپنی غلطیوں پہ شرمندہ ہوں اور اب اپنی کوتاہیوں کا تدارک کرنا چاہتے ہوں۔۔۔ بیٹی خون' اپنے خون سے زیادہ عرصہ دور نہیں رہ سکتا' آخر تم دونوں ہو ذوالفقار کے باپ کا خون اور تم نے خود کئی بار ذکر کیا ہے کہ ذوالفقار نے ہمیشہ تم سے اچھا لوک کیا ہے۔ کئی بار وہ آپ لوگوں کے پاس آیا اور مدد کرنی چاہی۔۔۔ میرا اپنا خیال ہے کہ مل قصوروار تمہارا باپ تھا اور کسی حد تک تمہاری ماں بھی' خدا ان دونوں کو معاف کرے۔ دونوں اب موجود نہیں' اپنی اپنی اچھائیوں برائیوں کی ٹوکریاں اٹھائے اپنی اپنی منزل کی طرف چلے گئے مگر تم لوگ تو ابھی اپنی شروعات کر رہے ہو۔ آگے لمبی مسافت ہے۔ سمجھداری' ت اور آبرو کا تقاضا یہی ہے تم ایک خون' اب ایک ہو جاؤ۔۔۔"

"ماموں آپ بڑے ہیں' اونچ نیچ سمجھتے ہیں۔ جو مناسب سمجھیں' کریں لیکن اپنے گھر ں بگاڑ پیدا نہ ہونے دیں۔۔۔"

"شاباش! اللہ تمہیں خوش رکھے۔ جتنے دکھ دیکھے' اتنے سکھ دکھائے۔۔۔ اٹھو' دونوں نہ ہاتھ دھو کر بیٹھک میں آجاؤ۔۔۔"

رفعت اور فرحت جب کمرے میں داخل ہوئیں تو ماموں' ممانی مہمانوں سے باتیں کر ہے تھے۔ وہ سلام کر کے سامنے صوفے پہ بیٹھ گئیں۔ زلفی کی امی نے دونوں کو بلا کر سر پہ ھ پھیرا' پاس بٹھالیا۔ پھر سلسلہ کلام دوبارہ شروع کرتے ہوئے بولیں۔

"بھائی جی! میں پہلے عرض کر چکی ہوں کہ مقدر میں جو مصیبتیں' پریشانیاں یا آزمائشیں ھی ہوتی ہیں' انسان کو ان کا سامنا کرنا ہی پڑتا ہے۔ آپ لوگوں کا ہم سے ناراض ہونا بالکل بجا ہے' وہی آپ والی بات کہ انسان جب جوانی' طاقت' دولت یا کامیابی کے سرپٹ گھوڑے پہ ار ہوتا ہے تو اسے دائیں بائیں' آگے پیچھے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ وہ اپنے آپ کو عقلِ کل کا ل اور وقت کا سکندر تصور کرتے ہوئے راستے کے پتھر' پھولوں کو ٹھوکروں پہ رکھتا ہوا آگے ھتا چلا جاتا ہے۔ اسے کیا خبر کہ بے خبری میں اس نے کیا کچھ کھو دیا' کیا کچھ برباد کر دیا تا آنکہ ت کی کوئی ٹھوکر اسے زمین چاٹنے پہ مجبور نہ کر دے۔ اللہ ان کی خطائیں معاف کر دے' وہ نوں اب موجود نہیں۔۔۔"

"ہاں' بہن جی! آپ نے صحیح کہا ہے۔ انسان غلطیاں تو کر لیتا ہے' بعد میں پچھتاتا ہے اور ا تو بدنصیبوں کو پچھتانے کی مہلت بھی نہیں ملتی۔۔۔"

رفعت کے ماموں نے شاید یہ اشارہ ان کے مرنے والے شوہر کی طرف کیا تھا۔ زلفی کی انے کمال ضبط سے ان کا یہ طنز برداشت کر لیا' کہنے لگیں۔

"بھائی جی! آپ نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔ مرنے والے مر گئے۔ اچھے بھلے' جو بھی تھے' چلے گئے لیکن جو ہم زندہ ہیں انہیں تو وہ غلطیاں دہرانا نہیں چاہئیں جو انہوں نے کیں۔۔۔ مختصر سی زندگی صرف نفرتیں اور ضدیں پالنے کے لئے نہیں ہوتی۔ محبت کرنے' خوش رہنے اور دوسروں کی خطائیں معاف کرنے کے لئے بھی کم ہوتی ہے۔ آج میں ماں ہونے کے ناطے 'اپنی بچیوں کو لینے آئی ہوں۔ شاید ان معصوموں کی خدمت سے ہماری غلطیوں' کوتاہیوں کی کچھ تلافی ہو سکے اور ان کے مرحوم باپ کی بے چین روح کو کچھ سکون مل سکے۔۔۔"

رفعت کی ممانی بولی۔ "بہن! کہنے کو تو بہت کچھ ہے مگر آپ کی ان باتوں نے ہمیں کچھ کہنے کے قابل نہیں چھوڑا۔ آپ چل کر ہمارے گھر آئی ہیں' اب ہم آپ کو کیا کہیں۔۔۔ جب آپ انہیں ماں بن کر لینے آئی ہیں تو ہم انکار کیسے کر سکتے ہیں۔۔۔"

کافی دیر اسی موضوع پہ باتیں ہوتی رہیں۔ شام سے پہلے زلفی اپنی بہنوں کو لے کر اپنے گھر لاہور واپس آ گیا۔۔۔ رخصت کرنے سے پہلے ماموں نے زلفی کی والدہ کو دونوں ڈرافٹ دیتے ہوئے بتا دیا تھا کہ لاہور سے کسی گمنام شخص نے رفعت کے نام پہ پندرہ ہزار روپے بھیجے ہیں۔

★★★

زلفی کو شک تھا کہ یہ پیسے شایان بھیج رہا ہے۔ اپنا شک رفع کرنے کی غرض سے اس نے اس سے بات کی تو شایان نے یقین دلایا کہ وہ اس کے علم میں لائے بغیر ایسی کوئی حرکت نہیں کر سکتا۔۔۔ پھر یہ کون ہو سکتا ہے جو ان کے گھر کا پتہ اور نام تک جانتا ہے؟ ظاہر ہے' اتنی خطیر رقم بھیجنے والا کوئی معمولی انسان تو ہو نہیں سکتا۔ آخر ایک دن بینک منیجر نے اپنے ذرائع سے بھیجنے والے کا نام' اکاؤنٹ نمبر اور فرم کا پتہ معلوم کر کے میاں صاحب کو مطلع کر دیا' انہوں نے فوراً" زلفی کو لاہور میں اطلاع کر دی۔ معمولی سی کوشش کے نتیجے میں وہ دونوں اس تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔

یہ شوکت تھا۔ جیل روڈ پر ایک شاندار پلازہ میں اس کے لاہوری باس کا دفتر تھا۔ زلفی نے ڈرافٹ اس کے سامنے دھر دیئے اور اس کے چہرے پہ نظریں گاڑے سامنے بیٹھ گیا۔ پہلی نظر میں وہ اسے بڑا اچھا انسان لگا۔ پڑھا لکھا' باوقار اور خوش اخلاق۔۔۔ اس نے ڈرافٹ ایک جانب سرکا دیئے' ان کے لئے پینے کے لئے منگوایا اور پھر بڑی خوش خلقی سے کہنے لگا۔

"مناسب سمجھیں تو اپنا تعارف کروا دیں۔۔۔ اچھا' پہلے مجھ سے متعارف ہو لیں۔ میرا نام شوکت علی ہے' میں یہاں پرسنل سیکرٹری ہوں۔ شادباغ کی میاں فیملی سے میرا تعلق



ور میں ایک شریف آدمی ہوں۔۔۔" وہ مسکرا رہا تھا۔۔۔ زلفی نے اپنا اور شایان کا تعارف کرایا اور بتایا کہ میں اس لڑکی کا بھائی ہوں جس کے نام آپ نے یہ ڈرافٹ بھیجے ہیں۔۔۔" شوکت نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

"اگر آپ مناسب سمجھیں تو میرے ساتھ لنچ میں شریک ہو جائیں' مجھے بے حد خوشی ہو گی اور جو کچھ آپ پوچھنا چاہیں' وہ بھی پوچھ لیں۔۔۔"

وہ تینوں نیچے ایک ریسٹوران میں کونے والی میز پر بیٹھ گئے۔ کھانے کے دوران ہی بات یت شروع ہوئی۔ زلفی اور شایان کو احساس ہو گیا تھا کہ ان کا واسطہ ایک شریف اور معقول دمی سے پڑا ہے اس لئے وہ بھی نہایت اطمینان سے اس کی دعوت پہ یہاں تک چلے آئے تھے۔۔۔ شوکت نے ہی بات شروع کی۔

"ذوالفقار صاحب! آپ غالباً" نگہت بی بی کے سوتیلے بھائی ہیں اور شایان صاحب۔۔۔؟"

"جی' آپ کا اندازہ درست ہے۔۔۔ اور شایان صاحب بھی مجھ سے بڑھ کر اس کے بھائی ہ۔۔۔"

وہ خوبصورتی سے مسکرایا' بولا۔ "بہت خوب!۔۔۔ اب آپ مجھ سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں ہ میں نگہت بی بی کو کیسے اور کب سے جانتا ہوں۔۔۔؟"

پھر اس نے ہسپتال میں نگہت سے پہلی ملاقات' دوسری' تیسری' ساری بات تفصیل سے دی۔ ریس کورس پارک میں ہونے والے واقعہ کو بھی من و عن بیان کر دیا۔۔۔ کہنے لگا۔ "ں اگر چاہتا تو ان باتوں کو حذف کر سکتا تھا جو ایک بھائی کے سامنے اخلاقاً" نہیں کرنی چاہئیں ن میں نے ایسا نہیں کیا۔ مجھے اندازہ ہے کہ آپ جو مجھ تک پہنچے ہیں' یقیناً" غیر معمولی ات کے تحت آئے ہیں اس لئے میں نے یہی مناسب سمجھا کہ میں آپ کو معمولی معمولی ئیات سے بھی آگاہ کر دوں' کم از کم جو میں جانتا ہوں۔ پھر بھی آپ کو کچھ ناگوار گزرا ہو تو میں ذرت خواہ ہوں۔۔۔"

پھر اس نے کراچی والی ساری بات بتائی کہ کس طرح نگہت نے اسے ٹیلی فون کیا' کیا کیا ں کیں۔ اپنا ایڈریس یا حالات بتائے بغیر ٹیلی فون بند کر دیا اور یہ بھی کہ نگہت نے اس کا ور کا پتہ اور فون نمبر بھی لے لیا تھا مگر ابھی تک رابطہ نہیں کیا۔۔۔ دونوں اس شریف آدمی باتیں سن رہے تھے' خوش بھی تھے کہ نگہت کی سلامتی کی کوئی خبر ملی اور متردد بھی کہ وہ راچی میں کہاں ہے' کیا کر رہی ہے' کس حال میں ہے اور جان کون ہے' اس کے پاس ان کے

ماموں کا پتہ کہاں سے آیا؟--- پھر یہ خیال آیا کہ شاید وہ نگہت کا شوہر ہو' اس نے اپنے خاوند کو ماموں کا پتہ اور روپے بھیجنے کا کہا ہو جبکہ یہ کام وہ خود بھی کر سکتی تھی یا شاید وہ سامنے نہ آنا چاہتی ہو پولیس کی وجہ سے یا کسی اور خدشے یا مصلحت کے تحت--- بہرحال' یہ بات صاف ہو گئی کہ یہ روپے نگہت نے کراچی سے بھیجے اور وہ کراچی میں ہے۔ کراچی! اتنا بڑا شہر۔ یہ تو ایسا ہی تھا کہ کوئی اندھا بھُس بھرے گودام میں سوئی تلاش کرتا پھرے۔ ایک اور صورت نظر آئی اخبار میں اشتہار دیا جائے لیکن یہ کوشش بھی بے کار تھی۔ اگر نگہت خود انہیں ملنا چاہتی تو رابطہ کر سکتی تھی' اسے کوئی مجبوری نہیں تھی مگر اندازہ ہوا کہ وہ خود ہی ایسا نہیں چاہتی' پردے کے پیچھے رہ کر اپنی بہنوں کی مدد کرنا چاہتی ہے اور بجائے اس کے کہ کراچی جا کر وقت اور پیسہ برباد کیا جائے' بہتر ہے کہ جب اس مرتبہ وہ پیسے بھیجے یا ٹیلی فون پہ رابطہ کرے تو کسی طرح اس سے اس کا ایڈریس معلوم کر لیا جائے۔ یہ تجویز شایان نے پیش کی' اس بات پہ صاد کرتے ہوئے شوکت نے وعدہ کیا کہ وہ اس کا ایڈریس حاصل کرتے ہی ان سے رابطہ کرے گا اور ویسے بھی وہ اگلے ہفتے کراچی جانے والا تھا--- کھانے سے فارغ ہوئے تو پھر دفتر آ بیٹھے۔ اس ملاقات اور بات چیت سے زلفی اور شایان بڑے پرامید اور خوش ہوئے' شوکت کے روپ میں انہیں ایک اچھے انسان سے ملنے کا موقع نصیب ہوا' وہ شوکت کے بارے میں بڑے اچھے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے واپس آئے۔

☆☆☆

گڈو لاہور آ کر اپنی پرانی سرگرمیوں میں مصروف ہو چکی تھی' شوکت کے لاہوری باس سے بھی اس کا ملنا جلنا شروع ہو چکا تھا۔ ٹیلی فون پہ رابطے کے علاوہ وہ خود بھی جب جی چاہتا یا جب اسے طلب کیا جاتا' بے دھڑک چلی آتی۔ اتفاق ہی تھا کہ اس روز ادھر یہ لوگ دفتر کی سیڑھیاں اتر رہے تھے' وہ چڑھ رہی تھی۔ شوکت کے باس کی دوست تھی' وہ دوستی کی نوعیت کو بھی اچھی طرح جانتا تھا لیکن پرسنل سیکرٹری ہونے کی حیثیت سے ہر ملنے والے کو اس کی حیثیت کے مطابق پروٹوکول دینا بھی اس کے فرائض میں شامل تھا۔ اس نے حسبِ معمول بڑی گرم جوشی سے مسکراتے ہوئے اسے خوش آمدید کہا اور واپس آفس میں آ گیا۔

"بٹ صاحب تشریف رکھتے ہیں---؟" وہ بڑی دلربائی سے صوفے پہ ٹکتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"میڈم! وہ آج گوجرانوالہ میں ایک شادی اٹینڈ کر رہے ہیں--- آپ کہیں تو فون پہ رابطہ کرا دوں---؟" شوکت نے جواب دیا۔



"نہیں' ایسا ضروری نہیں--- میں ایک کام سے اِدھر پاس ہی آئی تھی' سوچا کہ بٹ صاحب سے ہی ہیلو ہیلو کرتے چلیں---"

"میں ابھی لنچ کر کے آ رہا ہوں--- آپ چاہیں تو یہیں کچھ منگوا لیتے ہیں---"

"نو' میں لنچ کر چکی ہوں--- ہاں' اگر اچھی سی کافی مل جائے---"

"میں خود بھی چائے کے بارے میں سوچ رہا تھا لیکن اب آپ کے ساتھ کافی چلے گی---"

"سگریٹ لیں گے آپ---؟" وہ اس کی جانب پیکٹ بڑھاتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"تھینکس' میں اس نعمت سے محروم ہوں۔"

وہ سگریٹ کے دھوئیں کے مرغولے چھوڑتے ہوئے بولی۔ "یاد آیا' کراچی سے ایک فرینڈ کا آپ کے لئے ایک میسج ہے کہ روپے پہلی تاریخ تک وہاں پہنچ جانے چاہئیں---"

شوکت چونکا' چند لمحے اسے گھورتے ہوئے بولا۔

"میڈم! اجازت ہو تو کچھ پوچھوں---؟"

"ہاں ہاں' ضرور پوچھو---" وہ کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے بولی۔

"آپ یہ پیغام دینے والی کو جانتی ہیں---؟"

"جواب دینے سے پہلے ایک بات میں آپ سے پوچھوں--- آپ نے یہ کیسے جان لیا کہ یہ پیغام کسی لڑکی کا ہے؟"

"کیونکہ میں اس لڑکی کو جانتا ہوں---"

وہ سنبھل کر بیٹھ گئی' بولی۔ "کیسے جانتے ہیں---؟"

"آپ جب یہاں تشریف لائی تھیں' میرے دفتر کی سیڑھیوں سے اترتے ہوئے دو نوجوان ضرور آپ نے دیکھے ہوں گے---"

"ہاں' دیکھے تھے--- بلکہ انہوں نے رُکتے ہوئے مجھے اوپر جانے کا راستہ دیا تھا---"

"ان میں ایک سفید لباس والا سانولا سا نوجوان اس کا سوتیلا بھائی تھا اور دوسرا پینٹ شرٹ میں خوبصورت سا لڑکا اس کا منہ بولا بھائی---" وہ دونوں ڈرافٹ اس کے سامنے رکھتے ہوئے بتانے لگا۔ "وہ یہ ڈرافٹ مجھے واپس کرنے آئے تھے۔ وہ آئے بڑے گرم موڈ میں تھے لیکن جب میں نے انہیں اپنی پوزیشن بتائی اور ساری بات سمجھائی تو تب جا کر وہ مطمئن ہوئے۔ اس نے مجھے خوامخواہ یہاں قربانی کا بکرا بنایا ہوا ہے جبکہ وہ یہ کام خود بھی کر سکتی ہے۔"

"یہ بتائیں' آپ اس کے متعلق اور کیا جانتے ہیں---؟"

شوکت کے چہرے کی مسکراہٹ ہلکی سی سنجیدگی میں بدل گئی پھر اس نے ساری بات ابتدا سے لے کر اب تک کی سنائی' کراچی والے ٹیلی فون کا ذکر بھی کیا۔ ایئرپورٹ روڈ کے ایکسیڈینٹ' ہسپتال اور جان کی انسانی دوستی کا تذکرہ بھی کیا اور بتایا کہ وہ بڑی بے چینی سے نگہت کے ٹیلی فون کا انتظار کر رہا ہے۔

وہ کافی کی نازک سی پیالی سے آخری گھونٹ لیتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"شوکت صاحب! اب آخر میں یہ بتا دیں کہ کہیں آپ کا آپس میں دل کا معاملہ تو نہیں۔۔۔؟"

وہ کھُل کر ہنسا' پھر بولا۔ "مجھے پہلے ہی خدشہ تھا کہ آپ ایسا ضرور سوچیں گی۔۔۔" وہ سنجیدہ ہو گیا۔ "ایسی کوئی بات نہیں۔۔۔ ماضی میں وہ جن حالات میں مجھے ملی' میں نے شدت سے محسوس کیا کہ وہ مردم گزیدہ ہے۔ اسے ایسے سچے اور ہمدرد دوست کی ضرورت ہے جو حالات کی سنگینی میں اس کا ساتھ دے سکے' اسے مزید بکھرنے سے بچا سکے۔ اپنے تئیں میں نے محض انسانی ہمدردی کے تحت مقدور بھر کوشش کی مگر بدقسمتی کہ حالات نے اسے اور مجھے موقع نہ دیا۔ اب آپ اسے جو چاہیں' کہہ لیں لیکن اگر آپ مناسب سمجھیں تو مجھے اس کا ایڈریس یا فون نمبر دے دیں۔ آپ کی مہربانی ہو گی۔۔۔"

"ویری گڈ' مسٹر شوکت۔۔۔!" وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ "آپ کا جذبہ قابل تحسین ہے لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں اس کے متعلق آپ کو کچھ بھی نہیں بتا سکتی' اسے آپ میری مجبوری سمجھیں۔۔۔ آپ کے اطمینان کے لئے اتنا ضرور کہوں گی کہ وہ بالکل ٹھیک ہے' محفوظ ہے اور پہلے سے بہت بہتر ہے۔ اگر اس نے آپ سے کہا تھا کہ وہ آپ سے رابطہ کرے گی تو آپ انتظار کریں اور ویسے بھی' انتظار کا ایک الگ ہی سواد ہوتا ہے۔۔۔"

اسی روز گڈو نے جان کو کراچی' ادھر کے تمام حالات سے باخبر کر دیا تھا۔ جان کو بے حد دکھ ہوا کہ اس کی بہنوں کو ماموں نے زلفی کے حوالے کر دیا' اگر یہی سب کچھ کرنا تھا تو اتنی مصیبتیں اور پریشانی اٹھانے کی کیا ضرورت تھی۔ جن بہنوں کی خاطر اس نے اپنی زندگی برباد کر دی' وہی بہنیں اس کی تمام قربانیاں نظرانداز کر کے وہیں ازلی دشمنوں کے گھر پہنچ گئی تھیں۔ انتہائی غیض و غضب کے عالم میں وہ ٹیلی فون پہ ہی گڈو' بہنوں اور ماموں' زلفی سب کو گالیاں بکنے لگا۔ گڈو کے لئے اسے سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ وہ حیران تھی کہ جان کو کیا ہو گیا ہے؟۔۔۔ انتہائی طیش کے عالم میں اس نے ٹیلی فون پٹک دیا۔

★★★



جان میں واقعی بہت سی تبدیلیاں پیدا ہو چکی تھیں۔ ریڈ روز کی محبت کا اثر' ماحول' آب و ہوا یا اس کے اندر کے ناسور تھے جو اب پک کر زہریلا لاوا اگل رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ صرف لمحوں کی زندگی جیتا ہے۔ ایک جنگلی سانڈ کی مانند بدمست' سینگوں والی کھلی سفاری جیپ میں کراچی کی سڑکوں پر دندناتا رہتا۔ ٹوٹو اور ریڈ روز نے اسے صرف لڑکیوں کے کاروبار میں ہی خود مختار کیا ہوا تھا' دوسرے کاروبار وہ خود سنبھالتے تھے کیونکہ جان عورت تھا' مردوں سے انتقام کا جذبہ رکھتا تھا۔ پھر اس فیلڈ میں اتنا زیادہ رسک بھی نہیں تھا' وہ اسے محدود اور محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔ ریڈ روز بھی کبھی لڑکی تھا۔ دونوں ہی مَردوں اور نام نہاد اخلاقی' مذہبی تقاضوں سے نفرت کرتی تھیں' دونوں کو ہی اپنوں نے ڈسا تھا۔ دونوں ہی جسمانی موت کے علاوہ ہر قسم کی موت کا سواد چکھ چکی تھیں' دونوں ہی جسمانی موت کے لئے ہر وقت تیار رہتی تھیں۔ وہ بونس کی سانسیں لے رہی تھیں۔

ریڈ روز اس پہ حد سے زیادہ اعتماد کرتا تھا' آہستہ آہستہ وہ اس کے کندھوں پر بوجھ بڑھا رہا تھا۔ جان نے بھی جان توڑ محنت سے اپنے آپ کو اس کے معیار پہ لانے کے لئے کوئی دقیقہ فرد گزاشت نہیں کیا تھا۔ خدا جانے' ریڈ روز اس کیا کام لینا چاہتا تھا۔ وہ ہر روز اسے نئی سے نئی کڑی مشقت میں ڈالتا اور وہ بھی لوہے کے چنے چبا کر برادہ کر دیتا۔ گڈو نے جب سے اس کی بہنوں کے متعلق بتایا کہ زلفی انہیں اپنے ہاں لے گیا ہے' وہ سخت طیش میں تھا۔ اسی غیض کے عالم میں اس نے اپنے دو ساتھیوں کے تھوبڑے نیلے کر دیئے' مکا مار کر دیوار نما شیشہ توڑ دیا۔ اس کے بس میں ہوتا تو وہ اڑ کر لاہور پہنچتا اور پھر کیا ہوتا' یہ اسے خود بھی معلوم نہیں تھا۔۔۔

اس نے لاہور شوکت کو فون کیا تو اس نے بھی من و عن وہی باتیں بتائیں جو گڈو کی زبانی معلوم ہو چکی تھیں۔ شوکت نے مزید پوچھا کہ پندرہ ہزار کے ڈرافٹ وہ لوگ واپس کر گئے

ہیں‘ ان کے بارے میں کیا کیا جائے اور انہیں معلوم ہو چکا ہے کہ تم صحیح سلامت کراچی میں موجود ہو۔ وہ جان صاحب جنہوں نے کراچی میں میری بڑی خدمت کی‘ جن کے ذریعے تم نے مجھے روپے بھجوائے۔ ان سے تمہارا کیا تعلق ہے‘ کہیں وہ تمہارے شوہر تو نہیں ہیں؟

”شوکت! ان فضول باتوں کو چھوڑو۔۔۔ مجھے اپنی بہنوں کی بہت فکر ہے‘ انہیں کسی حالت میں بھی زلفی کے گھر نہیں جانا چاہئے تھا۔۔۔ پلیز! تم میری مدد کرو‘ کسی طرح ان سے رابطہ قائم کر کے انہیں وہاں سے نکالو۔ میں ان کے اخراجات۔۔۔ علیحدہ مکان کے لئے جتنی چاہئے‘ رقم بھیج سکتی ہوں۔۔۔“

”سنو‘ نگہت! تم پہلے بھی مجھ غریب مسکین کو بڑی آزمائشوں میں ڈال چکی ہو۔ میں یہاں ملازمت کر کے اپنا گزارہ کر رہا ہوں‘ چار لوگ میری عزت بھی کرتے ہیں۔ خدا کے لئے‘ اپنے آپ کو سنبھالو اور حالات کو بھی۔۔۔ تمہاری والدہ فوت چکی ہیں۔ جوان بہنیں‘ ماموں کے گھر بوجھ تھیں اور ان کی وجہ سے وہاں کچھ غلط فہمیاں پیدا ہو گئی تھیں۔۔۔ زلفی تمہارا بھائی ہے‘ تمہارا اپنا خون ہے۔ جتنا وہ اپنی بہنوں کے بارے میں مخلص ہو سکتا ہے اتنا کوئی اور نہیں ہو سکتا‘ چاہے وہ تمہارے ماموں ہی کیوں نہ ہوں۔۔۔ میں نے زلفی اور شایان سے بڑی تفصیل سے باتیں کی ہیں‘ ان دونوں کو بڑی اچھی طرح جانا اور سمجھا ہے۔ مجھے وہ بڑے مخلص‘ دردمند اور سمجھدار نظر آئے۔۔۔ مانا‘ ان کے والد سے غلطیاں سرزد ہوئیں لیکن جو ہونا تھا‘ ہو چکا۔ اب وہ ان غلطیوں کو دہرانا نہیں چاہتے بلکہ تدارک کرنا چاہتے ہیں‘ لہٰذا میری تم سے التجا ہے کہ اس معاملے پہ ٹھنڈے دماغ سے غور کرو اور طول مت دو۔ تمہاری بہنیں وہاں محفوظ ہیں۔۔۔ اور تم نے مجھ سے ملنے کا وعدہ کیا تھا‘ میں دن رات تم سے ملنے کے لئے بے چین ہوں۔ کم از کم مجھ پہ اعتبار تو کرو‘ اپنا پتہ اور فون نمبر دو۔۔۔“

”اچھا اچھا‘ زیادہ باتیں مت بناؤ۔۔۔ میں تم سے بہت جلد ملوں گی‘ تم سے ایک پرانا حساب بھی چکانا ہے۔۔۔“

”کون سا۔۔۔ وہ پانچ سو روپے کی ریزگاری والا۔۔۔؟“ شوکت نے پوچھا۔

”نہیں۔۔۔ تھپڑ کا۔۔۔“

ٹیلی فون کھٹ سے بند ہو گیا۔

☆☆☆

سچ تو یہ ہے کہ جان اب صرف بہنوں کے لئے زندہ تھا۔ اپنی زندگی‘ اچھائی برائی‘ نفع نقصان‘ ایسی خرافات پہ سوچنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ وہ ہر قیمت پہ بہنوں کے مستقبل کو بہتر بنانا چاہتا



تھا لیکن پس پردہ رہ کر۔۔۔ زندگی کا جو انداز وہ اپنا چکا تھا‘ اس سے باہر نکلنے کا اب کوئی راستہ نہیں تھا۔ وہ چاہتا بھی تو نکل نہیں سکتا تھا۔ جرائم کی دنیا میں یہی ایک بڑی خامی ہے کہ داخل ہونے والا کشتیاں جلا کر داخل ہوتا ہے۔ پھر وہ مر کر تو فارغ ہو سکتا ہے‘ جیتے جی نکل نہیں سکتا۔۔۔ پولیس‘ مقامی غنڈے بدمعاش‘ سمگلر‘ منشیات فروش‘ بردہ فروش‘ وہ ہر اک کی نظر میں تھا۔ شوکت بیچارا نگہت سے ملنا چاہتا تھا‘ زلفی اور شایان اپنی بہن نگہت کی تلاش میں سرگرداں تھے‘ رفعت اور فرحت اپنی باجی کی راہ دیکھ رہی تھیں لیکن اب جان‘ اس نگہت کو کہاں سے لائے۔ جان نے تو نگہت کا ناس مار دیا تھا‘ شاید ہی اس میں کوئی نسوانی بافت و ریخت کہیں پھنسی رہ گئی ہو۔ اس نے تو چن چن کر اپنی ساری نسوانیت نکال پھینکی تھی۔ اب جان بن کر وہ بہنوں کے پاس نہیں جا سکتی تھی‘ ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتی تھی‘ ان سے کوئی تعلق یا رشتہ نہیں جتا سکتی تھی۔ نگہت بن کے پس پردہ رہ سکتی تھی مگر اب شاید یہ بھی ممکن نہیں رہا تھا۔ گڈو‘ شوکت سے کئی بار مل چکی تھی۔ شوکت سے زلفی‘ شایان مل چکے تھے اور اب کہیں نہ کہیں‘ کبھی نہ کبھی حقیقت سامنے ننگی ہو جائے گی۔ پھر جو کچھ ہوگا‘ لوگ پہلے والی داستان کو بھول جائیں گے۔۔۔ سوچ سوچ کر اس کا دماغ الٹ گیا تھا۔ پھر ٹیس اسے ریڈ روز کی نصیحت یاد آئی کہ جب محسوس کرو کہ مقابل تم پہ حملہ کر دے گا تو پھر تمہارے لئے صرف ایک راستہ ہے جہاں تم اپنی عزت‘ وقار اور جان تک بچا سکتے ہو۔ تم فوراً“ سے پہلے اس پر حملہ آور ہو جاؤ‘ اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دو اور اگر ایسا نہ کیا تو ذلیل ہو گے اور کتے کی موت مارے جاؤ گے۔ دوسری نصیحت یہ تھی کہ جب تم محسوس کرو‘ تمہارے اندر فوری فیصلہ کرنے کی صلاحیت مفقود ہو گئی ہے تو فوراً“ اپنے کفن دفن کا انتظام اپنے ہاتھوں کر لو‘ کنپٹی پہ موزر رکھ ٹریگر دبا دو تاکہ تمہارا ناکارہ بھیجہ دوسرے راستے سے باہر نکل کر بکھر جائے۔ جرائم اور گرفت میں فوری فیصلہ ہی اہمیت رکھتا ہے‘ تذبذب دو دھاری تلوار کی دھار ہوتا ہے اور دوسرے کو نقصان پہنچے یا نہ پہنچے‘ خود کو نقصان ضرور پہنچ جاتا ہے۔۔۔

اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ہر کاسٹ پہ لاہور ضرور جائے گا۔ کچھ بھی ہو‘ نتیجہ کچھ بھی نکلے لیکن اپنی بہنوں کے مستقبل کے لئے ضرور کچھ کرے گا۔۔۔ دن گزرتے گئے‘ اس کے جنون اور اندر کی توڑ پھوڑ میں اضافہ ہوتا گیا اور پھر قدرت نے اس کے لئے خود سامان پیدا کر دیا۔

☆☆☆

کراچی لسانی فسادات کی زد میں آ چکا تھا‘ قتل و غارت کا بازار گرم ہو گیا۔ سیاسی جوڑ توڑ شروع ہو گئے۔ آتشزدگی‘ توڑ پھوڑ روزمرہ کا معمول بن گئی۔ بہتی گنگا میں سب ہی ہاتھ دھو

رہے تھے۔ بھائی، بھائی کا دشمن۔ ہر روز کئی کئی لاشیں قبروں میں اترنے لگیں تو جزوی طور پہ
کراچی کو فوج اور رینجرز کے حوالے کر دیا گیا۔ حساس اداروں اور قانون نافذ کرنے والے
محکموں میں تبدیلیاں آئیں۔ مقامی غنڈوں، سمگلروں اور مشکوک افراد پہ گرفت پڑنے لگی۔
سیاسی لوگ جیلوں میں بند کر دیئے گئے۔ چوک چوراہوں، شاہراؤں پہ فوج مورچہ زن ہو گئی۔
مشین گنیں، بکتر بند گاڑیاں باہر نکل آئیں۔ عوام خواص، خاص طور پہ کاروباری طبقہ اپنے
آپ کو غیر محفوظ سمجھتے ہوئے پنجاب کی جانب رخ کرنے لگے۔ ہوٹل، تفریح گاہیں، کاروباری
مراکز سنسان پڑ گئے۔ ان کا ہیلتھ سنٹر اور دیگر غیر قانونی کام بھی اسی افراتفری کی زد میں آ گئے۔
پرانے تعلقات والے افسران بھی تبدیل ہو چکے تھے۔ نئے لوگوں نے بلا رعایت و تمیز ان کی
گردنیں ناپنا شروع کر دیں، یہ اپنی شکلیں چھپاتے پھر رہے تھے۔ اسی عالم افراتفری و بے
اطمینانی میں ریڈ روز نے جان کو مشورہ دیا کہ تم فوراً" یہاں سے نکل جاؤ۔ گڈو اور پیٹر کو میں
نے ساری بات سمجھا دی ہے۔ انہیں جا کر ملو، باقی سب کچھ وہ تمہیں سمجھا دیں گے۔ میں فی
الحال کراچی سے نکل نہیں سکتا، میں ان کی نظر میں ہوں--- وہ اسے گلے سے لگاتے ہوئے
بولا۔

"گڈ لک، میری بہن!--- محسوس ہوتا ہے جیسے یہ ہماری آخری ملاقات ہے--- اپنا
خیال رکھنا۔ اپنی بہنوں کا مستقبل سنوارنا، انہیں اچھے گھرانوں میں بیاہنا اور کبھی مرد ذات پہ
بھروسہ نہ کرنا---" پھر وہ اسکا ماتھا چومتے ہوئے بولا۔ "زندہ رہا تو لاہور میں ملاقات ہو
گی---"

لاہور ایئرپورٹ پہ گڈو اور پیٹر موجود تھے--- پیٹر پال یہاں ایک فائیو سٹار ہوٹل میں
ہیڈ بار مین تھا۔ راک ہڈسن کی سی شباہت، وہی اسٹائل، وہی قد و کاٹھ۔ خوش پوش، شیریں
گفتار، انگلش میں بات چیت امریکن لہجے میں کرتا تھا۔ غیر مسلموں اور شراب کے پرمٹ
ہولڈروں کے لئے قانونی اور غیر قانونی، دیسی ولایتی شراب کا پرائیویٹ کاروبار بھی تھا۔ وہ
ریڈ روز کو اپنا پیر استاد مانتا تھا۔ ظاہر ہے، کال گرلز بھی سپلائی کرتا تھا۔ گڈو کی اعانت بھی اسے
حاصل تھی، گلبرگ کی ایک شاندار کوٹھی اس کی آماجگاہ تھی--- جان کے بارے میں اسے
ہدایات مل چکی تھیں۔ دراصل ریڈ روز نے اپنا سارا کاروبار لاہور منتقل کرنے کا منصوبہ بنایا تھا،
سرمایہ بھی یہاں منتقل کیا جا چکا تھا--- دو چار روز تو جان نے خوب ڈٹ کر آرام کیا۔ اس
دوران نہ تو اس نے شوکت سے کوئی رابطہ قائم کیا اور نہ کسی اور کو کوئی اطلاع دی۔ وہ
دراصل ریڈ روز کی ہدایات یا احکامات کا منتظر تھا، کراچی سے آنے کے بعد اس سے براہ راست



رابطہ نہ ہو سکا تھا۔ گڈو اور پیٹر بھی پریشان تھے لیکن جان پریشان ہی نہیں، بلکہ ہلکان ہو رہا تھا،
رہ رہ کر اسے ریڈ روز کے الفاظ یاد آ رہے تھے۔ بے شمار خدشے اسے سانپوں کی طرح ڈس
رہے تھے، وہ دل ہی دل میں اس کی سلامتی کے لئے دعائیں مانگ رہا تھا---

☆☆☆

ہفتے کی رات تھی۔ پیٹر پال بڑے کرسٹل باؤل میں پارٹی کاک ٹیل تیار کر رہا تھا جب ٹیلی
فون کی گھنٹی بجی۔ کراچی سے ٹینا ٹوٹو لائن پہ تھی۔ ریڈ روز اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ مارا گیا
تھا، لین دین کے کسی معاملے میں اسمگلروں نے اس کی لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے تھے
اور کٹی ہوئی گردن بطور رسید اس کے دفتر پہنچا دی گئی تھی، وہی ہوا جس کا خدشہ تھا۔ ٹوٹو کی
ہدایت تھی کہ نہایت خاموشی، صبر اور رازداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس صدمے کو برداشت
کیا جائے۔ حالات بڑے خراب ہیں، وقتی طور پر فوراً" اپنی ہر طرح کی سرگرمیاں ترک کر دی
جائیں اور بعد کی ہدایات کا انتظار کیا جائے--- یہاں تو جیسے سب کی کمر ٹوٹ گئی۔ گڈو اور جان
نے رو رو کر برا حال کر لیا۔ وہ جیسا بھی تھا، ان کا محسن اور ہمدرد تھا۔ دن اجاڑ اور راتیں ویران
ہو کر رہ گئیں۔ سارا سارا دن میوزک، تاش اور شراب--- ایکسرسائز اور ٹریننگ رکی ہوئی
تھی۔ جسمانی ورزش کرنے والا بھوکا تو رہ سکتا ہے، روٹین کی ایکسرسائز کے بغیر وہ مریل ٹٹو کی
مانند ڈھے سا جاتا ہے۔ کاہلی، سستی نے رنگ دکھانا شروع کیا تو پیٹر پال نے اصرار کر کے
گلبرگ کا ایک باڈی ہیلتھ کلب جوائن کروا دیا۔ یہ ایک انتہائی ماڈرن، مہنگا کلب تھا۔ یہاں کا
مالک اور ہیڈ کوچ دلاور مغل تھا۔ داخلے کے وقت وہ فرسٹ انٹرویو میں قطعی محسوس نہ کر سکا
کہ اس کے سامنے بیٹھا ہر لحاظ سے فٹ نوجوان لڑکا نہیں، لڑکی ہے۔ یہاں وہ دن رات اپنی
اداسیوں کو جان توڑ ورزش کے پسینے میں خارج کرنے لگا، گڈو بھی اکثر اس کے ساتھ آتی جسے
یہاں کے لوگ اس کی گرل فرینڈ سمجھتے تھے--- شوکت اسی دوران کراچی کا چکر لگا آیا تھا۔
وہاں بھی وہ انتظار میں رہا کہ نگہت اس سے رابطہ کرے گی، اسے کیا علم کہ وہ لاہور بیٹھی اپنا غم
غلط کر رہی ہے جبکہ وہ لاہور بھی پیغام چھوڑ آیا تھا کہ اگر اس کا کوئی ٹیلی فون آئے تو کراچی
گلف ہوٹل کو ریفر کر دیا جائے۔ انتظار کرتے کرتے وہ واپس لاہور بھی آ گیا مگر نگہت کا ٹیلی فون
نہ آنا تھا، نہ آیا۔ ایک دن گڈو نے ہی جان سے کہا کہ چلو، آج تمہیں ایک دوست سے ملاتے

ہیں۔ جان تو جیسے بے جان سا ہو کر رہ گیا تھا۔ ریڈ روز کی موت نے اسے اپنے بیگانے' یہاں تک کہ خود سے بیگانہ کر دیا ہوا تھا۔ لاہور آ کر اسے ایک بار بھی بہنوں' شایان یا زلفی کی یاد نہ آئی۔ ریڈ روز کے علاوہ اسے کچھ یاد ہی نہ تھا۔ کسی رُوبوٹ کی طرح وہ گڈو کے ساتھ چل دیا۔

دفتر میں داخل ہوئے تو شوکت اس کے سامنے تھا۔ اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا' یکلخت جیسے جان کی جان سے نگہت باہر اچھل پڑی ہو۔ اس نے بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا۔ شوکت نے بڑی دلآویز مسکراہٹ سے ان کا استقبال کیا۔ وہ بڑی گرم جوشی سے جان سے مصافحہ کرتے ہوئے بولا۔

"آپ کو لاہور میں دیکھ کر بہت خوشی ہوئی' شکریہ! آپ نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ لاہور تشریف لا کر ملاقات کا شرف بخشا---"

وہ مس گڈو کو کراچی والے ایکسیڈینٹ اور مسٹر جان کی ہمدردی اور مدد کرنے کی تفصیلات بتانے لگا۔ گڈو مسکرا کر دونوں کا تماشا دیکھ رہی تھی' پھر کہنے لگی۔

"دیکھ لیجئے' ہم نے کیسی شخصیت سے آپ کی ملاقات کروائی ہے---" پھر گڈو نے خود ہی بات چھیڑی۔ "سنایئے' وہ زلفی اور شایان صاحب پھر آئے یا نہیں---؟"

"جی نہیں' وہ خود تو نہیں آئے البتہ دو تین بار ٹیلی فون آئے ہیں۔" شوکت نے بتایا۔

"کوئی کراچی سے ٹیلی فون یا اطلاع---؟" دراصل گڈو مطمئن ہونا چاہتی تھی کہ وہ جان کی اصلیت پہچان پایا ہے یا نہیں؟

"میڈم! وہاں بھی خاموشی ہے جبکہ میں کراچی کا چکر بھی لگا آیا ہوں' وہاں بھی اس نے کوئی رابطہ نہیں کیا---"

جان خاموشی سے گفتگو سنتے ہوئے ۔ ۔ ۔ ۔ شوکت کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ یہ اللہ کا بندہ ذرا بھی تو نہیں بدلا۔ کس مٹی کا بنا ہوا ہے' مجھ سے کیا چاہتا ہے' ملنے کے لئے کیوں بے چین ہے۔ جوان ہے' اسمارٹ اور پڑھا لکھا ہے۔ ایک سے ایک اچھی لڑکی اسے مل سکتی ہے' مجھ سے کیوں دلچسپی رکھتا ہے؟

"میڈم! آپ خود ہی باتیں کئے جا رہی ہیں--- مسٹر جان کا تفصیلی تعارف کروائیں' مجھے کچھ ان کی خدمت کا موقع دیں۔ میں تو بڑی بے چینی سے ان کی لاہور آمد کا منتظر تھا---" شوکت بولا۔

"یہ تو آپ نہ کہئے کہ آپ ان کے منتظر تھے--- البتہ بے چینی سے آپ کسی اور کے منتظر ضرور ہیں۔" گڈو نے جواب دیا۔



وہ حسب عادت کھل کھلا کر ہنسا' بولا۔ "بات بنانا تو کوئی آپ سے سیکھے--- میں نے اس دن بھی عرض کی تھی کہ ایسی کوئی بات نہیں۔ پھر بھی آپ مصر ہیں تو چلئے' یونہی سہی--- فی الحال میں ان کے بارے میں کچھ جاننے کے لئے بیتاب ہوں۔" وہ جان کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگا۔

"بھئی" یہ ملنگ قسم کے انسان ہیں۔ بڑے مخلص اور شریف--- آپ ان کے حلیئے پہ نہ جایئے گا' اندر سے یہ بالکل اپنے باہر سے برعکس ہیں---"

اچانک باہر سے شوکت کے لاہوری باس تشریف لے آئے۔ رسمی تعارف کے بعد وہ اپنے دفتر میں چلے گئے' ساتھ ہی گڈو بھی چلی گئی۔ شوکت بھی جان سے معذرت چاہتے ہوئے چند منٹ کی اجازت لے کر باس کے کمرے میں چلا گیا۔ اب جان ٹھنڈے سپرائیٹ سے لطف اندوز ہوتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ وہ کس چکر میں پھنس گیا ہے۔ گڈو اس کا گڈا باندھنے پہ تلی ہوئی تھی۔ وہ کیا کرے' کیا نہ کرے۔ اس شوکت سے کس طرح نبٹے؟ یقیناً" اس کے دل میں کہیں اس کے بارے میں نرم گوشہ موجود تھا۔ اچانک اس کے اندر کہیں دبی مری عورت جاگی-- کاش! وہ اس مخلص اور انتہائی شریف نوجوان کی شرافت اور اخلاص کا کسی طرح کوئی جواب دے سکتی لیکن شاید وہ ایسا چاہتے ہوئے بھی ایسا نہیں کر سکتی تھی--- شوکت باس کی سن کر واپس آ گیا اور بولا۔

"میں ایک بار پھر معافی چاہتا ہوں' باس سے کچھ نوٹس لینے ضروری تھے--- آپ ایک اور ڈرنک لیں گے؟" وہ اس کی خالی بوتل دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"نہیں' شکریہ---!"

"ہاں' تو آپ کس بزنس میں ہیں۔ وہ جان کو گہری نظروں سے تولتے ہوئے پوچھنے لگا۔

جان سٹپٹا کر رہ گیا کہ کیا بتائے؟ جھٹ بولا۔ "لیدر جیکٹس کا چھوٹا سا بزنس ہے---"

"ویری گڈ--- میرے بھی کئی دوست لیدر جیکٹس ایکسپورٹ کرتے ہیں۔ آپ ضرورت محسوس کریں تو میں بڑی خوشی سے آپ کو ان سے ملوا سکتا ہوں--- میرا مطلب ہے کہ آپ کراچی سے نئے نئے آئے ہیں' یہاں آپ کی جان پہچان بھی کم ہو گی۔ سیالکوٹ اور لاہور میں میرے کئی واقف ہیں' آپ کی کچھ خدمت کر کے مجھے بڑی خوشی ہو گی۔"

"تھینکس' شوکت صاحب! مس گڈو آپ کی بہت تعریف کر رہی تھیں۔ مجھے یقیناً" آپ کی ہیلپ کی ضرورت پڑے گی' شاید اسی لئے آج مس گڈو آپ کے پاس لائی ہیں۔ کراچی بزنس وائز بڑا ڈیڈ ہو گیا ہے' اب تو لاہور ہی کچھ کرنا پڑے گا--- ویسے کراچی میں آپ

کے کوئی رشتہ دار وغیرہ بھی ہوں گے' وہاں کے حالات بڑے خراب ہیں۔"

"رشتہ دار تو کوئی نہیں البتہ ایک دکھ دینے والا ضرور موجود ہے جس کی فکر لگی ہوئی ہے---" وہ اک دم سنجیدہ سا ہو گیا۔

جان جیسے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھنے لگا۔ "دکھ دینے والا--- میں کچھ سمجھا نہیں؟"

"میں بھی اسے ابھی تک نہیں سمجھا' بس یونہی منہ سے نکل گیا ہے۔" وہ پھیکا سا مسکرانے لگا۔ "چھوڑیئے اس بات کو---" موضوع بدلنے کی کوشش میں کہنے لگا۔ "جان صاحب! سچ پوچھیں تو آپ سے مل کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم بہت پرانے ملنے والے ہیں۔ آپ کی آواز باتوں اور شخصیت سے پرانی شناسائی کی خوشبو محسوس ہوتی ہے جبکہ ہماری یہ دوسری' تیسری ملاقات ہے---"

جان گھبرا سا گیا' سنبھلتے ہوئے جواب دیا۔ "---دراصل جب دو مخلص انسان آپس میں ملتے ہیں تو دونوں کو اپنی اپنی جگہ یہی محسوس ہوتا ہے--- مجھے بھی ایسا ہی محسوس ہوا ہے۔"

☆☆☆

کانٹے کی نوک ٹوٹ کر اندر رہ جائے تو عجیب میٹھی سی کسک محسوس ہوتی ہے' تکلیف تو زیادہ نہیں دیتی مگر اسے نظرانداز بھی نہیں کیا جا سکتا۔ جان کی ملاقات بھی کچھ ایسی ہی کیفیت لئے ہوئے تھی۔ لاکھ جھٹکنے کے باوجود شوکت اسے اپنے ذہن سے نہ نکال سکا۔ ساری رات لاشعوری طور پہ اندھیروں میں بھٹکتا رہا۔ بجلی کے لپکتے کوندے کی مانند شناسائی کا کوئی چھپاکا لرزتا لیکن منظر صاف ہونے سے پیشتر پھر وہی اندھیرا مسلط ہو جاتا۔ اسی کشمکش میں کہیں صبح صادق سے پہلے نیند کی دیوی نے اسے ہلکی ہلکی تھپکیاں دینا شروع کیں' آسودگی کی ہلکی ہلکی خنکی نے اس کے ذہنی خلفشار کی پولی پولی جھاگ صاف کر دی اور جونہی ذہن کی سطح صاف ہوئی تو قطرہ قطرہ موتی ٹپکاتی دراز بھیگی زلفوں والی اک جل پری نمودار ہوئی--- ہائیں! یہ تو نگہت تھی--- کچی نیند میں "نگہت' نگہت" پکارتا وہ اٹھ بیٹھا۔ پیشانی پسینے سے بھیگی ہوئی--- ٹھنڈے پانی کے چند گھونٹ پیئے' غور کرنے لگا--- نہیں' یہ نگہت نہیں ہو سکتی۔ تنومند جوان' فراخ سینہ' بھرے بھرے بازو۔ وہ تو ایک نوجوان مرد--- لیکن اس کا اندر بول رہا تھا کہ نہیں' وہ نگہت ہے۔ انسان لاکھ بھیس بدلے مگر اپنی آنکھیں نہیں چھپا سکتا' وہ انہیں بدل نہیں سکتا اور اگر بدل بھی لے تو ان کے اندر کی خوشبو اور خاص کر اس مخصوص چمک کو تو چھپایا ہی نہیں جا سکتا جو صرف عورت کی آنکھ میں ہوتی ہے اور پھر وہ آنکھ جس میں چاہت اور چاہے جانے کے دیپک روشن ہوں۔ وہ ان آنکھوں اور اس چمک کو کیسے بھول سکتا تھا جن کا مطالعہ



اس نے کبھی پہروں سامنے بیٹھ کر کیا تھا۔ وہ اسے اس کی خوشبو اور آنکھوں سے پہچان چکا تھا' ر وہ سو نہ سکا۔

☆☆☆

رفعت اور فرحت اپنے گھر لاہور کیا آئیں گویا جنت میں اُتر آئی ہوں۔ سوتیلی ماں اور بہن بھائیوں کے بارے میں جو بھی سُنے سنائے' اچھے بُرے خدشات تھے وہ سب حرفِ غلط ثابت ہوئے۔ سوتیلی ماں نے انہیں کھلے دل سے کلیجے لگا لیا تھا۔ چند دنوں میں ہی اجنبیت اور دوری جھجک دور ہو گئی۔ نین تارا تو اس کی پکی سہیلی بن گئی تھی۔ اٹھنا بیٹھنا' کھانا پینا' سینا پرونا' ہردم ساتھ رہتیں۔ یوں محسوس ہونے لگا جیسے دُکھوں' پریشانیوں اور آزمائشوں کے بادل کھل کر برسنے کے بعد چھٹ چکے ہوں اور اب خوشیوں' شادمانیوں کی نرم نرم' اُجلی اُجلی سنہری دھوپ انہیں آسودگی اور طمانیت بخشنے پہ آمادہ ہے۔ ماں' بھائی کے ساتھ دو چار بار باپ کی قبر پہ ہو آئی تھیں۔ ماں بھی شاید اپنے مرحوم شوہر کی بے التفاتی اور بے انصافی کا اس طرح ازالہ کر کے اس کی بے چین اور مضطرب روح کی تشفی اور آخرت کا سامان مہیا کرنا چاہتی تھی۔ ان بچیوں کے لئے اپنی ممتا کے سارے خزانے نچھاور کر دیئے اور وہ بھول ہی گئیں کہ کبھی انہوں نے دکھ اور عسرت کے دن دیکھے تھے۔ ایک آدھ بار تو بے اپنے ماموں ممانی سے بھی مل آئیں' وہ لوگ بھی لاہور آتے تو انہیں ملے بغیر نہ جاتے۔ ممانی جو انہیں منحوس' مصیبت اور مشکوک کردار کی سمجھتی تھی اور انہیں ایک پل بھی اپنے گھر میں رکھنے کی رَوادار نہ تھی' وہی اب ان کے آگے پیچھے بچھی جا رہی تھی۔ ان کی تعریفیں کرتی نہ تھکتی بلکہ ان کی قسمت' خوشحالی' آسودگی کو رشک بھری نظروں سے دیکھتی۔ باتوں ہی باتوں میں زلفی کی امّی نے یہ ذکر بھی کیا کہ میں انشاء اللہ اپنی بیٹیوں کو بڑی شان سے بیاہوں گی' باپ کی بے انصافیوں کی ساری کسر پوری کردوں گی۔ باپ کی جائیداد کا پورا پورا حصہ اور لاکھوں کا جہیز دے کر رخصت کروں گی' بس کسی اچھے لڑکے کی تلاش ہے۔ جونہی مل گیا' فوراً" رفعت کے ہاتھ پیلے کردوں گی۔ رفعت کی ممانی کو اب اپنی کی ہوئی باتیں اور سلوک یاد آ رہا تھا جو اس نے ان بچیوں سے رَوا رکھا تھا' اب یہ بیوقوف پچھتا رہی تھی۔ یہی لڑکیاں اب اسے سگھڑ' زمانے بھر میں یکتا اور خوش بخت دکھائی دے رہی تھیں۔ اس کے دل میں کہیں خواہش اُبھری کہ رفعت اگر میری بہو بن جائے تو خاوند کی بات بھی رہ جائے گی' اپنی کرتوتوں کا بھی ازالہ ہو جائے اور لاکھوں کا جہیز--- انسان بڑا تھوڑدلا ہوتا ہے۔ اس کی نفرتوں' محبتوں اور خواہشوں کا کوئی ٹھور ٹھکانا نہیں ہوتا۔ یہ تھوڑ دلی اور مطلب کی بندی' اب ان سے میل ملاپ رکھنے لگی تھی۔

زلفی اپنی بچھڑی ہوئی ستم زدہ بہنوں کو پا کر بہت خوش تھا مگر اس کی خوشی کی تکمیل تو تب ہوتی جب نگہت کو بھی تلاش کر کے اپنے گھر لے آتا۔ اس کے باوجود ماں کی معاملہ فہمی اور دانشمندی نے اس ٹوٹے ہوئے عتاب زدہ گھر کو نئے سرے سے خوشیوں اور گہما گہمیوں کا گہوارہ بنا دیا تھا۔ زلفی کے بس میں ہوتا تو وہ دنیا بھر کی خوشیاں اپنی ماں' بہنوں اور شایان کے قدموں میں ڈھیر کر دیتا۔ اس کا کاروبار بھی پھر سے جم گیا تھا۔ رشتے دار' جان پہچان والے' محلے دار بھی آہستہ آہستہ قریب آ رہے تھے بلکہ بہنوں کو گھر لانے پہ خوشی اور پسندیدگی کا اظہار کر رہے تھے۔ نگہت کے بارے میں تشویش ضرور تھی کہ خدا جانے وہ کراچی' کس حال میں ہو۔ اسے شک تھا کہ اس نے وہیں کہیں شادی کر لی ہے اور اس کا شوہر کوئی آسودہ حال شخص ہے' اسی لئے تو وہ اپنی بہنوں کو بڑی بڑی رقمیں بھیج رہی تھی۔۔۔

شایان' اپنے گھر میں اللہ کی رحمت بنا ہوا تھا۔ بوڑھے ماں باپ تو جیسے پھر سے جوان ہو گئے تھے۔ لاہور میں زلفی' قاسم اور نین تارا سے اکثر ٹیلی فون پہ رابطہ رہتا اور جب جی چاہتا' ملنے کے لئے خود بھی آنکلتا۔ والدہ اور کبھی کبھی شگفتہ بھی ساتھ ہوتی۔ دونوں گھروں میں خوب دھما چوکڑی مچتی' شرارتی لڑکیوں کا مینا بازار سا لگ جاتا۔ زلفی' قاسم اور شایان کے لئے بڑی پریشانیاں پیدا ہو جاتیں۔ گاڑیوں میں لاد لاد کر گھمانے لے جانا پڑتا۔ لارنس گارڈن' گول گپے' ڈرامے' جوائے لینڈ' اسٹیڈیم' برگرز' چائنیز۔ پیسے خرچتے خرچتے' ان کی اوٹ پٹانگ فرمائشیں اور نخرے برداشت کرتے کرتے ناک میں دم آ جاتا۔ گویا ان سب لڑکیوں کے اکٹھے ہونے پہ دن تتلیوں کے تماشے' شامیں جگنوؤں کی باراتیں اور راتیں رنگوں کی رُتیں لے کر آتی تھیں۔

شگفتہ کا اس گھر کو سنبھالنے میں نمایاں حصہ تھا۔ کچھ چہرے' کچھ ادائیں عادتیں' سبھاؤ اور طبیعتیں ایسی ہوتی ہیں جو دلوں میں گھر کر لیتی ہیں۔ زلفی کی ماں' شگفتہ کو اپنی بہو سمجھ کر ہی اس کے ساتھ برتاؤ کرتی تھی۔ گو ابھی تک اس نے باقاعدہ سے اس کا ہاتھ نہیں مانگا تھا' ابھی اشاروں کنائیوں میں ہی کھچڑی پک رہی تھی اور وہ کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھیں۔ پھر ایک دن موقع پا کر انہوں نے شایان اور شگفتہ کی ممانی سے بات چھیڑی۔

"بہن! ہماری غلطی اور بیوقوفی کہ ہم نین بیٹی کا رشتہ مانگ بیٹھے تھے۔ اللہ سلامت رکھے شایان بیٹے کو' یہ اسی کا حق ہے۔۔۔ شگفتہ نے ہماری بڑی خدمت کی ہے' ماشاء اللہ بڑی سگھڑ اور دھیمی طبیعت والی لڑکی ہے اور سچ پوچھو تو میں اس کے بغیر اب ایک پل بھی نہیں رہ سکتی۔ ہم پہ مہربانی کر کے ہمارے ساتھ چلو۔ میں شگفتہ کو اپنی بیٹی بنانا چاہتی ہوں۔ ذوالفقار میرا ہی



نہیں' تمہارا بھی بیٹا ہے۔"

نین تارا کی امی خوش ہو کر بولی۔ "یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے' ماشاء اللہ دونوں کی جوڑی خوب رہے گی۔ شایان اور زلفی ویسے بھی ایک جان دو قالب ہیں' اس طرح ان کی دوستی اور بھی مضبوط ہو جائے گی۔۔۔ جب کہو' میں چلنے کے لئے تیار ہوں اور زلفی پتر کے لئے مجھے ان کے پاؤں بھی پڑنا پڑا تو دریغ نہیں کروں گی لیکن ایک بات واضح ہے۔ وہ بیٹی والے ہیں۔ کیا جواب دیں' یہ ان پہ منحصر ہے البتہ مجھے خدا کے گھر سے امید ہے کہ وہ ہمیں مایوس نہیں لوٹائیں گے۔"

پھر ماں نے بیٹے کے دل کی جاننے کے لئے اس کو ٹٹولا' وہ تو غصے سے لال پیلا ہو گیا۔

"امی! وہ میرے عزیز از جان دوست شایان کی بہن ہے۔ ایک بہن کے ناطے اگر اس نے ہمارے کڑے وقتوں میں ہماری خدمت کی یا ساتھ دیا ہے تو اس کا یہ قطعی مطلب نہیں کہ ہم اسے بہو بنا کر گھر لے آئیں۔ وہ لوگ کیا کہیں گے' شایان کیا سوچے گا۔ یہ تو بڑی خودغرضی اور چھوٹی حرکت ہے۔ میں وہاں شادی نہیں کروں گا اور پھر ابھی میں شادی کا سوچ بھی کیسے سکتا ہوں؟۔۔۔ گھر میں جوان بہنیں ہیں' نگہت بہن کا کچھ پتہ نہیں۔ جب تک یہ سارے مسئلے حل نہیں ہو جاتے' اس بابت مجھ سے کوئی بات نہ کیجئے گا۔"

ماں قدرے خفگی سے بولی۔ "زلفی میرے سامنے بڑا بننے اور اپنا حکم چلانے کی کوشش مت کرو۔ باپ اگر موجود نہیں تو اس مطلب یہ نہیں کہ تم گھریلو معاملات میں فیصلے بھی خود اپنی عقل کے مطابق کرو۔۔۔ تمہاری بہنوں کو گھر لانے کا فیصلہ میرا تھا جو تمہاری عین خواہش کے مطابق تھا۔ اب بھی تم ماں کے فیصلے کے پابند رہو گے اور میں فیصلہ کر چکی ہوں کہ میری بہو بنے گی تو صرف شگفتہ' اور مجھے پورا پورا یقین ہے کہ وہ میری خواہش اور درخواست کا احترام کریں گے۔۔۔ بیوقوف لڑکے!۔۔۔ عورت ہونے کے ناطے میں شگفتہ کے احساسات کو بھی سمجھتی ہوں' میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ وہ بھی اس فیصلے سے بہت خوش ہو گی۔۔۔ اور ہاں' میں اس معاملے میں قاسم کی امی سے رسمی طور پہ بات کر چکی ہوں۔ انہوں نے بھی پسندیدگی کا اظہار کیا ہے اور کہا ہے کہ آپ کو شگفتہ جیسی بیٹی ہی چاہئے اور انہیں بھی زلفی جیسا برخوردار۔۔۔ پتر! جوڑیاں آسمانوں پہ جوڑی جاتی ہیں' خود نہیں جوڑی جاتیں۔ بس خاموشی سے دیکھتے جاؤ۔"

ماں کے سامنے مزید زبان کھولنے کی جرات نہ پا کر وہ خاموشی سے وہاں سے کھسک لیا۔

ادھر ماں آنے والے جمعہ' شایان کے گھر جانے کی تیاریوں میں لگ گئی۔۔۔ اتفاق سے

دوسرے روز شایان' انکم ٹیکس کے سلسلے میں لاہور آیا تو زلفی سوچ میں پڑ گیا کہ اس سلسلے میں اس سے بات کرے یا نہ کرے؟۔۔۔ شایان بھی محسوس کر رہا تھا کہ وہ کچھ بات کرنا چاہتا ہے۔

"کیا بات ہے' منہ لٹکائے بیٹھے ہو۔۔۔ کچھ کہنا چاہئے ہو یا کوئی اور پریشانی ہے؟" شایان نے اسے کچھ کہنے پر اکسایا۔

"یار! آج تک تم سے کچھ بھی نہیں چھپایا لیکن آج ایک بات ایسی آپڑی ہے کہ چھپائے بھی نہ بنے اور کہے بغیر رہا بھی نہ جائے۔"

"میرے بھائی! وہ کون سی بات ہے۔ جسے کہنے کے لئے تمہیں ایسی تمہید باندھنے کی ضرورت محسوس ہوئی ہے؟"

زلفی نے دل پکا کرتے ہوئے ساری بات اول کا آخر تک بیان کر دی اور آخر میں کہنے لگا۔

"شایان بھائی! خدا جانتا ہے' یہ سب کچھ اس لئے کہنے پہ مجبور ہوں کہ میں تم سے کچھ چھپانا بھی چاہوں تو کچھ چھپا نہیں سکتا۔ میں اسے انتہا درجے کی بددیانتی سمجھتا ہوں کہ دوست سے کچھ چھپایا جائے۔۔۔"

شایان مسکرانے لگا' بولا۔ "زلفی! تم میں ایک بُری عادت یہ ہے کہ تم ہمیشہ کان کو ہاتھ گھ کر پکڑتے ہو۔ تم یہ بات دو چار سادہ سے لفظوں میں بھی بیان کر سکتے تھے اور پھر اس میں کو سی ایسی قباحت اور پیچیدگی ہے جس کا اظہار کرتے ہوئے تم شرمندگی محسوس کر رہ تھے۔۔۔ بھائی! جس گھر میں لڑکیاں ہوں گی' وہاں تو یہ معاملے ہوں گے قطع نظر اس بات ک کہ تم میرے دوست ہو' یہ تو نہ بھولو کہ تم ایک بے حد شفیق ماں کے اکلوتے بیٹے ہو۔ ایک جوان بیٹے کی ماں نے اگر ایک بیٹی والے گھر کو اس قابل سمجھا ہے تو انہیں اپنا فرض ادا کر دو۔ وہ جانیں اور ان کا کام' ہمیں کیا؟۔۔۔ ہم تو دوست ہیں اور انشاء اللہ ہمیشہ دوست ہی رہ گے۔ پھر اگر اللہ کو یہی منظور ہے تو اس سے بڑی خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔۔۔"

زلفی نے فرط جذبات سے شایان کو گلے سے لگا لیا' آہستہ سے اٹک اٹک کر کہنے لگا۔

"شایان! شگفتہ کیا سوچے گی اور پھر لوگ کیا کہیں گے کہ ایک دوست نے دوستی کی آ میں دوست کے گھر۔۔۔"

شایان نے اسے فوراً علیحدہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ "لعنت بھیجو لوگوں پہ' لوگ پہلے کچھ نہیں کہتے۔ لوگوں کی پرواہ کرو گے تو ایک قدم چل نہیں سکو گے۔ نیت درست' ضمیر مطمئن ہے تو میری جان! سب درست ہے۔"

"مگر یار! ذرا سوچو' نگہت کا اتا پتہ نہیں۔ فرحت' رفعت کے فرائض ادا کرنے ابھی با



ب- باپ موجود نہیں۔۔۔ میری تمہاری کیا' جب چاہیں گے سر پہ سہرے باندھ لیں گے۔ لے بہنوں کے بارے میں سوچنا چاہئے۔۔۔"

"بالکل ٹھیک کہتے ہو۔۔۔ مگر اس کے ساتھ میں یہ بھی کہوں گا کہ اپنی امی کا حکم ماننا ہمارے لئے اس سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ وہ ماں ہیں۔ جو کچھ تم سوچتے ہو' وہ اس سے ہیں زیادہ آگے سوچتی اور جانتی ہیں۔ تم سب کچھ ان کی صوابدید پہ چھوڑ دو۔۔۔"

"چلو' ٹھیک ہے مگر ایک شرط بلکہ میرا پہلا اور آخری فیصلہ ہے کہ تمہاری اور میری ادی ایک ساتھ ہو گی۔"

شایان نے قہقہہ لگایا' اس کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے بولا۔ "پیارے! تم صرف اپنی ت کرو' مجھے اپنے ساتھ مت گھسیٹو۔ میں تو تمہارا شہہ بالا بنوں گا۔"

"شہزادے! ہو گا' تو ایسے ہی ہو گا ورنہ میرا فیصلہ تو تم نے سن ہی لیا ہے۔"

شایان سنجیدہ ہو کر اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ "تم میرے بارے میں سب کچھ نتے ہوئے بھی ایسی بات پہ بضد ہو جو میرے لئے ممکن نہیں' بڑے افسوس کی بات ہے۔۔۔"

"تم بھی تو ضد کر رہے ہو۔۔۔ میرے لئے تو یہ حکم کہ میں سب کچھ امی کی صوابدید پہ وڑ دوں۔ ٹھیک' میں چھوڑ دیتا ہوں اور تمہارے لئے میرا یہ حکم ہے کہ تم اپنی شادی کا عاملہ میری صوابدید پہ چھوڑ دو۔ اللہ سب بہتر کرے گا۔"

شایان سر پکڑ کر بیٹھ گیا' کافی دیر کچھ سوچتا رہا۔ پھر پوچھنے لگا۔

"یہ تمہارا حکم ہے یا۔۔۔"

"میری خوشی' خواہش' درخواست یا حکم۔۔۔ کچھ بھی سمجھ لو۔" زلفی نے جواب دیا۔

☆☆☆

جمعہ کے روز زلفی کی والدہ' دونوں بہنیں' نین تارا' قاسم اور ان کی امی شیخوپورہ پہنچ چکے ھے۔ ان کی آمد اور مقصد کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں رہی تھی۔ شایان نے پہلے ہی گھر آ کر لد' والدہ اور بڑی بہنوں کو ان کی خواہش سے آگاہ کرتے ہوئے اپنی رضامندی کا اظہار بھی کر ا تھا۔ زلفی ساتھ نہیں آیا تھا' اصولاً اسے اس موقع پہ آنا بھی نہیں چاہئے تھا۔ شایان اس کی لی بری طرح محسوس کر رہا تھا۔ اس نے ٹیلی فون کیا اور پوچھا کہ کیا بات ہے' تم نہیں آئے؟ لفی نے ٹالتے ہوئے جواب دیا کہ میں ذرا یہاں مصروف تھا اور پھر مجھے کسی نے ساتھ چلنے کے

لئے کہا ہی نہیں۔

"اچھا' بہانے چھوڑو اور فوراً یہاں پہنچو۔ میں کھانے پہ تمہارا انتظار کروں گا۔" شایان نے کہا۔

"سنو! اچھے بچے بنو اور ہر وقت ضد مت کیا کرو۔ اس موقع پہ میرا آنا مناسب نہیں۔"

"کیوں' تم کیوں نہیں آ سکتے؟--- گھر والوں اور ان کا معاملہ ان تک چھوڑو' تم میرے پاس آؤ۔ کان کھول کر سن لو کہ جب تک تم یہاں نہیں آؤ گے' نہ کوئی بات ہو گی اور نہ ہی کوئی فیصلہ ہو گا۔"

ٹیلی فون کھٹ سے بند ہو گیا۔

زلفی پہنچا تو سب حیران ہی نہیں بلکہ بہت خوش بھی ہوئے البتہ اس کی ماں نے ناک منہ چڑھایا تو شایان نے وضاحت کر دی کہ خالہ جی' زلفی میرا دوست اور بھائی ہے۔ میں نے اسے یہاں اسی حیثیت سے اصرار کر کے بلوایا ہے۔ قطع نظر کسی نئے سلسلے کے' میرا اس سے پرانا ہی تعلق ہے--- کھانے پینے سے فراغت کے بعد زلفی کی امی نے شگفتہ کو اپنی بیٹی بنانے کے سلسلے رسمی طور پہ بات چیت چھیڑی' نین کی والدہ نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔ کچھ دیر اسی موضوع پہ ہلکی پھلکی بات چیت ہوتی رہی۔ زلفی کی امی نے شایان کی والدہ کا ہاتھ پکڑ لیا' بولیں۔

"بہن جی! سچ پوچھیں تو شگفتہ بیٹی نے اپنے حسن سلوک اور محبت سے ہمیں اپنا گرویدہ بنا لیا ہوا ہے۔ اللہ اس کے نصیب اچھے کرے' اسے دنیا جہاں کی خوشیاں دے۔ جب سے یہ کہاں والی لاہور سے آئی ہے' ہم اپنے آپ کو اُدھورا اُدھورا سا محسوس کرتے ہیں۔ گھر سونا سونا سا لگتا ہے' در و دیوار بھی جیسے اس کی کمی محسوس کر رہے ہوں۔"

شایان کی والدہ نے سب کچھ سننے کے بعد کچھ سوچنے اور مشورے کی مہلت چاہی۔ پھر شام سے پہلے پہلے تمام معاملات خوش اسلوبی سے طے ہو گئے۔ انگوٹھیوں کے تبادلے اور مبارک' سلامت ہوئی۔ زلفی کی والدہ نے نہایت نرمی سے واضح کیا۔

"---چاہئے تو یہی تھا کہ پہلے بیٹیوں کے فرائض سے فارغ ہوا جاتا لیکن اس کے والد کی وفات کے بعد میری ہمت جواب دے گئی ہے' میں اپنے آپ کو بڑا کمزور سا محسوس کرنے لگی ہوں۔ شگفتہ آ جائے تو خود ہی گھر بار سنبھال لے گی' اپنی بہنوں کو بھی بیاہے گی اس لئے ایک ڈیڑھ ماہ تک پھول جھولی میں ڈال دیں تو بڑی مہربانی ہو گی---" پھر پاس بیٹھے ہوئے شایان کے سر پہ ہاتھ رکھ کر کہنے لگیں۔ "یہ دونوں آپس میں دوست بھی ہیں اور بھائی بھی' ان دونوں کا



آپس میں وعدہ ہے کہ شادیاں اکٹھی ہی کریں گے---" پھر نین کی والدہ سے مخاطب ہوئیں۔

"بہن! ہم آنے والے جمعہ کو آپ کے گھر بھی آ رہے ہیں' گھر پہنچ کر آپ تیاری کر لیں۔"

نین کی امی کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہاں اس موضوع پہ بھی بات ہو گی۔ حیران سی مسکرا کر' کوئی جواب دیئے بغیر خاموش ہو گئی۔ پھر گھر پہنچی تو خاوند سے بات کی۔ وہ بے چارا بھی حیرانگی سے بیوی کا منہ تکنے لگا۔ قاسم اور نین تارا کو بلایا' اس موضوع پہ مشورہ کرنا چاہا تو قاسم نے کہا کہ زلفی اور اس کی امی کو بلا لیا جائے تو مناسب ہو گا۔ وہ دونوں بھی آ گئے--- نین کے والد بولے۔

"بہن! آپ تو سب اچھی طرح جانتی ہیں--- بات تو آپ نے منہ سے نکال دی' یقیناً کچھ سوچ سمجھ کر ہی نکالی ہو گی مگر ہم تو بڑے مخمصے میں پڑ گئے ہیں---"

نین تارا نے وہاں سے بہانے بہانے کھسکنا چاہا مگر قاسم نے اسے بازو سے پکڑ کر بٹھا لیا--- زلفی کی امی نین تارا سے مخاطب ہوئیں۔

"بیٹی! تم پڑھی لکھی' سمجھدار اور بالغ ہو۔ یہ آپس میں مل بیٹھنے کے موقعے بار بار ہاتھ نہیں آتے اور پھر اولاد کی شادیوں کے مسئلے میں کبھی نہ کبھی بات تو کھولنا ہی پڑتی ہے۔ تم بھی اپنی رائے کا کھل کر اظہار کرو تاکہ تمہاری منشا اور رضامندی سے ہم کسی نتیجے پر پہنچ سکیں---"

نین کی امی نے بھی لقمہ دیا۔ "پتر' ٹھیک ہے کہ تم بچپن سے شایان سے منسوب ہو' تم اس کی خوبیوں اور خامیوں سے بھی اچھی طرح آگاہ ہو' ہر چیز شیشے کی طرح صاف اور واضح ہے اور یہ کہ وہ خود ہی کئی بار اپنی مجبوریوں کی وجہ سے منگنی سے دستبرداری اور شادی سے انکار کر چکا ہے لیکن یہ تمہاری زندگی کا مسئلہ ہے' تمہیں اپنے مستقبل کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے کا پورا پورا اختیار ہے۔ بلا جھجک و خوف اپنے دل کی بات بتا دو---"

والد صاحب کہنے لگے۔ "بیٹی! تمہاری ماں ٹھیک کہہ رہی ہے--- پوری ذمہ داری سے اپنے متعلق فیصلہ کرو' چاہو تو سوچنے اور مزید غور کرنے کے لئے تمہیں موقع دیا جا سکتا ہے۔"

"ابو! اس معاملے میں مجھے بولنا تو نہیں چاہئے۔ آپ بزرگوں کی اگر مرضی ہے تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ فیصلہ تو ہو چکا ہوا ہے۔ یہی فیصلہ میرا مقدر ہے اور میں اپنے مقدر پہ شاکر اور راضی ہوں۔ قرآن شریف میں کئی جگہوں پہ شاکرین اور صابرین کے لئے بڑے اجر کی نوید سنائی گئی ہے۔"

چند لمحوں کے لئے جیسے وقت ٹھہر گیا ہو۔

آنے والا جمعہ ان دونوں گھروں میں بے شمار خوشیاں لے کر آیا۔ اگلے مہینے کی پچیس تاریخ کو دونوں کی شادیاں اکٹھی طے پائیں۔ شگفتہ اور نین کی ڈولیاں' یہیں لاہور قاسم کے گھر سے روانہ کرنے کے پروگرام پہ بھی سبھی متفق اور خوش ہو گئے۔ تیاریاں شروع ہو گئیں۔

☆☆☆

شوکت اب پھر کراچی بہت دن لگا آیا تھا۔ گودی میں برتھ خالی نہ ہونے کی وجہ سے جہاز سکریپ لئے کھلے سمندر میں کھڑا تھا۔ ادھر سامان اتارنے والے مزدوروں نے بھی ہڑتال کر رکھی تھی۔ فارغ ہوتے ہی وہ تھکا ماندہ لاہور پہنچا۔ ایک پورا دن آرام کرنے کے بعد وہ دفتر آیا تھا تو کئی ٹیلی فونک پیغام اس کی توجہ کے طالب تھے' کئی ایک جان کی جانب سے تھے۔ وہ پیغامات پڑھ ہی رہا تھا کہ میڈم گڈو کے ساتھ جان کے آنے کی اطلاع ملی۔ وہ زیر لب مسکرا دیا۔۔۔ کراچی میں وہ اتنے دن یہی ایک کام کرتا رہا تھا۔ جان کے روپ میں کھرچ کھرچ کر' کرید کرید کر وہ نگہت کو نکال رہا تھا جیسے برسوں زمین میں گڑے کسی نادر مجسمے کو رگڑ رگڑ کر اس کے اصل خدوخال اجاگر کئے جاتے ہیں۔ وہ کھرچتا رہا' مزے لیتے رہا۔ بڑی کڑی محنت اور رگڑائی کے بعد' اس نے جان کے سخت جان مجسمے سے دل کے جانی نگہت کو نکال ہی لیا تھا۔

"سر' انہیں بٹھاؤں یا اندر لے آؤں۔۔۔؟" چپڑاسی پوچھ رہا تھا۔

"انہیں اندر لے آؤ اور چائے اور گرما گرم سموسے بھی۔۔۔"

ٹائی کی گرہ درست کرتے ہوئے وہ نگہت کا استقبال کرنے کے لئے پوری طرح تیار تھا۔

"گڈ مارننگ' شوکت صاحب!"

گڈو نے بہار کے تازہ جھونکے کی مانند اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔ جان پیچھے تھا' آگے بڑھ کر اس نے بھی گڈ مارننگ کہتے ہوئے ہاتھ ملایا۔

"تشریف رکھیں۔۔۔"

وہ دونوں پاس پاس کوچ پہ بیٹھ گئے۔

"کراچی بہت دن لگا دیئے آپ نے۔۔۔ بٹ صاحب بھی آئے ہیں یا وہیں کراچی میں ہیں؟" گڈو نے ایک ساتھ دو سوال داغ دیئے تھے۔

شوکت نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "سکریپ ابھی تک اتر نہیں سکا اس لئے میں بھی وہیں رکا رہا ہوں اور بٹ صاحب انتظامات میں لگے ہوئے ہیں' کچھ ضروری کام نبٹانے تھے اس لئے مجھے یہاں آنا پڑا۔۔۔ "سنایئے' جان صاحب! لاہور میں دل لگا؟" وہ جان سے مخاطب تھا۔



"او' یس۔ لاہور' لاہور ہے۔ زندہ دلوں کا شہر! بس آپ کی کمی تھی۔۔۔ میں نے کئی بار ٹیلی فون پہ پیغام لکھوائے' آپ کو مل گئے ہوں گے۔"

"جی ہاں' آپ کے آنے سے پہلے میں انہیں دیکھ رہا تھا۔۔۔"

چپڑاسی چائے وغیرہ لے کر آ گیا۔۔۔ جان پہلے کی طرح آج بھی بڑا سمارٹ اور فریش دکھائی دے رہا تھا' چہرے پہ کچھ کیل مہاسے نکل آئے تھے۔ شوکت دانستہ چشم پوشی کر رہا تھا لیکن آنکھ بچا کر اسے دیکھ بھی لیتا۔ اپنی بات چیت' برتاؤ سے وہ یہی تاثر دے رہا تھا کہ وہ اسے بالکل پہچان نہیں پایا۔۔۔ شوکت نے نظر بچا کر اس کی آنکھوں کی طرف دیکھا۔ بالکل وہی آنکھیں! عورت اپنی آنکھوں کو کیسے بدلے' آنکھوں کے اندر فطری نسوانی چمک اور پھر اگر کسی کے لئے دل میں نرم گوشہ رکھتی ہو تو اس چاہت بھری نظارگی کو کیسے روکے جو محبوب کو سامنے پا کر آنکھوں میں در آتی ہے۔۔۔ وہ دل ہی دل میں بتاشے گھول رہا تھا اور گڈو چائے سڑکتے ہوئے اخبار کی سرخیاں دیکھ رہی تھی کہ چپڑاسی اندر داخل ہوا اور ایک وزیٹنگ کارڈ میز پہ رکھ کر مودب کھڑا ہو گیا۔ کارڈ پہ نظر پڑتے ہی شوکت کو جھرجھری سی آ گئی' اچٹتی سی نظر جان پہ ڈالتے ہوئے چپڑاسی سے پوچھنے لگا۔

"کتنے لوگ ہیں۔۔۔؟"

"تین' سر۔۔۔!"

"انہیں اندر لے آؤ اور تھوڑی دیر بعد چائے بھی بھجوا دینا۔۔۔"

من ہی من وہ قہقہے لگا رہا تھا کہ دیکھئے آج کیا ہوتا ہے' دودھ ٹھہرتا ہے یا پانی بچتا ہے۔ ان کے آنے سے پہلے پہلے وہ بہن بھائیوں کا ایک لمبی مدت بعد ڈرامائی ملاقات کا منظر دیکھنے کے لئے خود کو تیار کر چکا تھا۔ زلفی' شایان اور قاسم جونہی اندر داخل ہوئے تو جان اس طرح اچھلا جیسے اسے کسی نے بجلی کے ننگے تار چھوا دیئے ہوں مگر اس کیفیت کو سوائے شوکت کے اور کوئی بھی نہ دیکھ سکا۔۔۔ شوکت نے بڑے تپاک سے انہیں خوش آمدید کہا' صوفے پہ بٹھا کر خیروعافیت پوچھنے لگا۔ چند رسمی باتوں کے بعد شوکت نے ان سے میڈم گڈو اور جان کا تعارف کرایا' ہاتھ ملاتے وقت جان کی جان پہ بنی ہوئی تھی لیکن بہت جلد اس نے خود کو سنبھال لیا۔ شایان کو تو وہ پہلے بالکل نہیں پہچان پایا۔ چال ڈھال' لباس' طور طریقے' سب کچھ بدل گیا تھا۔ وہ قریب قریب ہر لحاظ سے ایک خوبصورت نوجوان دکھائی دے رہا تھا۔ انہیں یہ سب کچھ دیکھ کر بے انتہا خوشی ہوئی۔

"آپ غالباً" کراچی گئے ہوئے تھے ---؟" زلفی نے شوکت کو مخاطب کیا۔

"جی ہاں' رات ہی لوٹا ہوں ---" وہ تینوں کو گہری نظروں سے تولتے ہوئے کہنے لگا۔

"ماشاء اللہ' آج آپ تینوں بھائی بڑے خوش اور فریش دکھائی دے رہے ہیں --- اچھا ہوا' آپ خود ہی آ گئے۔ میں آج آپ کو فون کرنے والا تھا' بہت جی چاہ رہا تھا ملنے کو --- ہاں' یاد آیا۔" وہ میز کی دراز سے سوہن حلوے کے تین ڈبے نکالتے ہوئے بولا۔ "آپ کے لئے کراچی کی سوغات ---"

زلفی حلوے کے ڈبے لیتے ہوئے کہنے لگا۔ "شکریہ! لیکن ہمارے لئے اصل سوغات تو کچھ اور تھی' وہ بھی لائے ہیں یا نہیں؟"

شوکت' زلفی کے اشارے کا مطلب سمجھتے ہوئے مسکرانے لگا اور جان بوجھ کر انجان بنتے ہوئے کہنے لگا۔ "سوغات تو آپ کے سامنے موجود ہے ---"

ذومعنی بات تھی --- جان کے چہرے پہ کئی رنگ آئے' گئے۔ میڈم گڈو نے بھی شاید اس کی بے چینی محسوس کر لی تھی۔ وہ بڑی شائستگی سے اٹھتے ہوئے اجازت چاہنے لگی۔

"اچھا' شوکت صاحب! اجازت دیں' بہت دیر ہو گئی --- بٹ صاحب آ جائیں تو پھر ملاقات ہو گی۔"

"میڈم! بیٹھیے' اتنی جلدی بھی کیا --- ابھی تو آپ کو حلوا پیش کرنا ہے۔"

قاسم اٹھ کر دعوت کے کارڈ پیش کرتے ہوئے کہنے لگا۔ "بھائی زلفی اور شایان کی شادیوں کی دعوت کے کارڈ دینے آئے تھے' آپ ضرور تشریف لائیے گا ---"

زلفی بولا۔ "شوکت بھائی! کچھ اور باتیں بھی کرنی تھیں --- خیر' پھر سہی' آپ سے کل ملاقات ہو گی۔"

شوکت' زلفی کی بات کو جان بوجھ کر نظر انداز کرتے ہوئے شادی کارڈ بلند آواز میں پڑھنے لگا۔

"عزیزی ذوالفقار علی ہمراہ عزیزی دختر نیک اختر شگفتہ جبیں --- عزیزی شایان احمد ہمراہ نین تارا ---" کارڈ سرسری طور پر پڑھنے کے بعد مسکراتے ہوئے مخاطب ہوا۔ "زلفی صاحب' شایان صاحب! آپ دونوں کو بہت بہت مبارک ہو' مجھے بہت خوشی ہوئی ہے۔ میرے لائق کوئی کام ہو تو بلا تکلف فرمایئے گا --- میں انشاء اللہ ضرور حاضر ہوں گا مگر اکیلے نہیں' یہ میرے دوست مسٹر جان اور میڈم بھی میرے ساتھ ہوں گی۔" اس نے جان اور گڈو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔



"ضرور' ہمیں بے حد خوشی ہو گی ---" زلفی مزید دو کارڈ دیتے ہوئے جان سے مخاطب ہوا۔ "اس سے پیشتر آپ سے تعارف نہیں تھا اور نہ ہی آپ اور شوکت صاحب کے دوستانہ مراسم کا علم تھا۔ یہ آپ کے دعوت نامے ہیں' ہمیں آپ کو خوش آمدید کہتے ہوئے ہمیں بے پناہ مسرت ہو گی۔"

جان نے کانپتے ہاتھوں سے تھینکس کہتے ہوئے کارڈز لے لیئے۔

"اچھا بھئی' اب اجازت ---؟" میڈم گڈو' پرس سنبھالتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میڈم' کچھ دیر رُکیں' پلیز --- بٹ صاحب کا ایک پیغام اور حلوے کے ڈبے ---"

گڈو جھنجلاتے ہوئے پھر بیٹھ گئی۔ زلفی' شایان اور قاسم اللہ حافظ کہتے ہوئے رخصت ہوئے۔ ان کے رخصت ہوتے ہی شوکت نے رومال نکال کر ماتھے کا پسینہ پونچھا اور لمبی سی ٹھنڈی سانس کھینچ کر' ریلیکس ہو کر بیٹھ گیا۔

"بھلے لوگ معلوم ہوتے ہیں --- آپ کے دوست ہیں یا رشتہ دار؟" گڈو نے سگریٹ سلگاتے ہوئے دریافت کیا۔

"دوست ہیں' اچھے مخلص لوگ ہیں ---" اس نے کن اکھیوں سے جان کو دیکھتے ہوئے مزید کہا۔ "میں کراچی کال ملائے دیتا ہوں' آپ اندر جا کر بٹ صاحب سے بات کر لیں ---"

میڈم کے اندر جاتے ہی جان نے کہا۔

"شوکت صاحب! آج تو آپ نے مان نہ مان' میں تیرا مہمان والی بات دہرا دی --- وہ لوگ آپ کو دعوت دینے آئے تھے' آپ نے زبردستی ہمیں بھی ساتھ گھسیٹ لیا۔ وہ کیا سوچیں گے؟"

شوکت نے بڑے غور سے جان کو دیکھا' دل ہی دل میں داد دینے لگا کہ کیا زبردست ایکٹنگ ہو رہی ہے۔ وہ اس کی ایکٹنگ کا مزید مزہ لینے کی خاطر بکا سا منہ بنا کر کہنے لگا۔ "جان صاحب! آپ کراچی سے نئے نئے آئے ہیں' یہاں لاہوریوں کے مہمان ہیں۔ آپ نے سنا تو ہو گا کہ لاہوریئے زندہ دل اور زبردست مہمان نواز ہوتے ہیں --- میں نے دانستہ آپ کو شامل کروایا ہے تاکہ آپ لاہوریوں کا بھی انداز دیکھیں جو آپ کو کم از کم کراچی میں نہیں ملے گا --- ویسے اگر آپ کسی بھی وجہ سے نہ جانا چاہیں تو مجبور بھی نہیں کروں گا لیکن مجھے یقین ہے' آپ ضرور جانا چاہیں گے ---"

"یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں ---؟" جان نے اسے خشمگیں نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میرا دل کہہ رہا ہے کہ آپ ان لوگوں کے خلوص کو نظرانداز نہیں کریں گے۔"
شوکت نے بھی خوب بات بنائی تھی۔

"کیا کاروبار کرتے ہیں یہ لوگ---؟"

"زلفی صاحب تو نئی پرانی گاڑیوں کا کاروبار کرتے ہیں' اپنا شوروم اور ورکشاپ بھی ہے۔ قاسم صاحب شاید بلڈنگ میٹریل ڈیل کرتے ہیں اور شایان شاید ابھی پڑھ رہے ہیں---"

شوکت اس کے چہرے پہ نظریں گاڑے' مزے لے لے کر بتا رہا تھا۔ پھر اس نے ایک سیدھا تیر چھوڑا' کمال ایکٹنگ کرتے ہوئے ایک ٹھنڈی سی سانس بھری۔ "زلفی بے چارے کے ساتھ ایک ٹریجڈی ہو گئی ہے' بے چارہ بے حد پریشان رہتا ہے---"

"اوہو--- کیسی ٹریجڈی---؟" جان کے منہ سے بیساختہ نکلا۔

"اس کی ایک جوان' پڑھی لکھی' بہت ہی اچھی بہن کافی عرصہ سے لاپتہ ہے۔ اسے تلاش کرنے کی اس نے بڑی کوششیں کیں مگر کہیں بھی اس کا سراغ نہیں ملا--- کسی نے بتایا ہے کہ وہ کہیں کراچی میں ہے لیکن آپ جانتے ہیں کہ کراچی بہت بڑا شہر ہے' کسی لڑکی کو وہاں ڈھونڈنا بڑا مشکل کام ہے تاہم کوشش جاری ہے۔ دیکھیں' کیا ہوتا ہے--- اسی وجہ سے وہ شادی بھی نہیں کر رہے تھے کہ پہلے بہن کو تلاش کر کے اس کے ہاتھ پیلے کریں گے پھر اپنے بارے میں سوچیں گے--- کچھ عرصہ پہلے ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ شاید غم زدہ ماں نے مجبور کر کے انہیں شادی کے لئے رضامند کیا ہے مگر اندر سے وہ ابھی بھی شادی کے حق میں نہیں۔"

مری ہوئی آواز میں جان نے کہا۔ "ویری سیڈ' یہ تو واقعی بہت بڑی ٹریجڈی ہے--- ان کی اور بھی تو بہن ہو گی؟"

"ہاں' دو جوان بہنیں اور بھی ہیں مگر انہیں سب سے زیادہ پیار اسی گمشدہ بہن سے ہے--- چھوڑیئے' ہم بھی کیا پرایا قصہ لے کر بیٹھ گئے ہیں۔ ان کے مسئلے' وہی جانیں--- آپ سنائیں' کاروبار کا کیا سوچا۔ میرے لائق کوئی خدمت---؟"

اس سے پہلے کہ بوکھلایا ہوا جان کوئی جواب سوچتا' گڈو باہر آ گئی اور گھڑی دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔

"بھئی' بہت دیر ہو گئی--- اُٹھو۔"

جان شاید ابھی جانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ گڈو کی بات سنی' اَن سنی کرتا ہوا کہیں اور ہی گم تھا۔ چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ میڈم نے تشویش بھری نظروں سے دونوں کو باری باری دیکھا۔



"اٹھو' جان! کہاں گم ہو---؟"

وہ جانے لگے تو شوکت نے ایک بار پھر تاکید کی کہ شادی کے فنکشن میں اکٹھے چلیں گے' ایک روز پہلے میں پھر یاد دہانی کرا دوں گا۔

★★★

انسان جیسا بھی ہو' حالات اسے کیسا ہی بُرا بنا دیں اور وہ اپنے چہرے' جسم' دل و دماغ اور خیالات پہ پراگندگی کے کتنے ہی پردے کیوں نہ ڈال دے لیکن اپنی فطرتِ سلیم کی خُو' خوشبو کو ہمیشہ اپنے اندر کہیں محسوس کرتا رہتا ہے جیسے نافہ کستوری لاکھ گندو عفونت کے ڈھیر تلے دبی پڑی رہے مگر اپنی خوشبو' افادیت اور حیثیت ضائع نہیں کرتی۔ بگڑے ہوئے انسان کا رخ سلامتی کی جانب موڑنے کے لئے نصیحت' تشدد اور نفرت سے کہیں زیادہ محبت' حکمت' صبر اور صحیح موقع موڑ پہ جذباتِ سلیم کو اُبھارنا کارآمد ہوتا ہے۔ آج یہ کڑیل وحشی اور ہتھے سے اُکھڑا ہوا سانڈ' جان یہ بھول گیا کہ وہ کیا ہے۔ کن راستوں کا راہی اور کس قماش کا بندہ ہے۔ اس کا روپ بہروپ' معاش' قماش' طرز زندگی' محرومیاں' دوستیاں' سب کچھ کسی نامعلوم سی بھینی بھینی خوشبو میں کہیں دب گئی تھیں۔ خون کی کشش نے اسے اک عجیب سی کشمکش میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس کے اندر کہیں چھپی سُوئی ہوئی بہن' اپنے بھائی کی شادی کی خوشخبری سن کر چھم چھم کرتی ہوئی باہر نکل آئی تھی۔ گھوڑی کی باگ پکڑنے' چہرے پہ سجا سہرا دیکھنے' اس کی مسہری سجانے اور بھابھی کا چاند سا مکھڑا دیکھنے کا ارمان' پورن ماشی کی رات سمندر میں جوار بھاٹے کی مانند امڈ آیا تھا--- کار ڈرائیو کرتی ہوئی گڈو اس کی خلاف معمول خاموشی کی وجہ سے بے خبر نہیں تھی' وہ خوب سمجھتی تھی کہ اس پر اس وقت کیا گزر رہی ہے لیکن وہ دانستہ خاموش تھی۔ ایک سپیڈ بریکر پر سے اسی رفتار سے وہ شوں کرتی ہوئی گزر گئی' جھٹکے سے شاید جان کی محویت بھی ٹوٹی۔

"کیا ہوا---؟" وہ ہڑبڑا کر دائیں بائیں دیکھنے لگا۔

"--- سپیڈ بریکر تھا۔" گڈو نے اسی بے نیازی سے بتایا۔

"سنبھل کر' دیکھ کر چلو۔ بڑا زبردست جھٹکا لگا ہے۔"

"سپیڈ بریکر ہوتا ہی جھٹکے کے لئے ہے خواہ وہ گاڑی کی راہ میں ہو یا زندگی کے راستے اس کا کام ہی رفتار و روش اور انداز و اعمال پہ نظر ثانی کا موقع فراہم کرنا ہوتا ہے---"

گڈو ٹھنڈی سانس کھینچتے ہوئے' بات جاری رکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"یہ نہ ہوں تو انسان اپنی ترنگ و تساہل میں کسی بڑے حادثے سے دوچار ہو سکتا ہے۔"

جان اپنے آگے ایک بہت بڑے ٹریلر کو جس پہ کوئی غیر ملکی بھاری آہنی کنٹینر لوڈ تھا' دیکھتے ہوئے بولا۔

"اس کو اوور ٹیک کرو' یار! کیا مصیبت ہے' آگے کچھ نظر ہی نہیں آ رہا۔"

"ہاں--- آنکھوں کے سامنے اگر پردہ' دیوار' پہاڑ یا کوئی بڑی سی چیز آ جائے تو آگے اس کے علاوہ اور کچھ دکھائی نہیں دیتا حالانکہ آگے سب کچھ موجود ہوتا ہے---" گڈو نے اسے جواب دیا۔

جان اسے گھورتے ہوئے کہنے لگا۔ "آج بڑے فلسفیانہ موڈ میں ہو---" کچھ ساعتیں خاموش رہنے کے بعد اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ "---ویسے بات تم نے بڑے پتے کی کہی ہے۔ سفر گاڑی کا ہو یا زندگی کا' آگے سپیڈ بریکر کا ہونا بڑا ضروری ہے۔"

"بھائی کی شادی پہ پیشگی مبارک ہو---" گڈو نے یہ کہہ کر اس کی من کامناؤں کو مہکا دیا تھا۔

"تھینکس!--- کچھ پلے نہیں پڑ رہا۔ دل' دماغ کی عجیب سی کیفیت ہے۔ دماغ کچھ کہتا ہے اور دل کچھ---"

دو سگریٹ سلگاتے ہوئے گڈو نے لمبی سی "ہوں" کی اور بولی۔ "لو' سگریٹ پیئو۔ ریلیکس فیل کرو' زیادہ مت سوچو---"

☆☆☆

گاڑی سروسز ہسپتال کے آگے سے گزر رہی تھی۔ جان کو شوکت سے پہلی ملاقات یاد آ گئی۔ دوسری' تیسری اور چوتھی بھی۔ اس کی باتیں' برتاؤ۔ اس کا رکشے والے کو پیسے دینا اور پھر واپس نہ لینا۔ اس کے ذہن کی سکرین پہ فلم سی چلنے لگی۔ مال روڈ' لارنس گارڈن' شاہ بلوط کا بڑا سا درخت۔ بچے' فٹ بال' غبارے' ریس کورس پارک' جھیل ٹیلا--- اس کا شوکت کو رجھانا اور اس کا انکار' تھپڑ۔

کھٹ سے تصور میں چلتی ہوئی فلم ٹوٹ گئی۔ دماغ کے ہال میں اندھیرا چھٹ گیا اور روشنی ہو گئی۔ اعصاب نے جیسے شور مچانا شروع کر دیا--- "لوئے اوئے' تیری ماں---' تیری بہن---' اوئے ماما!"

یہیں اسے اپنی مرنے والی ماں یاد آ گئی اور وہ کنپٹیوں پہ ہتھیلیاں جما کر پھوٹ پڑا۔ گڈو نے سائیڈ پہ گاڑی روک دی' وہ اسے بچوں کی مانند سسکیاں بھرتے دیکھ رہی تھی۔ پھر ٹشو کا ڈبا اس کی گود میں رکھتے ہوئے پوچھنے لگی۔



"کیا ہوا' رو کیوں رہے ہو---؟"

"مجھے خود بھی معلوم نہیں--- بس' کھل کر رونے کو جی چاہتا ہے۔"

"ضرور رو لو' رونے کو جی چاہے تو خوب رونا چاہئے۔ قہقہوں اور خوشیوں کے آگے سپیڈ بریکر---"

ساون کی جھڑی ذرا تھمی تو جان بولا۔

"یار! یہ شوکت بڑا اچھا اور مخلص آدمی ہے---"

"---شریف' سمجھدار اور معاملہ فہم بھی---" گڈو نے یہ کہہ کر شوکت کے متعلق یہ تعریفی جملہ مکمل کر دیا۔ "مگر اس برسات کے موسم میں اس زاہد خشک کا کیا ذکر---؟"

جان کے رونے کے حوالے سے برسات کے موسم کی اس نے بڑی خوبصورت بات کی تھی۔ جان مسکرائے بنا نہ رہ سکا۔

"گڈو! کبھی کبھی تمہارے اس منہ سے ایسے ایسے پھول جھڑتے ہیں کہ جی چاہتا ہے تم سے---"

"---شادی کر لوں--- بولو' یہ کہنا چاہتے ہو--- چلیں چرچ؟" گڈو نے اس کے منہ سے بات چھین کر اسے چھیڑا' پھر بولی۔ "ہاں' تم کچھ شوکت کے بارے میں بات کر رہے تھے---؟"

"---میں کہہ رہا تھا' وہ بڑا شریف لڑکا ہے۔"

"میں بھی جانتی ہوں-- آگے بڑھو' کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"کوئی خاص بات نہیں--- سروسز کے سامنے سے گزرے تو وہ یاد آ گیا۔ وہ پہلا شخص تھا جس کے لئے کبھی میرے دل میں نرم گوشہ پیدا ہوا تھا---"

گڈو اسے دزدیدہ نگاہوں سے تولتی ہوئی' شرارت بھرے لہجے میں پوچھنے لگی۔ "اب اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"میں اپنے بارے میں نہیں' کسی اور کے بارے میں سوچ رہی ہوں---"

"ہائیں' یہ تمہارے منہ سے کیا نکلا۔ تم نے یہ کیا کہا' سوچ رہی ہوں یا سوچ رہے ہو؟" گڈو نے حیرانی سے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

جان چونکتے ہوئے کہنے لگا۔ "اپنے آپ ہی منہ سے نکل گیا ہے' شاید صحیح ہی نکلا ہو گا۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے بھائی کی شادی کا سن کر جان کہیں روپوش ہو گیا ہو اور سوئی ہوئی نگہت اچانک جاگ پڑی ہو۔"

"ہاں، تو میں کہہ رہا تھا کہ میں اپنے بارے میں نہیں بلکہ اپنی بہن فرحت کے بارے میں سوچ رہا تھا۔۔۔" وہ گڈو کی جانب رخ پھیر کر اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے بڑے لجاجت بھرے لہجے میں کہنے لگا۔ "اچھی گڈو! یہ لڑکا فرحت کے لئے کیسا رہے گا؟"

"۔۔۔بہت اچھا خیال ہے مگر اصل چیز تو یہ ہے کہ آیا وہ اس معاملے میں دلچسپی بھی رکھتا ہے یا نہیں۔ ممکن ہے اس کی منگنی یا۔۔۔"

"مجھے یقین ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ ہرگز مجھ میں دلچسپی نہ لیتا' میرا اتنا انتظار نہ کرتا۔۔۔"

"یہ تو کوئی جواز نہ ہوا۔۔۔ اور پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ دلچسپی تم میں لے اور شادی تمہاری بہن سے رچائے۔۔۔؟"

"تمہاری بات درست ہے لیکن میرا دل کہتا ہے کہ اگر اسے میرے حالات' میری مجبوریوں اور میری اس خواہش کے متعلق سب کچھ معلوم ہو جائے تو وہ یقیناً ایسا ہی کرے گا۔"

گڈو کچھ دیر غور کرنے کے بعد پوچھنے لگی۔ "تمہیں یقین ہے کہ وہ تمہیں پہچان نہیں سکا۔۔۔؟"

"یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ بھی تو نہیں۔۔۔ اگر وہ مجھے پہچان لیتا یا اسے شک بھی ہوتا تو یقیناً کسی نہ کسی طرح اس کا اظہار بھی کرتا۔۔۔ وہ تو وہ' مجھے میرا بھائی اور شایان بھی پہچان نہیں سکے جن سے میرا خون اور خلوص کا رشتہ ہے۔۔۔"

"بہرحال' دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ میں کسی مناسب موقع پہ شوکت کو ٹٹولنے کی کوشش کروں گی۔۔۔ اور ہاں' بھائی کی شادی میں شرکت کے بارے میں تم نے کیا سوچا ہے؟"

"تمہاری کیا رائے ہے' جانا چاہئے یا نہیں۔۔۔؟"

"بھائی کی شادی ہے' ضرور شریک ہونا چاہئے۔۔۔" وہ ڈیش بورڈ پر کارڈ دیکھتے ہوئے بولی۔ "باقاعدہ دعوت بھی دی ہے' زبانی تاکید بھی کی ہے۔ شوکت اور ہم اکٹھے چلیں گے۔ اچھے سے گفٹ دیں گے' خوب ہلا گلا کریں گے۔۔۔"

☆☆☆

شادی سے دو روز قبل گڈو بڑے خوشگوار موڈ میں دفتر آئی۔ بٹ صاحب بھی کراچی واپس آ چکے تھے' بظاہر وہ ان سے ہی ملنے آئی تھی۔ وہ اندر اپنے پرائیویٹ کمرے میں اپنے منیجر اور مشیر انکم ٹیکس سے جمع تفریق کے کسی بکھیڑے میں الجھے ہوئے تھے۔ وہ شوکت



پاس ہی بیٹھ گئی۔

"بڑی لمبی عمر ہے میڈم! آپ کی' میں ابھی ابھی آپ کو ہی یاد کر رہا تھا۔۔۔ ویسے آج آپ بڑی فریش لگ رہی ہیں؟"

وہ مسکراہٹ بھری تیکھی تیکھی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھنے لگی۔ "خیریت۔۔۔ آپ مجھے یاد فرما رہے تھے؟"

"پہلے یہ فرمائیں کہ آپ آج اکیلی تشریف لائی ہیں' جان صاحب کہاں ہیں۔۔۔؟"

"وہ آج ذرا موڈ میں نہیں تھے اس لئے میرے ساتھ نہیں آ سکے۔۔۔ مجھے حیرت کے ساتھ خوشی بھی ہو رہی ہے کہ آپ نے مجھے یاد کیا۔۔۔"

وہ شرارت بھرے انداز میں اپنے بال سنوارتی ہوئی بولی۔ شوکت اس نٹ کھٹ طبیعت سے واقف تھا' اسکی خوش طبعی سے محظوظ ہوتے ہوئے بتانے لگا۔

"میڈم! آپ کو یاد ہو گا کہ پرسوں زلفی صاحب اور شایان بھائی کی شادیاں ہیں۔ میں نے آپ سے یاددہانی کے لئے بھی کہا تھا اور یہ بھی کہ ہم سب اکٹھے چلیں گے۔۔۔ آپ فرمائیں' آپ مجھے پک کریں گی یا میں آپ کو پک کروں۔ آفس تو بند ہو گا۔"

"شوکت صاحب! جب آپ نے ہمیں زبردستی کا مہمان بنا ہی دیا ہے تو پھر چلیں گے بھی آپ کے ساتھ ۔۔۔ آپ مجھے وقت اور جگہ بتا دیں' میں آپ کو پک کر لوں گی۔۔۔ بڑے مخلص اور بھلے لوگ ہیں' ان کا ذرا تفصیل سے تعارف تو کروائیں؟"

وہ کمال معصومیت سے پوچھ رہی تھی۔ شوکت بھی دل ہی دل میں اس کی ایکٹنگ کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا' گویا دونوں اک دوجے کو الو سمجھ رہے تھے۔۔۔ وہ بچوں کی طرح آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے بتانے لگا۔

"میڈم! اس روز تو مناسب نہ تھا کہ میں کچھ تفصیل سے بتاتا۔۔۔ دراصل یہ وہی لوگ ہیں جن کا ذکر میں نے آپ سے ایک گمشدہ لڑکی کے حوالے سے کیا تھا جس کے بارے میں فی الحال اتنا ہی سراغ ملا ہے کہ وہ کہیں کراچی میں ہے۔ آپ کو یاد ہو گا۔۔۔' وعدہ بھی کیا تھا کہ آپ اس سلسلے میں کچھ ان کی مدد کریں گی۔ زلفی صاحب' جن کی پرسوں شادی ہے وہ اسی لڑکی نگہت کے سوتیلے چھوٹے بھائی ہیں مگر وہ انسے سگے بھائیوں سے کہیں بڑھ کر چاہتے ہیں۔ دوسرے شایان صاحب ہیں' شیخوپورہ کے علاوہ یہاں بھی جائیداد ہے۔ اس کی دیکھ بھال کرتے ہیں اور شاید پڑھ بھی رہے ہیں۔۔۔"

"بڑا معشوق سا لڑکا ہے۔۔۔ لگتا ہے' ایک آدھ آنچ کی کسر رہ گئی ہے۔" وہ شوخ سے

لہجے میں بولی۔

"کیا مطلب--- میں سمجھا نہیں؟" وہ جان بوجھ کر انجان بنتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"مطلب یہ ہے کہ بے حد خوبصورت ہے' قدرت کی صناعی کا ایک دلآویز نمونہ---!"

شوکت بند ہونٹوں سے مسکراتے ہوئے داد دینے لگا' بولا۔ "میڈم! آپ کی حسنِ جمال کا بھی جواب نہیں اور قدرت بھی عجیب عجیب نمونے تخلیق کرتی ہے۔ جہاں سختی' کرختگی اور مردانہ وجاہت وجلال چاہئے وہاں نرمی' نزاکت اور جاذبیت وجمال کی جلوہ آرائیاں پیدا کردیتی ہے اور کہیں نسائیت نصیب کرکے مردانہ "فسطائیت" فروغ دے دیتی ہے اور کچھ لوگ یہ غیر فطرتی ردوبدل خود اپنی مرضی' مزاج اور مجبوری سے بھی کرلیتے ہیں---"

میڈم نے تو یہ بات' محض بات برائے بات ہی کہی تھی مگر شوکت نے تو بات کی گھات میں اسے چاروں شانے چت کردیا تھا۔ وہ دیدے پھاڑے اسے یوں تک رہی تھی جیسے اپنے دل میں چھپائی ہوئی ہر بات کا ایکسرے اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی ہو یا جیسے وہ شوکت کے سامنے نہیں بلکہ جذبات سے عاری سپاٹ چہرے والے کسی بڑے ڈاکٹر' عامل یا کسی ماہر تنویم کے سامنے بیٹھی ہو--- کافی دیر وہ اس کے ذومعنی جواب پہ غور کرتی رہی۔ اس کے اس جواب میں بہت سے اشارے پنہاں تھے' عجیب تذبذب کے عالم میں پھنسی ہوئی تھی۔ اچانک بولی۔

"کیا تم اپنی بات کی کھل کر وضاحت کرسکتے ہو مسٹر شوکت---؟"

شوکت کے چہرے پہ پُراسرار سی مسکراہٹ اُبھری' انگلیاں چٹخاتے ہوئے کہنے لگا۔

"میڈم! یہ تو ایسے ہی ہے جیسے میں کہوں کہ آپ اپنے سوال کی وضاحت کریں--- بات صرف اتنی ہے کہ کارخانہ قدرت اور انسانی کار اختیار سے ایسے عجوبے اکثر معرض وجود میں آتے دکھائی دیتے ہیں۔"

وہ بے بس سی پھر کہنے لگی۔ "ایک بات پوچھوں' اس یقین کے ساتھ کہ تم اس کا جواب صاف صاف اور صحیح دوگے---؟"

"ضرور پوچھیں--- سچ اگر چھپانا چاہوں بھی تو آپ سے چھپا نہیں سکتا۔" وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتا ہوا بولا۔

گڈو کی کانپوں بھری زبان سے بمشکل نکلا۔ "جان کے متعلق تم کیا جانتے ہو---؟"

"جان تو جان ہے' ہر کوئی جاندار جانتا ہے کہ جان کیا ہے--- عجیب سا سوال ہے آپ کا---؟"

اس کے لاجواب' جواب سے زچ ہو کر اس نے پانی طلب کیا۔ پانی کے چند گھونٹ پینے



ے بعد وہ محسوس کرنے لگی جیسے وہ بھیگی بلّی میں تبدیل ہو چکی ہو لیکن اسے یقین ہو گیا تھا کہ وکت' جان کی حقیقت سے واقف ہے۔ اب وہ اس کریدِ میں تھی کہ اگر وہ واقف ہے تو اسے س حقیقت کو چھپانے میں کون سی مصلحت درپیش ہے--- اس نے قدرے سنبھالا لیتے وئے کہا۔

"تم نے ابھی ابھی کہا تھا کہ تم سچ کو چھپانا بھی چاہو تو چھپا نہیں سکتے۔ پھر تم یہ---"

شوکت نے ہلکا سا چبھتا ہوا قہقہہ اچھالا' بولا۔ "تو گویا آپ سچ سننے پہ مصر ہیں---" وہ یک دم سنجیدہ ہو گیا جیسے کچھ سوچ رہا ہو۔

"میڈم! آپ اپنی ذات میں کیا ہیں' یہ آپ کا ذاتی معاملہ ہے لیکن آپ میرے لئے بڑی ترم ہیں۔ آپ بڑی مخلص' ہمدرد اور زندگی کی توانائیوں سے بھرپور خاتون ہیں اور سب سے م بات کہ مجھے آپ سے مل کر ہمیشہ بڑی خوشی ہوتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے علم ہے' جان ے پردے میں نگہت لپٹی ہوئی ہے۔ میں بھی پہلے دھوکا کھا گیا تھا مگر انسان چاہے کتنے ہی روپ بدلے' اپنی آنکھیں اور بات چیت کا قدرتی لہجہ بدلنے پہ شاید ابھی قادر نہیں لیکن ری سمجھ میں یہ آج تک نہیں آیا کہ نگہت کو مجھ سے چھپنے کی کیا ضرورت ہے؟--- میں ں کا دوست ہوں' خیر خواہ ہوں۔ ماضی میں بھی میری یہ حتی الامکان کوشش رہی کہ اس کے ی کام آسکوں' اب بھی میں اس کی بہتری اور خوشی کے لئے اپنی حقیر سی جان قربان کرسکتا ں۔ آپ شاید نہیں جانتیں کہ میں نے اسے کتنا تلاش کیا۔ پولیس کیس' اخباروں میں اس ی تصویریں' خبریں دیکھ کر میں کتنا پریشان ہوا۔ رویا' بیمار رہا۔ وہ شاید انہی وجوہ کی بنا پر میرے امنے نہیں آنا چاہتی۔ میڈم! مزے کی بات یہ ہے کہ وہ میرے سامنے آنا بھی چاہتی ہے۔ اگر بانہ چاہتی تو وہ کراچی مجھے ہسپتال نہ لے جاتی' ہوٹل میں ٹیلی فون پہ مجھ سے رابطہ نہ رکھتی' ال نہ آتی۔ یہ سب کیا ہے؟--- اگر وہ زلفی صاحب' شایان بھائی یا دیگر رشتہ داروں سے ا کرے تو چلو' کسی نہ کسی طرح اس کا ایسے کرنا بنتا ہے لیکن میں تو اس کا دوست تھا جیسے آپ ں۔ بتائیے' آپ سے اس کا کیا پردہ ہے؟--- میں بھی اس کو ایک حد تک جانتا ہوں۔ آپ بھی اس نے بتایا ہو گا کہ میرا اس سے کیسے ملنا جلنا رہا---"

وہ کرسٹل پیپرویٹ کو گھماتے ہوئے کہنے لگا۔

"اس بات کا مجھے افسوس ہے کہ وہ میرے سامنے کھل کر کیوں نہیں آنا چاہتی۔ اس کی چ غلط ہے' اس نے مجھے انڈر اسٹیمیٹ کیا ہے--- میڈم! وہ بُری نہیں' وہ ایک اچھے دان کی اچھی لڑکی ہے۔ حالات' اپنوں کی کوتاہیوں' محرومیوں اور فکرِ معاش نے اسے غلط

راستوں پہ ڈال دیا۔ اب جبکہ بہت کچھ ہو چکا' حالات اور وقت کروٹ بدل چکے۔ باپ مرگیا' بہنیں گھر واپس آگئیں۔ بھائی کی پرسوں شادی ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ اب اسے بھی اپنے اصل پہ لوٹ آنا چاہئے۔۔۔ معاف کیجئے گا' جو راہ وہ اختیار کئے ہوئے ہے اس کے آگے مزید بربادی اور گمراہی تو ہو سکتی ہے مگر منزل مُراد نہیں مل سکتی۔۔۔" شوکت رو تو نہیں رہا تھا' آنکھوں کے کونے ضرور بھیگے ہوئے تھے۔ لجاجت بھرے لہجے میں اس کی جانب دیکھ کر کہنے لگا۔ "میڈم! آپ کو یسوع مسیح کا واسطہ' نگہت کو بچالیں۔۔۔"

بے اختیار آنکھیں چھلکتے ہی وہ معذرت کر کے باتھ روم میں چلا گیا۔ کچھ دیر بعد وہ واپس آیا تو گڈو موجود نہیں تھی۔ ٹیلی فون کے پاس' پیپر ویٹ کے نیچے کاغذ کا ٹکڑا دبا پڑا تھا جس پر لکھا تھا کل ملاقات ہو گی۔

★★★

شایان اور اس کے گھر والے تو پچھلے ہفتے ہی سے یہاں آگئے ہوئے تھے۔ دونوں گھروں میں شادی کی تیاریاں اپنے عروج پہ تھیں۔ ٹوبے سے نگہت کے ماموں' دونوں ماموں زاد اور چیدہ چیدہ قریبی رشتہ دار بھی آچکے تھے۔ دونوں لڑکیاں نین تارا اور شگفتہ مایوں بیٹھی ہوئی تھیں۔ اگلے روز دونوں کی تیل مہندی تھی۔ عزیز رشتہ دار' منشی کرم الٰہی اور دیگر ملازمین انتظامات میں جتے ہوئے تھے۔ دونوں گھر ساتھ ساتھ تھے۔ اِدھر سے نکلے' اُدھر جا پہنچے۔ سبھی انتظامات ایک ہی جگہ تھے۔ عورتیں اندرون خانہ اور مرد بیرون خانہ خوشی خوشی' بڑی مستعدی سے اپنی اپنی ذمہ داریوں کی دیکھ بھال میں مصروف تھے۔ ان سب میں صرف دو فرد ہی ایسے تھے جنہیں اس خوشی کے موقع پہ بھی کسی کمی اور غمی کا احساس ہو رہا تھا اور لاکھ خود کو بہلانے اور مصروف رکھنے کے باوجود وہ اپنی اندرونی خلش اور ذہنی خلفشار کو دور نہیں کر سکے تھے' دونوں ایک دوسرے سے کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن گھریلو ہنگاموں اور ادھر ادھر کے کاموں سے ہی فرصت نصیب نہیں ہوتی تھی۔

اس روز وہ دونوں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر مغرب کی نماز کے لئے مسجد چلے گئے۔ وضو سے فارغ ہوتے ہوئے جماعت کھڑی ہو چکی تھی' ثناء ختم ہونے سے پہلے پہلے وہ دوسری قطار میں گنجائش دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔ آج نماز میں کچھ مزہ ہی عجیب تھا۔ ہر نمازی کو نماز میں حضوری نصیب نہیں ہوتی' اگر کسی خوش نصیب یہ حضوری کی ساعت نصیب ہو جائے تو نمازی کی کیفیت ہی کچھ اور ہو جاتی ہے۔ ایک عجیب سی خوشبو محسوس ہونے لگتی ہے اور شایان کے ساتھ بھی شاید کچھ ایسی ہی واردات ہو گئی تھی۔ ایسا خشوع اسے کبھی پہلے نصیب نہیں ہوا تھا۔



شبنم کے مُوتیوں سے تر آنکھیں' سر جھکا ہوا' لرزتا ہوا سراپا' قیام و رکوع و سجود میں کسی چیز کا ہوش نہیں۔ آخری سجدے میں اس کا سر آگے والے نمازی کے پاؤں سے الجھا تو اس کی ٹوپی وہیں نمازی کے پاؤں میں پڑی رہ گئی۔ سلام کے بعد آگے والے نمازی نے بیٹھے بیٹھے پلٹ کر ٹوپی اٹھائی' چومی اور اس کے سر پہ رکھ دی۔ نظر پڑتے ہی شایان غش کھا کر پھر سجدے والی جگہ پہ جھک گیا۔ امام دُعا پڑھ چکے تھے' نمازی سنتوں کے لئے کھڑے ہو رہے تھے۔ زلفی نے اسے اٹھا کر باہر صحن میں لا بٹھایا۔ قاسم' اس کے والد اور شایان کے ابو کرم الٰہی' سب ان کے گرد اکٹھے ہو گئے۔ چہرے پہ پانی کے چھینٹے مارے' تلوے اور سر سہلایا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں اور اردگرد ایک ایک چہرے کو دیکھنے لگا۔ آنکھوں میں دہشت کی پرچھائیاں تھیں' یوں لگتا تھا جیسے اس کا دماغ الٹ گیا ہے۔

"باباجی کہاں ہیں۔۔۔؟" وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

زلفی نے حیران ہو کر کہا۔ "باباجی یہاں کہاں۔۔۔ کیا کہہ رہے ہو۔۔۔؟"

"میں نے انہیں خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ ان کے قدموں میں میرا سر تھا' انہوں نے ٹوپی چوم کر میرے سر پہ رکھی۔۔۔"

وہ لوگوں کو پرے ہٹاتے ہوئے باباجی کو اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ زلفی بھی اٹھا اور اندر' باہر ہر جگہ دیکھ آیا مگر باباجی یہاں ہوتے تو نظر آتے۔

"بھائی' تمہیں مغالطہ ہوا ہے۔۔۔ باباجی یہاں نہیں ہیں۔"

ان کے گھر پہنچنے سے پہلے ہی اس کے بے ہوش ہونے کی خبر وہاں پہنچ چکی تھی۔ گھر پہنچے عورتیں' مرد سب ہی پریشان تھے۔ چارپائی پہ لٹایا' ہاتھ پاؤں سہلائے۔ ہر بندہ اندر آکر اپنی رائے دے رہا تھا۔ بڑی مشکل سے سب کو باہر کیا' اندر سے دروازہ بند کر دیا۔ زلفی کے لئے نہ ماننے کی کوئی وجہ نہ تھی' اسے یقین تھا کہ اس نے باباجی کو ضرور دیکھا ہے۔ نماز میں وہ اس کے ساتھ کھڑا تھا۔ نماز کے دوران اس نے شایان کی عجیب و غریب سی کیفیت کو محسوس بھی کیا تھا' اس کے سوا باقی سب نے اس کی بات کو واہمہ قرار دیا۔۔۔ قدرے سکون لینے کے بعد وہ نارمل ہو چکا تھا' گھر والے بھی اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے۔

"زلفی! تمہیں میری اس بات پہ یقین نہیں ہے۔۔۔؟"

"سو فیصد یقین ہے' نہ یقین کرنے والی کون سی بات ہے۔۔۔؟"

"میں نے خود اپنی آنکھوں سے باباجی کا مسکراتا ہوا چہرہ دیکھا ہے۔ ان کا ٹوپی کو چومنا' پھر میرے سر پہ رکھنا' یہ سب کچھ میری کھلی آنکھوں کے سامنے میرے پورے ہوش و حواس میں

ہوا ہے وہ بتا رہا تھا۔

نماز میں کھڑے ہوتے ہی میری حالت عجیب سی ہو گئی تھی۔ یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے تاحدِّ نظر کھلا میدان ہے۔ میرے آگے ایک شخص کھڑا ہے' میں اس کی اقتداء میں نماز ادا کر رہا ہوں۔ نماز کے بعد وہ بزرگ شخص میری جانب پلٹا' مسکراتے ہوئے ٹوپی چوم کر میرے سر پہ رکھ دی۔ وہ باباجی تھے--- سونگھو' میرے سر اور چہرے کو اچھی طرح سونگھو۔ کیسی سوندھی سوندھی خوشبو آ رہی ہے۔ اس خوشبو کو میں پہچانتا ہوں' یہ باباجی کی مخصوص خوشبو ہے---" وہ زلفی کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولا۔ "پلیز' اٹھو۔ باباجی کو تلاش کرتے ہیں--- پرسوں ہماری شادیاں ہیں۔ ان سے ملیں' شادی پہ آنے اور آئندہ بہتری کے لئے دعا کی درخواست کریں---"

پان والی دکان پہ آئے تو معلوم ہوا کہ باباجی کا کچھ معلوم نہیں' کب آئیں۔ پچھلی جمعرات آئے تھے' شاید آج بھی آئیں۔ پھر پان والا وہ ذرا دور ایک گاڑی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بتانے لگا کہ وہ گاڑی والے بھی ان کا انتظار کر رہے ہیں۔ گاڑی کی جانب دیکھا' پارکنگ لائیٹ آن تھی۔ دو ڈبے جوس لے کر وہ ٹہلتے ٹہلتے گاڑی کی جانب آ گئے۔ ہنڈا سپورٹس' میرون میٹیلک کلر گاڑی کھڑی تھی۔

"یار! یوں لگتا ہے' اس گاڑی کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے---" زلفی ذہن پہ زور ڈالتے ہوئے سوچنے لگا' پھر جیسے ایک جھماکا سا ہوا۔ "یہ تو میڈم گڈو کی گاڑی ہے---"

دراصل یہ گاڑی فائیو سٹار ہوٹل والے ہیڈ بار میڈ پیٹر پال کی تھی' اسے گڈو بھی کبھی کبھی استعمال کر لیا کرتی تھی اکثر اسی گاڑی میں شوکت کے آفس بھی آتی جاتی رہتی تھی--- ذرا اور قریب پہنچے تو اوپن ونڈو سے میڈم گڈو اور جان' سیٹ بیک سے سر ٹکائے دھیمی آواز میں میوزک سے لطف اندوز ہوتے نظر آئے۔ اس سے پیشتر کہ یہ انہیں اپنی جانب متوجہ کراتے' میڈم گڈو انہیں دیکھ چکی تھی۔ وہ دونوں باہر نکلے' بڑی گرم جوشی سے ملے۔ بات کرنے میں میڈم گڈو نے پہل کی۔

"آپ پان کھانے ادھر آئے ہیں یا جان بنانے---؟"

وہ اس کی رمز کو سمجھ نہ پائے لیکن جان نے گڈو کی جانب گھور کر ضرور دیکھا۔ زلفی نے یونہی جواب لڑھکا دیا۔

"میڈم! جان صاحب تو ماشاء اللہ آپ کے ساتھ ہیں' ہم لوگ کیا جان بنائیں گے---؟"



جان کے سوا سبھی کھلکھلا کر ہنس دیئے۔

"بھئی' میرا مطلب جان بنانے سے کچھ کھانا پینا تھا---"

جان کی تو واقعی جان پہ بنی ہوئی تھی۔ یہ لوگ ہنسی ٹھٹھول میں مشغول تھے۔

"آپ ادھر کدھر---؟" میڈم گڈو نے پوچھا۔

"---دراصل' اس پان والی شاپ پہ ایک بزرگ کبھی کبھی بیٹھتے ہیں' ان کی زیارت کے لئے آئے تھے۔" زلفی نے جواب دیا۔

"عجیب اتفاق ہے' ہم بھی ان ہی کے انتظار میں یہاں کھڑے ہیں۔"

"آپ انہیں جانتی ہیں---؟" زلفی نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں--- ان کے بارے میں سنا ہے کہ بڑے اچھے بزرگ ہیں لیکن ان سے میرا کبھی ملنا نہیں ہوا۔ آج بھی یوں لگتا ہے کہ ملاقات نہیں ہو گی' ہم کافی دیر سے کھڑے ہیں۔"

"ہوں--- یہ تو ذاتی سا سوال' اگر مناسب سمجھیں تو بتا دیں کہ آپ ان سے کس سلسلے میں ملنا چاہتی تھیں؟"

"بھئی' جان صاحب کے لئے دعا کرانا چاہتی تھی--- کسی نے بتایا ہے کہ ان کی دعائیں قبول ہو جاتی ہیں۔" گڈو اور جان گاڑی سے اتر کر ان کے پاس آ گئے۔

زلفی نے جان کی طرف دیکھا جو پان والی دکان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"دعا ان کے کاروبار کے لئے کرانا چاہتی ہیں یا شادی---" زلفی چھیڑ چھاڑ کے موڈ میں تھا۔

وہ جان کی جانب دیکھ کر مسکرانے لگی' بولی۔ "پہلے آپ بتائیں' آپ دونوں کس سلسلے میں ان سے دعا کرانا چاہتے ہیں؟--- شادیاں تو آپ کی قریب قریب ہو چکیں' صرف ڈیڑھ دن کی آنچ کی کسر ہے۔ کاروبار بھی ماشاء اللہ آپ کے سیٹ ہیں--- رہی بچوں کے لئے دعا کی بات' تو دوستو! پہلے دلہنیں تو آ لینے دو' بچے بھی چھم چھم برسنے لگیں گے۔"

زلفی نے قدرے سنجیدہ ہوتے ہوئے وضاحت کی۔ "میڈم! اک عرصہ سے ہماری بہن گم ہے--- شادیاں تو ہو رہی ہیں لیکن ہمیں ذرہ بھری خوشی نہیں' صرف والدین کی خواہش کے آگے سر جھکا دیا ہے۔ یقین کریں ہمارا دل اندر سے رو رہا ہے۔ مزہ تو تب تھا کہ ہماری بڑی بہن خود اپنے ہاتھوں سے ہمارے سروں پہ سہرے سجاتی' ہمیں دولہا بناتی---"

شایان سے بھی رہا نہ گیا وہ روہانسو سا ہو کر بتانے لگا۔ "وہ بہن مجھے کہا کرتی تھی کہ تم میرے گڈے ہو' میں اپنی گڑیا کی تم سے شادی کروں گی--- کیا خبر اسے اپنی یہ بات یاد بھی

ہے یا نہیں۔۔۔؟"

اسی لمحے جان چیخ مارتے ہوئے اس سے لپٹ گیا' بولا۔ "یاد ہے' میرے گڈے! یاد ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔۔۔"

جان کی یہ حرکت' کم از کم ان دونوں کی سمجھ میں نہ آئی۔ شایان کو اس نے اپنے کسرتی بازوؤں میں جکڑا ہوا تھا۔ زلفی حیرانی اور میڈم گڈو' آنسو بہاتے ہوئے اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔۔۔ ہچکیاں تھمیں' ذرا دل کا غبار نکلا تو جان' زلفی سے لپٹ گیا۔ منہ ماتھا چومنا شروع کر دیا۔

"میرے بھائی! مجھے معاف کر دو' میری خطائیں بخش دو۔ میں نے آپ کو بڑے دکھ دیئے ہیں۔۔۔"

کسی کو کسی کا ہوش نہیں تھا۔ یہ سب کچھ اتنا اچانک اور ڈرامائی انداز میں ہوا کہ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ گڈو نے گاڑی سے ٹشو کا ڈبا نکالا' جان کا آنسوؤں سے تر چہرہ صاف کرتے ہوئے اپنے ساتھ لپٹا لیا' بولی۔

"باباجی کسی مخصوص چہرے' جسم یا شخصیت کا نام نہیں۔۔۔ اور نہ ہی مسجد' گرجا' اینٹوں' دیواروں' محرابوں' گنبدوں یا مینار و کلس کا نام ہے اور نہ یہ شیطان' کسی نوکیلے سینگوں' انگار آنکھوں اور تیر کی انّی والی لمبی سی دُم کا نام ہے۔

یہ سب کچھ یقین' اعتقاد' نیت اور سوچ و خیال کے نام ہیں۔۔۔ آپ لوگ اور ہم باباجی کی تلاش میں نکلے۔ ہمیں یقین تھا کہ اللہ ان کے وسیلے سے ہماری پریشانیاں دُور کر دے گا۔ ہم اپنی اپنی مرادیں لے کر آئے اور باباجی نے بن ملے ہی ہمیں وہ کچھ دے دیا جس کے لئے ہم دُعا کرانے نکلے تھے۔۔۔ میرے سویٹ بھائیو! یہ تم دونوں کی بہن نگہت ہے۔"

سڑک کنارے' رات بارہ بجے عجیب عجیب ڈرامہ ہو رہا تھا۔ وہ تو خیر ہوئی کہ مارکیٹ کی دکانیں بند تھیں' ٹریفک جاری تھی۔۔۔ راہ گیر نہیں تھے ورنہ ایسا تماشا دیکھنے کو ملتا کہ صبح اخباروں میں شائع ہو جاتا۔ آہیں' سسکیاں' رونا' برا حال۔۔۔ شایان اور زلفی بار بار جان کی طرف دیکھتے تھے۔ کچھ دیر بعد طوفان تھما تو نگہت لجائی شرمائی' خجل سی ایک طرف مجرموں کی طرح کھڑی تھی۔ ناگہاں شایان کی نظر پڑی' باباجی اسی طرف آ رہے تھے۔ ہاتھ میں جوس کے ڈبے اور ایک بڑا سا پیکٹ تھا۔ ان سب کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ قریب آ کر انہوں نے سلام کیا۔ سب کی خیریت پوچھی' سروں پہ دستِ شفقت پھیرا۔

"بچو! لو' یہ ٹھنڈا مشروب پیئو اور اللہ کا شکر ادا کرو۔۔۔ ابھی ابھی جمعرات شروع ہوئی۔



رات کا رنگ کالا کرماں والا' دو جوڑے کالے کپڑے۔ جنہوں نے روپ بدلے' ہم نے ان کے چولے بدلے۔ پہلی زندگی' پہلے سارے کپڑے' لپیٹ کر فجر کی نماز سے پہلے مادھو لعل حسین کے قدموں میں پہنچ جائیں۔۔۔"

یہ کہہ کر باباجی نے وہ پیکٹ انہیں تھمایا اور دکان پہ چلے گئے۔ گم صم کھڑے وہ سب انہیں جاتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ ان کی گنجلک باتیں کیا پلے پڑتیں' دیر تک ہکابکا کھڑے اپنی اپنی عقل سے مطلب اخذ کرتے رہے۔ بعد از کوشش بسیار یہ بات سمجھ میں آئی کہ باباجی نے شایان اور نگہت کو پہلی طرز زندگی بدل کر نئی زندگی شروع کرنے کا اشارہ دیا ہے۔ پہلی گزری زندگی کے سارے دکھ اور پہلے سارے کپڑے باندھ کر لانے کا حکم دیا ہے اور پیکٹ میں موجود کالے کپڑے پہن کر آنے کو کہا ہے۔۔۔

شادی والے گھروں میں کون سوتا ہے پھر جبکہ شادی میں صرف ایک دن باقی ہو۔ گھر پہنچے تو گھر' گلی روشنیوں سے جگ مگ کر رہے تھے۔ ڈھولک پہ تھاپ پڑ رہی تھی۔ عزیز رشتہ دار تنبوں قناتیں' کرسیاں میز اور ادھر ادھر کے انتظامات میں مگن تھے۔ زلفی اور شایان کو گھر تک پہنچا کر گڈو اور نگہت' صبح تین بجے پہنچنے کا کہہ کر چلی گئیں۔ زلفی اور شایان کی زندگی میں تو جیسے اک دم بہار آ گئی تھی' خوشی کے مارے زمین پہ پاؤں نہیں پڑتے تھے۔ انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ جب تک باباجی حکم نہ دیں' گھر والوں کو ابھی کچھ نہ بتایا جائے۔ شایان نے اپنے تمام زنانہ مردانہ کپڑے ایک چادر میں جمع کر کے باندھ لئے۔

تین بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے۔ جب شایان غسل سے فارغ ہو کر باباجی کا دیا ہوا کالا جوڑا پہنے تیار تھا۔ ٹھیک سوا تین بجے میڈم گڈو بھی آ گئی۔ نگہت نے کالا کھلا سا جھولا' سر پہ کالی چادر اور گلے میں عقیق یمنی کی مالا پہنی ہوئی تھی۔ عورت لگے نہ مرد' بس اک ملنگنی سی تھی جو سر جھکائے بیٹھی شاید رو بھی رہی تھی۔ مدھم سی روشنی میں اسے دیکھ کر دونوں ششدر رہ گئے۔ زلفی اور شایان نے سر پہ ہاتھ رکھ کر پیار کیا۔

"تمہیں اپنے گھر اور نئی زندگی میں آنا مبارک ہو۔۔۔" زلفی پھر میڈم گڈو سے مخاطب ہوا۔ "میڈم! آپ نے ہماری بہن ملا کر جو ہم پہ احسان عظیم کیا ہے اس کا اجر آپ کو اللہ تعالیٰ ہی دے سکتے ہیں' ہم تو اپنے اس منہ سے آپ کا شکریہ بھی ادا نہیں کر سکتے۔۔۔"

وہ گھڑی دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔ "فضول باتوں میں وقت ضائع مت کریں۔ گاڑی میں بیٹھیں' مجھے ٹھیک چار بجے وہاں پہنچنا ہے۔۔۔"

وہاں پہنچتے پہنچتے صبح صادق کے آثار نمودار ہو چکے تھے۔ طائرانِ صبح گاہی اپنے ربّ کی

حمد و ثناء میں مصروف تھے اور اشرف المخلوقات' مزار شریف کے ارد گرد قبروں کے درمیان سوئے ہوئے تھے' کچھ مرد و زن پڑھنے پڑھانے میں مصروف تھے۔ گاڑی پارک کر کے' چاروں سرکار شاہ حسینؒ کے روضہ مبارک کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ باباجی اندر سے باہر آئے' تبسم فرماتے ہوئے سلام میں پہل کی۔ "صدقے کے دونوں کالوں" کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ الاؤ کی چار دیواری کے پاس آ کر انہوں نے دونوں کو کہا۔

"اپنی اپنی پہلی کرنیاں اور کرتے' کرتوت اس میں پھینک دو--- سرخاب' سرخ لائیٹر' سرخ شعلے---" شایان نے سرخ لائیٹر سے آگ دکھادی۔ "سرخاب ختم' کالا تیتر' حق ہُو۔ ہُو حق--- کالا پہن' سرخ شعلہ اوپر نہیں جاتا۔ جل کر کالا دھواں بن' اوپر جا--- تم دونوں کے تن کی میل جل گئی۔ سیاہ سرمہ بن کر نین میں بس جاؤ۔ اپنی خواہشوں کے چہرے پہ سیاہی پوت لو۔ تن کالا' من اجلا۔ بول کاگا' موہن کب گھر آوے۔ قبر کا اندھیرا---" وہ نگہت سے مخاطب ہوئے۔ "بچی! تو بچ گئی۔ گڈی' گڈا اور گڈو--- انت خیر۔ اب جاؤ گڈی گڈے کے ساتھ' کالے کالے گڈو' گاڑیوں والے کے ساتھ--- بہن' بھائی۔ تم سب بہن بھائی ہو۔"

شایان نے بڑی جرأت سے کل شادی میں شرکت کی التجا کی۔

"اللہ خیر---" جواب دیا۔

دونوں مزاروں پہ فاتحہ پڑھی' اندر ہی گڈو نے عرض کی۔

"باباجی! میں کچھ کہنا چاہتی ہوں---"

باباجی نے فرمایا۔ "من اجلا' تن میلا۔ بن جا اس سوہنے کی لیلیٰ--- بازار مت گھوم۔ مست بن' مستی میں جھوم---"

باباجی مستی میں جھومتے ہوئے مسجد کی جانب بڑھ گئے--- رات نہ گڈو سوئی' نہ نگہت۔ آنسو تھے کہ رکنے کا نام نہ لیتے تھے جیسے دونوں کے اندر صاف کر کے ہی دم لیں گے۔ صبح دم جب دونوں کو ہلکا سا قرار آیا تو غسل سے فارغ ہو کر دونوں نے کالے کپڑے زیب تن کئے' ایسے میں سرمدی آہنگ میں اذان بلند ہوئی۔

اللہ اکبر اللہ اکبر کے الفاظ۔

گڈو جیسے خود بخود سجدے میں جھک گئی۔

اشھد ان لا الہ الا اللہ---

وہ سر اور شہادت کی انگلی اٹھا کر آسمان کی جانب دیکھنے لگی جب۔

"محمد رسول اللہ" پہ بات آئی تو دونوں نے انگوٹھے چوم کر آنکھوں سے مس کئے۔ آذان



ختم ہوئی تو ان دونوں کی آمان شروع ہو گئی۔ صاف چادر بچھا کر' اس ستار' غفار' کریم اور رحیم کے سامنے کھڑی ہو گئیں جو صدق دل سے توبہ کرنے والوں کو نہ صرف معاف کر دیتا ہے بلکہ بہت ہی خوش ہو کر وہ کچھ نواز دیتا ہے جو انسان کے گمان میں نہیں ہوتا۔ کیا پڑھا' کیا نہ پڑھا۔ بس دونوں رو رو' گڑگڑا گڑگڑا کر اپنے گناہوں پہ نادم ہو رہی تھیں۔ کلیجے پھٹنے والے ہو گئے۔ ایک دوسرے سے بے خبر اپنی اپنی پتا میں پڑی ہوئی' وہیں بے سُدھ سی ڈھے گئیں--- رات اپنی ظلمتوں کے ساتھ ان کے اندر کی تاریکیاں بھی لے کر کہیں غائب ہو چکی تھی۔ صبح کے اُجالے نے ان کے چہروں پہ نور بکھیر دیا تھا۔ جسم و جان کی ساری کثافتیں دھل چکی تھیں جیسے نیا جنم مل گیا ہو--- جلدی سے تیار ہو کر سیدھی شوکت کے دفتر جا پہنچیں۔ شوکت ابھی دفتر نہیں پہنچا تھا' بیٹھتے ہی چپڑاسی کو بھرپور ناشتے کا آرڈر دیا--- نگہت نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"مناسب سمجھو تو مجھے اپنا پروگرام بتا دو---؟"

گڈو نے اسے پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ "پروگرام سارے باباجی نے سیٹ کر دیئے ہیں' ہم سب نے اب صرف عمل کرنا ہے۔"

"میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا ہے۔ ذرا---" نگہت کی بات درمیان میں ہی رہ گئی۔

شوکت اندر داخل ہوا' عجیب بات کہ وہ بھی سیاہ رنگ کی شلوار قمیض پہنے ہوئے تھا۔ "السلام علیکم" بھی اس کے منہ سے آدھی ہی نکلی' وہ تینوں ہی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ چند لمحوں بعد سکوت ٹوٹا۔

"آپ اس وقت--- اور یہ کالا لباس---؟" وہ خود اپنے لباس کو بھی دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"آفس ٹائم شروع ہو چکا ہے۔ آپ دفتر آ گئے ہیں' کوئی اور بھی آ سکتا ہے--- باقی رہا کالا لباس' تو آپ کا اپنے لباس کے بارے میں کیا خیال ہے---؟"

وہ لاجواب سا ہو کر اپنی سیٹ پہ بیٹھتے ہوئے پسینہ پونچھنے لگا۔ نگہت ڈھیلا ڈھالا لباس' سر پہ اجرک اور گلے میں مالا پہنے' سر جھکائے ہوئے اپنی موٹی موٹی انگلیوں کو دیکھ رہی تھی اور وہ اسے مسکراتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

"نگہت! نئی صبح کے اُجالے' نئی سوچ' نیا انداز اور نئے پرانے رشتے مبارک ہوں---"

پھر وہ میڈم سے مخاطب ہوا۔ "میڈم! آپ کو بھی نیا دن' نئی زندگی اور دائرہ اسلام میں داخل ہونا مبارک ہو---"

چپڑاسی ناشتہ لے کر اندر داخل ہوا۔

"آپ۔۔۔ آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں' آپ کو یہ سب۔۔۔؟" گڈو کی زبان ہکلا رہی تھی۔۔۔

وہی ازلی مسکراہٹ لئے وہ بولا۔ "آپ پریشان نہ ہوں' میں سب بتاتا ہوں۔ پلیز' نگہت! تم چائے بناؤ۔۔۔ شاید ہی آپ کو میری بات پہ یقین آئے جیسے کہ مجھے بھی آپ دونوں کو اس حُلیئے میں دیکھ کر یقین نہیں آرہا لیکن یقین کئے بنا چارہ بھی نہیں۔۔۔ میڈم! میں گزری رات شاید ہی کسی لمحے سویا ہوں گا۔ کل آپ نے مجھے تو کھول کر رکھ دیا مگر خود میری میز پہ ایک بند چِٹ رکھ کر چلی گئیں۔ میں سوچتا رہا کہ آپ میرے بارے میں جانے کیا کیا سوچتی رہی ہوں گی۔ مجھے وہ سب کچھ کہنا بھی چاہئے تھا یا۔۔۔ بہرحال' جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔۔۔" چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے بتانے لگا۔ "اذان سے کچھ دیر پہلے سویا تھا یا جاگ رہا تھا جب میں نے دیکھا کہ آپ سب کو آگ لگ گئی ہے' جل رہے ہیں لیکن مسکرا بھی رہے ہیں۔ آگ کے شعلوں نے آپ کے لباس کو تو جلا دیا ہے لیکن جسموں کو چھُوا تک نہیں بلکہ تپ کر اور نکھر گئے ہیں۔ پھر میں نے ایک بزرگ کو دیکھا۔ انہوں نے آپ کو سیاہ لباس پہنایا۔۔۔ عجیب سا خواب تھا' ایک ایک بات واضح دیکھی۔ پھر اٹھا' غسل کیا' نماز پڑھی اور آپ سب کے لئے دُعا مانگی۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ آج ضرور کچھ ہونے والا ہے۔۔۔ ہمارے گھر میں کالے رنگ کے کپڑے کوئی نہیں پہنتا' بڑوں نے کسی وجہ سے منع کیا ہوا ہے۔ پچھلے دنوں جب میں کراچی گیا تو وہاں ہمارے ایک جاننے والے بزرگ ہیں جو حضرت بابا ذہین شاہ تاجیؒ کے مُرید ہیں۔ ملاقات کی غرض سے ان کے دولت کدے پہ حاضر ہوا تو بڑی شفقت فرمائی۔ پھر اصرار کر کے یہ کپڑے جو میں نے پہنے ہوئے ہیں' مرحمت فرمائے۔ میں نے بصدِ ادب عرض کیا کہ ہمیں سیاہ لباس پہننے کی اجازت نہیں' تو فرمایا کہ ہم نے اجازت دے دی ہے' رکھ لو۔ اس وقت زیب تن کرنا جب تم خود پہننا چاہو۔۔۔ اکثر لوگ سمجھتے ہیں کہ سیاہ رنگ ماتمی رنگ ہے' غم اور ہجر و فراق کی کیفیت کا مظہر ہے جبکہ میرے خیال میں ایسا نہیں ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اس کے اپنے مخصوص اثرات اور اسرار ہیں۔۔۔ خیر' یہ سُوٹ کراچی سے لاہور آ گیا اور بند کا بند پیک پڑا رہا۔۔۔ آج جو دفتر کے لئے تیار ہونے لگا تو سب سے پہلے یہی خواہش پیدا ہوئی کہ آج یہ کالا سوٹ پہننا چاہئے۔ میں گھر میں شلوار قمیض ہی پہنتا ہوں لیکن دفتر کبھی اس لباس میں نہیں آیا' سو بڑے چاؤ سے پہنا اور اب آپ کے سامنے ہوں۔ آپ کو اگر اچھا نہیں لگا تو۔۔۔"

"نہیں' ایسی کوئی بات نہیں۔ ہماری طرح تمہیں بھی یہ لباس پہنایا گیا ہے اور اس لباس میں تم بڑے خوبصورت لگ رہے ہو۔" پھر گڈو اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑتے ہوئے



پوچھنے لگی۔ "جانتے ہو' ہم اس وقت کیوں آئے ہیں؟"

"میڈم' غیب کا علم تو میں نہیں جانتا۔۔۔" سر کھجاتے ہوئے بولا۔ "قیاس کیا جا سکتا ہے کہ آپ مجھے سرپرائز دینے آئی ہیں۔ مجھے میری خوشیاں دینے آئی ہیں' مجھے زندہ رہنے کی نوید دینے آئی ہیں اور۔۔۔" وہ نگہت کی جانب دیکھنے لگا۔

"۔۔۔اور میں تم سے کچھ بھیک میں مانگنے بھی آئی ہوں۔" گڈو نے بات پکڑی۔

وہ جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔ "میڈم! آپ مجھے میری اپنی نظروں سے نہ گرائیں۔ میں بڑا عاجز اور غریب سا انسان ہوں۔ میرے دائرہ اختیار میں جو کچھ ہے' میں آپ کی خوشی کے لئے کر گزرنے کو تیار ہوں۔ یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔۔۔"

نگہت نے پہلی مرتبہ زبان کھولی۔ "شوکت صاحب! میں بھی آج آپ سے کچھ مانگنا چاہتی ہوں۔۔۔ کیا میں مانگنے سے پہلے یہ یقین کر لوں کہ جو مانگوں گی' مجھے آپ کے دَر سے مل جائے گا؟"

شوکت نے بغیر سوچے سمجھے دراز کھولی۔ لوڈ کیا ہوا آٹومیٹک پسٹل' جیب سے چیک بک اور پاکٹ سائز کا قرآن پاک نگہت کے سامنے میز پہ رکھ دیا۔ پھر آنکھیں بند کرتے ہوئے بولا۔

"ہاں حاضر' جان حاضر۔۔۔ اللہ کی کتاب سامنے ہے۔"

گڈو' شوکت کا یہ دیوانہ پن دیکھ کر دہل سی گئی' بولی۔ "شوکت صاحب! یہ چیزیں واپس دراز میں رکھیں اور یہ بتائیں کہ آپ کے حلقہ احباب میں کوئی ایسے مولوی صاحب ہیں جو کسی غیر مسلم کو مسلمان کر سکیں اور نکاح پڑھا سکیں۔۔۔ دو چار گواہوں کا بندوبست بھی ہونا چاہئے۔"

وہ آنکھیں پھیلاتے ہوئے دریافت کرنے لگا۔ "یہ آپ کیا۔۔۔"

"پلیز۔۔۔ وقت بہت کم ہے' کوئی سوال و جواب نہ کرو بلکہ فوراً عمل کریں۔"

وہ عجیب سے تذبذب کے عالم میں باری باری دونوں کے چہروں کو دیکھتے ہوئے گڈو کے حکم پہ غور کر رہا تھا۔ پھر چند لمحوں بعد جیسے وہ کسی نتیجے پر پہنچ چکا تھا۔

"اجازت ہو تو میں اندر ٹیلی فون کر لوں۔۔۔؟"

اجازت پا کر وہ اپنے باس کے آفس میں چلا گیا۔ باہر دونوں سر جھکائے گم صم سوچوں کے سمندر میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

"نگہت! میں نے اپنی لائف میں شوکت جیسا گریٹ انسان نہیں دیکھا۔ تم بڑی خوش قسمت ہو کہ تمہیں ایسا چاہنے والا ملا' تمہاری جگہ اگر میں ہوں تو ساری زندگی اس کے پاؤں

دھو دھو کر پیئوں۔۔۔"

"گڈو! تم نے اچھا کیا جو مولوی صاحب کو بلانے کے لئے کہہ دیا' تم نہ کہتیں تو میں کہہ دیتی۔۔۔ آج جمعرات ہے' باباجی نے تو سب کچھ طے کر ہی دیا ہوا ہے۔ اب باضابطہ بھی ہو جائے تو جھنجھٹ ہی ختم ہو۔۔۔"

"یار! ایک بات ہے۔۔۔ اس موقع پہ تمہارے دونوں بھائی بھی موجود ہونے چاہئیں' تمہارے نکاح نامے پہ ان کے دستخط بھی ضروری ہیں۔۔۔"

نگہت سوچتے ہوئے بولی۔ "کل ان کے نکاح ہیں اور آج ادھر نکاح' جس کی ابھی تک انہیں خبر نہیں۔ ان حالات اور اس موقع پہ ان کا ردعمل کچھ خوشگوار نہیں ہوگا۔۔۔"

"یہ تو ہے' لیکن یار! اپنے سارے کام دھندے ایسے ہی ہوئے اور ہوتے ہیں۔ سچویشن کے مطابق ہی انہیں بھی چلنا پڑے گا' مجبوری ہے۔۔۔ ذرا سوچو' غور کرو کہ کل تک کیا تھا' اور آج کیا ہو گیا ہے اور کچھ دیر بعد کیا ہونے والا ہے۔ تمہیں اپنی منزل مل جائے گی اور مجھے وہ سب کچھ مل گیا ہے جس کے بارے میں کبھی میں نے سوچا تک نہ تھا۔" وہ اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے شکر گزار ہونے لگی۔ "نگہت! یہ سب کچھ تم نے مجھے دیا ہے' میں تمہاری مشکور ہوں۔۔۔"

نگہت مسکرائی' اس کا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے بولی۔ "گڈو! میں نے ابھی کچھ نہیں دیا' جب دوں گی تو تم بے ہوش ہو جاؤ گی۔ ایسا سرپرائز جو تمہیں ہمیشہ یاد رہے گا۔۔۔ ہاں' شوکت سے کہہ کر شایان اور زلفی کو بلوا لو۔ جو بھی ہو' کم از کم انہیں گلہ تو نہیں رہے گا کہ بہن کا نکاح ہوا اور بھائیوں کو خبر تک نہ ہوئی۔"

شوکت ماتھے کا پسینہ پونچھتا ہوا باہر نکلا۔ چپڑاسی کو بلایا' مٹھائی اور کچھ پھول لانے کے لئے بازار بھیج دیا۔

"۔۔۔اور کوئی حکم؟۔۔۔ میں نے اپنے بھائیوں کو ساری بات سمجھا دی ہے' بس آدھے گھنٹے میں وہ یہاں پہنچ جائیں گے۔"

"شوکت! میرا مشورہ ہے کہ زلفی اور شایان صاحب کو بلا لو۔ جو بھی ہو' ان کی موجودگی ضروری ہے۔۔۔"

شوکت مسکرایا' بولا۔ "میڈم! وہ بیچارے اپنے مسئلوں میں پھنسے ہوں گے۔ کل ان کی شادی ہے اور یہ نیا جھنجھٹ۔۔۔" وہ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو کھول کر آپس میں پوریں ملاتے ہوئے پوچھنے لگا۔ "اگر چاہیں تو بتا دیں کہ مولوی صاحب اور گواہوں کے آنے پہ آپ کا



پروگرام کیا ہے؟"

"آپ اتنے بھی بدھو نہیں ہیں کہ مولوی صاحب اور گواہوں کی آمد کا مطلب نہ سمجھتے ہوں۔۔۔ چلیں' سن لیں۔ آپ کا نگہت بی بی سے نکاح ہوگا اور میں مسلمان ہوں گی۔۔۔ ہاں' یاد آیا۔۔۔ ابھی بھی وقت ہے' خوب سوچ سمجھ لو۔ یہ سامنے بیٹھی ہے' اس حلیئے میں بھی اسے کوئی عورت ماننے کو تیار نہیں۔ پہاڑ کا پہاڑ۔۔۔ ساری عمر اس پتھر سے سر پھوڑتے رہو گے۔ تمہارے گھر والے' عزیز رشتہ دار اسے دیکھیں گے تو تمہاری عقل اور پسند پہ ماتم کریں گے' نہ یہ اولاد پیدا کر سکے گی اور نہ یہ۔۔۔"

"بس' میڈم! پلیز' آگے کچھ مت کہیئے گا۔ آپ نے میری توہین ہی نہیں کی بلکہ میری آرزوؤں اور میری چاہت کو دو کوڑی کا کر دیا ہے۔۔۔ نگہت کسی عورت' کسی بیوی کا نام نہیں۔ یہ میری محبت کا نام ہے' مجھے اس کے سوا کچھ اور نہیں چاہیئے۔"

چپڑاسی مٹھائی اور پھول لے کر داخل ہی ہوا تھا کہ پیچھے پیچھے زلفی' شایان' قاسم اور مولوی صاحب بھی آ گئے۔ گڈو اور نگہت حیران پریشان کبھی ان کو اور کبھی شوکت کو دیکھنے لگیں۔ اندر داخل ہوتے ہی زلفی اور شایان نے نگہت کے سر پہ ہاتھ رکھا' دعائیں دیں۔۔۔ شوکت معذرت چاہ کر انہیں اندر دفتر میں لے گیا' مولوی صاحب بھی ان سیاہ پوشوں کو گھورتے ہوئے اندر تشریف لے گئے۔۔۔ ادھر باہر ان دونوں کے دل دھک دھک کر رہے تھے اور چپڑاسی مسکراتے ہوئے ٹیبل پہ مٹھائی پھول وغیرہ سجا رہا تھا۔۔۔ کچھ دیر بعد وہ سب باہر آ گئے۔ مولوی صاحب نے گڈو سے چند رسمی سے سوالات پوچھے' اس کی رضا و رغبت دریافت کی۔ دین اسلام کے بارے میں موٹی موٹی باتیں بتائیں۔ چند آیات تلاوت فرمائیں اور پھر کلمے پڑھا کر داخل اسلام کر دیا۔ سب کی متفقہ رائے اور اس کی خواہش کے تحت صوفیہ نام تجویز کیا۔ مبارک سلامت کے بعد مٹھائی کھلائی گئی۔ زلفی اور شایان نے اسے اپنی منہ بولی بہن بنا لیا۔ اس کے بعد مولوی صاحب نکاح کے فارم پر کرنے بیٹھ گئے۔ گڈو اور نگہت کو شوکت نے اندر آفس میں لے جا کر بٹھا دیا' باہر نکلنے لگا تو نگہت نے اسے روک لیا۔

"شوکت! تمہیں اپنا وعدہ یاد ہے۔۔۔؟"

"ہاں' بولو۔۔۔؟"

"شوکت! میں تم سے التجا کرتی ہوں۔ تم میری بجائے' میری بہن سے شادی کر لو۔۔۔ بس جانتی ہوں کہ تم مجھے چاہتے ہو' تم نے بڑا لمبا عرصہ میرا انتظار کیا ہے' میرے لئے بڑی جان ری۔ میری وجہ سے تم نے ابھی تک شادی بھی نہیں کی مگر شوکت! میں تمہارے قابل

نہیں۔ میں نہ عورت ہوں اور نہ ہی مرد۔۔۔ تم ایک باعزت شریف خاندان کے چشم وچراغ ہو۔ تمہارے سامنے تمہارا مستقبل ہے' لمبی زندگی ہے اور میں۔۔۔ میں تو ایک بانجھ بنجر زمین کی طرح ہوں جو اپنے مالک کو پھل پھول تو کیا' گھاس کا ایک سوکھا سا تنکا بھی نہیں دے سکتی۔ میری بہن تمہیں سب کچھ دے سکتی ہے۔ خوشیاں' خدمت' اولاد۔۔۔"

وہ پاگلوں کی طرح منہ کھولے اسے دیکھ رہا تھا۔۔۔ گڈو بولی۔

"ہاں' شوکت! محبت صرف وصال ہی کا نام نہیں اور پھر تم نے تو خود ہی کہا تھا کہ نگہت کسی عورت کا نام نہیں' یہ میری محبت اور چاہت کا نام ہے۔۔۔ محبت کرنے والے اپنے آپ کو قربان کر دیتے ہیں۔ محبت تو کسی کے ویران چہرے کو شاداب کرنے کا نام ہے' محبوب کی خوشی پہ قربان ہو جانے کا نام ہے اور جو محبوب کی خواہش وخوشی پہ خود کو نچھاور نہیں کر دیتا وہ محبت کے معنوں سے نا آشنا ہے۔۔۔"

"بس کریں' آپ نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے؟۔۔۔ نگہت کی خواہش کی تکمیل کی خاطر میں نے حامی ضرور بھری تھی۔ اب یہ اپنی کسی مجبوری سے انکار بھی کر سکتی ہیں مجھے تو صرف ان کی بھلائی مقصود ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ مجھے شادی کی کوئی خواہش اور شوق نہیں۔۔۔"

وہ باہر جانے لگا مگر نگہت نے اٹھ کر روک لیا۔

"تم ایک دفعہ پہلے بھی مجھے چھوڑ کر چلے گئے تھے' میں اس وقت ہوش میں نہیں تھی اور اس وقت میں ہوش میں ہوں مگر تم ہوش میں نہیں۔۔۔ میری طرف دیکھو۔" جونہی وہ پلٹا' ایک بھرپور تھپڑ اس کے دائیں گال پہ زن سے پڑا اور وہ منہ پھیر کر سسکتے ہوئے کہنے لگی۔

"میں تم سے کہیں زیادہ تمہیں چاہتی ہوں' میں تمہیں کسی لمحے نہیں بھولی۔ تمہارے اسی تھپڑ کی وجہ سے میں آج اس حال کو پہنچی ہوں۔۔۔ تم کیسے مرد تھے جو ایک بے سہارا لڑکی کو درندوں کے حوالے کر کے چل دیئے' تم نے ایک لمحہ کے لئے بھی یہ نہ سوچا کہ اس ویرانے اور تنہائی میں میرے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ تم نے اس وقت بھی میرے سامنے اپنا پرس پھینکا تھا اور آج بھی تم نے یہی کیا' پستول میرے سامنے رکھا۔ یہ کھلونے میں نے مٹھی میں دبا کر توڑے ہیں۔ تمہیں تھپڑ سے میرے ہاتھ کی طاقت کا اندازہ ہو گیا ہو گا۔۔۔ پھر تم نے قرآن سامنے رکھا' سر جھکایا' وعدہ کیا۔ تم۔۔۔ تم مجھ سے محبت کا دعویٰ کرتے ہو۔ اتار دو یہ کالی کفنی' یہ رنگ تمہیں سوٹ نہیں کرتا۔ یہ من ماروں کا رنگ ہے۔۔۔ محبت کا دعویٰ کرنے والے بہت ہوتے ہیں' محبت پہ قربان ہونے والا کوئی کوئی ہوتا ہے۔۔۔ میں صرف محبت کی خاطر تمہاری پھولوں بھری زندگی میں کانٹے بکھیر دوں؟ نہیں' یہ محبت نہیں بلکہ خود



غرضی ہے۔ تم جا سکتے ہو اور اب ہم بھی چلے جائیں گے۔۔۔ گڈو مسلمان ہوئی' وجہ؟۔۔۔ باباجی' جنہوں نے قربانی' محبت اور انسانیت کی خدمت کا ایک اچھوتا نمونہ پیش کیا۔ جاؤ۔ ان سے ملو' تمہیں معلوم ہو کہ محبت اور قربانی کسے کہتے ہیں۔۔۔ اور ہاں' جانے سے پہلے یہ سنتے جاؤ کہ آئندہ کبھی قرآن کو درمیان میں مت لانا۔"

شوکت سسکیوں سے رونے لگا' بولا۔ "نگہت! مجھے معاف کر دو۔۔۔ اگر تم اسی میں خوش ہو تو میں بھی خوش ہوں۔۔۔ خدا کے لئے' بس تم خوش رہو۔ میری جانب سے دل صاف کر دو' مجھ سے بہت بڑی بھول ہوئی۔"

گڈو' شوکت سے لگ کر اسے تسلی دینے لگی۔ آنسو پونچھے اور بولی۔ "شوکت! رفعت بہت اچھی لڑکی ہے' نگہت کی چھوٹی بہن ہے۔۔۔"

"نہیں۔۔۔" نگہت چیخی۔ "میں جس کی بات کر رہی ہوں وہ میری چھوٹی بہن نہیں' بڑی بہن ہے جس پہ میں لاکھ رفعتیں قربان کر سکتی ہوں اور میری اس بہن کا نام رفعت نہیں گڈو تھا اور اب صوفیہ ہے۔۔۔"

گڈی۔۔۔ گڈا۔۔۔ گڈو!

OO